آیت الکرسی

آسمانی پیامِ توحید

مجموعہ دہ تقاریر

مؤلف

دانشمند معروف آقای محمد تقی فلسفی مدظلہ

ترجمہ

مولانا سید محمد تقی نقوی ملتان

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔آیۃ الکرسی: آسمانی پیامِ توحید
مؤلف۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔آقا محمد تقی فلسفی
مترجم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مولانا السید محمد تقی نقوی
اصلاح ونظر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کاظم علی گجراتی
فنی معاون۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔قلب علی سیال
کمپوزنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فضل عباس سیال (الحمد گرافکس لاہور)
سال اشاعت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ستمبر 2012ء
ناشر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور
ہدیہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ملنے کا پتہ

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

www.misbahulqurantrust.com

فہرست مضامین

عنوانات	صفحہ نمبر
عرض ناشر	4
مقدمہ	6
آیت الکرسی	8
پہلی تقریر۔کلمہ توحید یا نعرۂ آزادی	9
دوسری تقریر۔حیات وزندگی	38
تیسری تقریر۔قیوم کی وضاحت	87
چوتھی تقریر۔نیند کے اسباب	115
پانچویں تقریر۔کائنات کا مالک حقیقی	154
چھٹی تقریر۔مسئلہ شفاعت	196
ساتویں تقریر۔علم الٰہی	228
آٹھویں تقریر۔علم بشر اور مشیت الٰہی	259
نویں تقریر۔کرسی کے معانی	285
دسویں تقریر۔کائنات کا محافظ	310
اختتامیہ	332

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض ناشر

امیر المومنین حضرت امام علی علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ میں نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

ہر کلام سے برتر قرآن، قرآن میں سے برتر سورۂ بقرہ اور سورۂ بقرہ میں سے برتر آیت الکرسی ہے۔[ا]

چنانچہ ایران کے عالی قدر دانشمند اور قادر الکلام خطیب آقای محمد تقی فلسفی نے آیت الکرسی کو اپنا موضوع سخن قرار دے کر اس پر مسلسل دس تقریریں فرمائیں جو بعد میں ''ہیئت نشر معارف اسلامی'' تہران سے بنام آیت الکرسی: پیام آسمانی توحید ایک ضخیم کتاب کی صورت میں شائع ہوئیں۔ یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ اب تک اس کے کم وبیش دس ایڈیشن منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان حالات میں مصباح القرآن ٹرسٹ نے اس کتاب کو اپنے قرآنیات کے سلسلہ اشاعت میں شامل کرتے ہوئے اس کا اردو ترجمہ آیت الکرسی: آسمانی پیام توحید کے نام سے شائع کیا ہے جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

آقای فلسفی کی یہ شاندار تالیف اگرچہ تفسیر سے متعلق ہے، لیکن اس میں انہوں نے شان نزول کی روایات، صرف ونحو کی ترکیبات اور تفسیری مقولات کو ایک طرف کر کے آیت الکرسی کے جملوں کی براہ راست تشریح وتفصیل کا طریقہ اختیار فرمایا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے آیات واحادیث سے مدد لینے کے علاوہ ارضیات، فلکیات، طبیعات، حیاتیات، نفسیات، کیمیا، سائنس، فلسفہ، منطق اور دسیوں علوم کے قدیم وجدید ماہرین کے بیانات کے ساتھ اپنے مطالب کی وضاحت فرمائی ہے۔

اس سلسلے میں آقای موصوف نے آثار اہل بیت کا حوالہ دیتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ آج انسان جس علمی وفنی کمال تک پہنچا ہے، ہمارے پیشوایان دین خدا کے بخشے ہوئے علم کی بنا پر ڈیڑھ ہزار برس پیشتر اس سے آگاہ تھے۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے یہ امر بھی واضح فرمایا ہے کہ انسان علم اشیاء اور تسخیر فطرت میں جہاں تک بھی پہنچے گا علم الٰہی کے مقابل اس کا عجز برقرار رہے گا۔ کیونکہ یہ جس مقام تک رسائی حاصل کرے گا وہاں آگے کی منزلیں اس کی ہمت کو للکارتی نظر آئیں گی۔

دانشمند محترم آقای فلسفی نے آیت الکرسی کے مفاہیم کے بیان میں بڑے فاضلانہ انداز میں منکرین خدا مادیین کے مفروضات کا ابطال، بعض پرجوش موحدین کے نظریات کی تردید اور کئی ایک مفسرین کے اشکالات کو حل فرماتے ہوئے وجود خدا کا اثبات، توحید وشرک کے حدود کی تعیین اور اسلامی عقائد کی معقولیت کو واضح فرمایا ہے۔

[ا] مجمع البیان ا / ۳۶۰

آیت الکرسی کی ان تشریحات میں آقای فلسفی نے اس کو آسمانی پیام توحید کے طور پر روشناس کراتے ہوئے بتایا ہے کہ توحید درعبادت اور یکتا پرستی کے بغیر انسان اپنے شرف انسانی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ گویا حقیقی انسان وہی ہے جو یکتا پرستی کی روش پر گامزن رہ کر خالق کائنات کی بخشی ہوئی حاکمیت کو بروئے کار لائے اور اشیائے عالم سے قانون الٰہی کے مطابق استفادہ کرے۔ یعنی وہ کائنات کی غلامی سے آزاد ہو کر خالق کائنات کے سامنے جوابدہی کے احساس کے ساتھ زندگی بسر کرے اور فلاح دارین حاصل کرے۔

مندرجہ بالا خصوصیات کے لحاظ سے یہ کتاب آقای فلسفی کے علمی مراتب اور زورِ خطابت کا شاہکار ہے۔ نیز تفہیم قرآن کے ذیل میں مختلف علوم وفنون پر مشتمل مباحث کا ایک حسین مرقع ہونے کے باوصف ہر سطح کے افراد اور خاص کر نسل جواں کے لیے قرآنی حقائق سے آگاہی کا دلکش اور معلومات افزا ذریعہ ہے۔

سطور بالا میں ہم مولف علام آقای فلسفی کے علم ودانش کی وسعتوں اور فکر ونظر کی رفعتوں کے ساتھ اس کتاب کی خوبیوں اور دلکشیوں کے ذکر میں مصروف رہے ہیں۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے فاضل مترجم اور ترجمے کے متعلق مختصراً اظہار نظر کر دیا جائے۔ اس کتاب کے مترجم محترم مولانا السید محمد تقی نقوی تقریر وتحریر کی اعلیٰ صلاحیتوں سے بہرہ ور ہیں۔ موصوف نے زیر نظر کتاب کے فارسی متن کی علمی وفنی اصطلاحات، دقیق علمی مباحث، گوناگوں مضامین اور پر شکوہ عبارات کو بڑے حسن وخوبی سے اردو میں منتقل کیا ہے۔ خداوند عالم موصوف کی اس اہم قرآنی خدمت کو بحق معصومینؑ قبول فرمائے۔

ہمیں اُمید ہے کہ صاحبانِ علم وتحقیق حسبِ سابق ''مصباح القرآن ٹرسٹ'' کی اس کوشش کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے اور اس گوہرِ نایاب سے بھرپور علمی وعملی استفادہ فرمائیں گے۔ اور ادارہ کو اپنی قیمتی تجاویز وآراء سے ضرور مستفید فرمائیں گے۔

مزید برآں مصباح القرآن ٹرسٹ کی ویب سائٹ کے ذریعے آپ ہماری تمام کتب ہماری ویب سائٹ کے ذریعے گھر بیٹھے پڑھ سکتے ہیں ویب سائٹ کا ایڈریس: www.misbahulqurantrust.com------------------ والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

مقدمہ

یکتا پرستی یا توحید عبادت۔ تمام الٰہی پیغمبران اور آسمانی ادیان کے اہداف میں سے ایک عظیم ہدف رہی ہے۔ گزشتہ تمام زمانوں میں نمائندگان خدا شرک اور بت پرستی کے خلاف مسلسل برسر پیکار رہے اور اس راہ میں سخت ترین مصائب اور مشکلات کا سامنا کرتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض بزرگان کو اس جہاد مقدس میں اپنی جان کی قربانی بھی پیش کرنا پڑی ہے۔

پیامبران خدا پر امر الٰہی سے یہ قرار دیا گیا تھا کہ وہ عوام کی فطرت میں ودیعت کردہ قوت فکر وعقل کو بیدار کریں، انسانی معاشرے میں ایک فکری حرکت پیدا کریں فکر واندیشہ کے سائے میں ان کو خدائے واحد کی طرف متوجہ کریں اور خودساختہ معبودوں کی پرستش سے باز رکھیں۔

ان تمام پیغمبران کا ایک فریضہ یہ بھی تھا کہ نادان افراد نے غلامی کی جو زنجیریں اپنے ہاتھوں اپنی گردنوں میں ڈال رکھی ہیں، وہ مسلسل کوشش کرتے ہوئے ان زنجیروں کو کاٹ دیں اور انہیں موجودات ارضی وسماوی کی بندگی سے آزاد کریں، چنانچہ انبیاء کرامؑ اس راہ میں قابل ذکر حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ جس زمانے میں اسلام کے عالی قدر پیشوا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معبوث ہوئے، اس وقت دنیا جہالت ونادانی اور شرک وگمراہی کی آگ میں جل رہی تھی۔ اس پوری دنیا میں لوگ آفتاب ماہتاب، ستارگان، ارباب انواع، بت وآتش، درخت وحیوان اور اس قسم کی دیگر اشیاء کو معبود تسلیم کرتے تھے۔ بلکہ ان کی پرستش میں سرگرم اور خوش تھے اور بے اصل عقائد ایک ہلاکت بار کالی گھٹا کی طرح سارے جہان پر اپنا سایہ ڈالے ہوئے تھے۔

رسول اکرمؐ نے اپنی دینی تبلیغات اور اصلاحی منصوبے کا آغاز توحید ویکتا پرستی کی طرف دعوت کے ذریعے فرمایا اور لوگوں کو ''لا الہ الا اللہ'' ایسے کلمہ توحید کی تعلیم دی جو ایک نعرہ آزادی اور شرک کی بنیادوں کو ہلا دینے والا عظیم کلمہ بھی ہے۔ آپ نے اعلان فرمایا کہ تم لوگ اس کلمہ طیبہ کی برکات سے فلاح وسعادت پانے میں بہت جلد کامیاب ہو سکتے ہو۔

قرآن مجید میں اس کلمہ توحید کا بار بار ذکر ہوا ہے، نیز اس میں یکتا پرستی اور معبود برحق کی صفات کا بیان کرنے والی کثیر آیات بھی موجود ہیں، لیکن روایات واحادیث کے بموجب ان سب آیات میں سے اہم اور جامع ترین آیت الکرسی ہے۔

یہ کتاب جو گفتار فلسفی ''آیت الکرسی ایک آسمانی پیغام توحید'' کے عنوان سے قارئین محترم کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ یہ دور حاضر کے نامور مفکر اور مشہور خطیب حجۃ السلام والمسلمین جناب آقائی محمد تقی فلسفی مدظلہ کی دس تقاریر کا مجموعہ ہے۔

اس کتاب میں آیت الکرسی کے تمام جملات کی تفسیر واضح، رواں اور قابل فہم عبارت میں بیان کی گئی ہے۔ پھر ہر جملے کے ذیل میں اس سے مناسبت رکھنے والے علمی اور دینی مسائل میں سے کسی ایک پر مفصل گفتگو بھی کی گئی ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ کے دوران اس میں مذکور آیات و روایات میں باریک بینی سے ایک قاری کو اسلام کی بلند ترین تعلیمات سے آشنائی حاصل ہوسکتی ہے۔ مزید یہ کہ اس کے مطالعہ سے تعلیم یافتہ اور جوان طبقہ کے اذہان میں ابھرنے والے سوالات کے جوابات بھی سامنے آجاتے ہیں۔

ادارہ ''ہیئت نشر معارف اسلامی'' قبل ازیں موصوف خطیب معظم کی چند ایک تقاریر جو ''بچہ اور وراثت وتربیت'' اور ''جوان اور عقل و احساسات'' کے موضوعات سے متعلق تھیں، انہیں چار ضخیم جلدوں میں پیش کر چکا ہے۔ چنانچہ ادارۂ ہذا کا یہ عمل عوام کے مختلف طبقات میں بالعموم اور تعلیم یافتہ طبقہ میں بالخصوص مورد استقبال قرار پایا اور ان کتابوں کی بے مثال پذیرائی ہوئی ہے۔ بنابریں ''ہیئت نشر معارف اسلامی'' کو امید ہے کہ یہ کتاب بھی حسب سابق خصوصی توجہ اور عوامی استقبال کا فخر حاصل کر پائے گی۔

ہیئت نشر معارف اسلامی

دی ماہ۔۱۳۵۱ھ۔ش

''آیت الکرسی ایک آسمانی پیامِ توحید'' کا اردو ترجمہ ملت اسلامیہ پاکستانیہ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ خداوند عظیم سے دعا ہے کہ وہ تمام افراد ملت کو اس دریائے فیض سے سیراب ہونے کی توفیق بخشے نیز ہمیں مندرجہ بالا عظیم تصنیفات کا بھی اردو ترجمہ کرنے کی ہمت اور دین کی خدمت کا مزید موقع عنائیت فرمائے۔

سید محمد تقی نقوی۔ مترجم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۚ اَلۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ۬ۚ لَا تَاۡخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّ لَا نَوۡمٌ ؕ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی
الۡاَرۡضِ ؕ مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَہٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِہٖ ؕ یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَ مَا
خَلۡفَہُمۡ ۚ وَ لَا یُحِیۡطُوۡنَ بِشَیۡءٍ مِّنۡ عِلۡمِہٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ کُرۡسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ
وَ الۡاَرۡضَ ۚ وَ لَا یَـُٔوۡدُہٗ حِفۡظُہُمَا ۚ وَ ہُوَ الۡعَلِیُّ الۡعَظِیۡمُ ﴿۲۵۵﴾

(سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲۵۵)

پہلی تقریر

کلمۂ توحید یا نعرۂ آزادی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے:

اَللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ [1]

دس راتوں پر مشتمل مجالس کے اس سلسلے میں ہم انشاء اللہ آیت الکرسی کو موضوع گفتگو بنائیں گے اور قرآن کریم کی اس اہم ترین آیت کو مورد بحث قرار دیں گے۔ گفتگو کی ترتیب اس طرح ہوگی کہ ہم ہر شب اس کے ایک جملے کو اس کے مختلف جہات سمیت زیر بحث لائیں گے، تاکہ سامعین محترم کے لیے ایک عمومی استفادے کا موجب ہو۔

آیت الکرسی کی وجہ تسمیہ

اس آیت کا نام۔ آیت الکرسی۔ رکھنے کی وجہ وہ لفظ "کرسی" ہے جو اس میں مذکور ہے اور اسی کی مناسبت سے یہ نام رکھا گیا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ اسے یہ نام عوام کے رجحان اور ان کی تشخیص کی وجہ سے نہیں ملا اور نہ مسلمانوں نے از خود اس کا یہ نام منتخب کیا ہے بلکہ اس نام کا صدور خود جناب رسول خداؐ ایسے عظیم اسلامی پیشوا کی زبان مبارک سے ہوا ہے۔ چنانچہ شیعہ و اہل سنت ہر دو فریق کی روایات میں منقول ہے کہ خود جناب رسول خداؐ نے اس کو "آیت الکرسی" کہا اور اس کو یہ نام دیا ہے۔ پھر اہل اسلام نے اس میں آپ کی پیروی کی اور اسی طرح اصحاب اور تابعین کی زبانوں پر اس کا یہی نام حتی کہ اب چودہ صدیوں کے بعد بھی قرآن مجید کے تمام پیروکاروں اور پورے کرۂ ارض میں اس کا یہی نام مشہور ہے اور اس آیت کی پہچان بن گیا ہے۔

آیت الکرسی میں پروردگار عالم نے اپنے بارے میں الٰہیت کے ان صفات عالیہ کا تذکرہ فرمایا ہے جو واقعی اور حقیقی معبود کے لائق ہیں۔ چنانچہ اس بارے میں حیات۔ قومیت۔ مالکیت۔ ابدی علم اور قدرت کاملہ کا ذکر فرمایا ہے۔

ایک بے نظیر آیت

اس آیت مبارکہ میں سولہ بار خداوند تعالیٰ کا تذکرہ آیا ہے کہ کبھی تو اسم مبارک کے ساتھ اور کبھی ذات اقدس کی طرف

---

[1] سورہ بقرہ آیت ۲۵۵

ضمیر سے اشارہ ہوا ہے بنا بریں یہ کہنا ممکن ہے کہ اس اعتبار سے یہ آیت قرآن مجید میں اپنی نظیر آپ ہے اور اس کی مثل کوئی اور آیت نہیں ہے۔

اس آیت شریفہ کے گہرے مضامین اور بلند مفاہیم ہر دور میں تمام طالبان حق وسعادت کے لئے یکتا پرستی کا بہترین درس اور شرک وتوہم پرستی کی قید سے نجات دلانے والے بہترین تعلیمات پیش کرتے رہے ہیں۔

آیت الکرسی کی معنوی بلندی اور روحانی عظمت کے بارے میں رسول اکرمؐ اور ائمہ طاہرین علیہم السلام سے کثیر تعداد میں روایات نقل ہوئی ہیں۔ چنانچہ ہم آپ کے علم واطلاع کے لئے ان میں سے چند ایک کی طرف اشارہ کئے دیتے ہیں۔

عن رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم انه قال: ان اعظم آیة فی القرآن آیه الکرسی[۱]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔قرآن کریم میں عظیم ترین آیت۔آیت الکرسی ہے۔

عن علی علیه السلام انه قال، لو تعلمون فیها لما ترکتموها علی حال ان رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم قال: اعطیت آیه الکرسی من کنز تحت العرش لم یوتها نبی قبلی[۲]

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں۔ اگر تم اس آیت کریمہ کے اندر موجود آثار معنوی سے آگاہ ہوتے تو اسے کسی حالت میں ترک نہ کرتے۔ ہاں تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے آیت اکرسی عرش کے نیچے محفوظ خزانے میں سے عطا کی گئی ہے اور مجھ سے قبل کسی بھی نبی کو ایسی آیت عطا نہیں ہوئی۔

عن علی علیه السلام قال: سمعت رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم یقول یا علی سید الکلام القرآن وسید القرآن البقرة وسید البقرة آیة الکرسی یا علی ان فیها لخمسین کلمة فی کل کلمة خمسون برکة[۳]

حضرت علی علیہ السلام سے ایک حدیث میں مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے علیؑ: ہر کلام کا رئیس اور بزرگ وبرتر قرآن کی سردار سورۂ بقرہ اور سورۂ بقرہ کی سردار آیت الکرسی ہے۔ پھر فرمایا! آیت الکرسی میں پچاس کلمات ہیں اور ہر کلمہ میں پچاس برکات موجود ہیں۔

عن ابی عبد الله علیه السلام قال: ان لکل شیئ ذروة وذروة اقرآن آیة

---

[۱] تفسیر روح المعانی ج ۳ ص ۱۰

[۲] تفسیر روح المعانی ج ۳ ص ۱۰

[۳] تفسیر مجمع البیان ج ۱۔۲ ص ۳۶۰۔۳۶۱

الکرسی[1]

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: ہر چیز کی ایک چوٹی اور ایک اعلیٰ نقطہ ہوتا ہے اور قرآن میں یہ اعلیٰ و برتر مقام آیت الکرسی کو حاصل ہے۔

آیت الکرسی کی مقدار

اس میں کوئی شک نہیں کہ آیت الکرسی کا آغاز ''اللہ لا الہ الا ھو'' سے ہوتا ہے۔لیکن کیا آیت الکرسی فقط ایک ہی آیت ہے اوراس کا اختتام ''وھو العلی العظیم'' پر ہوجاتا ہے یا یہ تین آیتوں پر مشتمل ہے اوراس کا اختتام ''ھم فیہا خالدون'' پر ہوتا ہے۔؟ یہ بات قابل غور ہے اوراس میں اختلاف بھی کیا جاتا ہے۔

ہفتہ کے روز وشب میں جو نمازیں مستحب ذکر کی گئی ہیں یا سال کے بعض مقررہ ایام یا راتوں کی مناسب سے جو نمازیں مستحب قرار دی گئی ہیں ان میں سے بعض میں آیت الکرسی کی اس آیت یا ان چند آیات کی تلاوت کی قید لگائی گئی ہے۔

ان نمازوں میں سے ایک نماز شب دفن میت ہے کہ اس میں آیت الکرسی کی تلاوت کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ کتاب ''العروۃ الوثقیٰ'' اور ''تحریر الوسیلہ'' میں ملتا ہے کہ (والاحوط قرأۃ آیت الکرسی۔ الی۔ ھم فیہا خالدون' احتیاط یہی ہے کہ آیت الکرسی کی قرآت ان تین آیتوں کی مقدار میں ''ھم فیہا خالدون'' تک کی جائے۔ کتاب ''العروۃ'' میں تو یہ جملہ بھی مذکور ہے۔

ولو اتی بغیر الکیفیۃ المذکورۃ سھوا اعاد ولو کان بترك آیہ من انا انزلنا اور آیۃ من آیہ الکرسی

یعنی اگر کوئی شخص بھول کر نماز کیفیت کو بدل دے تو اسے اعدا کرنا چاہیئے۔ ہاں وہ تبدیلی خواہ انا انزلناہ کی آیت میں سے کسی آیت کو ترک کرنے یا آیت الکرسی کی آیات میں سے کسی آیت کو ترک کرنے ہی سے ہوئی ہو تو بھی اعادہ کرے۔

اب اس فتویٰ سے تو یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ صاحب کتاب کے نزدیک آیت الکرسی تین آیات پر مشتمل ہے۔

بعض روایات سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ آیت الکرسی فقط ایک آیت ہے اور علماء ومفسرین کی ایک کثیر تعداد بھی اسی ایک آیت کو آیت الکرسی کہتی ہے جو''اللہ لا الہ الا ھو'' سے شروع اور ''وھو العلی العظیم'' پر ختم ہوتی ہے۔

چونکہ اس وقت میرا موضوع اس نکتے کی تحقیق کرنا نہیں۔ لہٰذا اسی قدر کہنا کافی سمجھتا ہوں۔ البتہ یہ یاد دھانی کرائے چلتا ہوں کہ ان مجالس میں میرا موضوع بحث فقط یہی آیت کریمہ ہی رہے گی۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان ج ۱۔ ۲ ص ۳۶۰۔ ۳۶۱

آیت الکرسی کا ہدف

آیت الکرسی کا بنیادی ہدف اور اصلی مقصد یہ ہے کہ عوام الناس عبادت میں موحد بن جائیں۔ وہ ایک خدا کے علاوہ کسی اور کی پرستش نہ کریں اور کسی اور موجود کے سامنے بندگی اور عاجزی سے سر نہ جھکائیں۔ اس آیت کا مقصد یہ ہے کہ معبود واقعی یعنی ذات اقدس الٰہی جو درحقیقت قابل عبادت ہے لوگوں کو اس سے واقفیت دلائے، اس کی پہچان کرائے، ان کے قلوب میں یکتا پرستی کی روح پیدا کرے، انہیں شرک اور غلط بندگی سے آزاد کرائے اور ناروا ذلت سے نجات دلوائے۔

میں اس آیت کریمہ کے ہدف کی اہمیت کو زیادہ اجاگر کرنے، اس کی معنوی قدر و قیمت کو نمایاں کرنے اور اس سے کچھ زیادہ واقفیت کے لئے مناسب سمجھتا ہوں کہ آیت الکرسی کے جملوں کو توضیح و تشریح سے قبل دو مطالب کو بطور تمہید آپ کی خدمت میں ذکر کروں۔

آزادی بشر

(۱) اس جہان کی تمام موجودات اپنے رب دانا و خالق توانا کے سامنے بے قید و شرط مطیع و تابع ہیں۔ اس خدائے بزرگ و برتر کے سامنے یہ ساری مخلوق بے چون و چرا سر تسلیم خم کئے ہوئے ہے۔ ان میں بشر ہی ایک ایسی مخلوق ہے کہ جو اس کلئے سے مستثنیٰ ہے کہ اس خالق نے اسے کچھ آزادی اور اختیار مرحمت فرما دیا ہے۔

انسانوں کا ایک گروہ ایسا ہے جو اپنے ارادہ۔ اختیار اور پوری آزادی کے ساتھ عقل کو کام میں لاتا اور اللہ تعالیٰ کی پر حکمت آیات کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ رب العالمین پر ایمان لے آتا ہے اور انتہائی معرفت و خلوص کے ساتھ اس ذات مقدس کی پرستش و بندگی میں مگن ہو جاتا ہے۔

انسانوں کا ایک اور گروہ ایسا ہے جو اپنی عقل کو دبا کر پامال کرتے ہوئے اس آزادی و اختیار سے غلط فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہ لوگ جاہلانہ تقلید اور عقل دشمنی کی وجہ سے شرک اور گمراہی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور غیر خدا کی بندگی کرتے اور اس کے سامنے ذلت سے اپنی گردن جھکا دیتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں وہ یکتا پرستی اور توحید عبادت کی عزت اور افتخار سے محروم ہو جاتے ہیں اور خود کو رب بزرگ و برتر کے ہاں مستوجب سزا بنا لیتے ہیں۔

آیت سجدہ

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ
وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَ كَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَ كَثِیْرٌ حَقَّ عَلَیْهِ

الْعَذَابُ ۭ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاۗءُ ۝۱۸ ۩ [1]

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے یا زمین میں ہے اور اسی طرح آفتاب، ماہتاب، ستارگان، پہاڑ، درخت جانور اور بہت سے انسان کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کا سجدہ کرتے ہیں، اس کے سامنے جھکتے ہیں اور اس کی بندگی قبول کرتے ہیں۔ ہاں لوگوں میں سے ایک بڑا سا گروہ ایسا بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت و بندگی سے انکاری ہو گئے اور شرک وعصیان کی وجہ سے عذاب الٰہی کے مستحق قرار پا گئے ہیں۔ ہاں تو اللہ تعالیٰ جسے ذلیل وخوار کرتا ہے اسے کوئی بھی عزت نہیں دے سکتا اور اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔

سجدہ ایک عبادت گزار کی طرف سے اپنے معبود کے سامنے بالاترین بندگی اور تذلل ہے، آپ دیکھئے کہ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ تمام ارضی وسماوی موجودات اور تمام اجرام فلکی خدا کا سجدہ کرتے ہیں۔ لیکن جب وہ انسان کا ذکر فرماتا ہے تو اسے دو گروہوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ ایک گروہ وہ جو خداوند تعالیٰ کی بندگی قبول کرتا اور دیگر موجودات کی طرح اس کا سجدہ کرتا ہے اور دوسرا گروہ بندگی اور سجدے سے منکر ہو کر عذاب الٰہی کا مستحق قرار پاتا ہے۔

پس معلوم ہوا کہ بشر جہان تکلیف میں ایک آزاد فرد ہے۔ یہ الٰہی بھی بن سکتا ہے او مادی بھی خدا پرست بھی بن سکتا ہے اور بت پرست بھی، یہ اختیار رکھتا ہے اور درست یہ اس کی مرضی ہے۔ یعنی چاہے وہ اللہ تعالیٰ کے اوامر کی اطاعت کرے یا نافرمانی کرے۔ یہی اس کی استثنائی کیفیت ہے جس سے بشر کا معاملہ روئے زمین کے دیگر تمام موجودات سے جداگانہ ہو جاتا ہے۔

(۲) ماضی اور حال کی تمام اقوام جو یکتا پرستی اور ذات واحد کی عبادت سے عملاً منحرف ہو کر ارضی یا سماوی موجودات میں سے کسی کے سامنے بطور عبادت سر جھکاتی اور غیر خدا کے لئے ذلت و بندگی کرتی رہی ہیں انہیں بھی دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

گروہ اول:۔ اس گروہ میں وہ لوگ شمار ہوتے ہیں جو دراصل خود ساختہ معبودوں کے خدا ہونے کا عقیدہ نہ رکھتے تھے، بلکہ جان و مال یا عزت و شرف کی تلف کے خوف سے بتوں کی پرستش کرتے تھے چنانچہ بظاہر وہ ان کی الوہیت کا اعتراف کر لیتے کہ مختلف صورتوں میں انہیں یہ خوف لاحق ہونے کا امکان ہوتا ہے۔

عمومی افکار وخیالات سے خوف

ہر بت پرست اور متعصب معاشرے میں کئی ایسے عاقل اور دانا افراد ہوتے رہے ہیں جو باطنی طور پر عوام کے غیر معقول اور جاہلانہ کردار سے نفرت کرتے اور بت پرستی سے بیزار ہوتے تھے۔ لیکن عوام کے افکار وخیالات، ان کی طرف سے اذیت پانے اور اجتماعی مقاطعہ کا خوف انہیں اپنے طبعی میلانات کی خلاف ورزی پر آمادہ کر دیتا تھا چنانچہ اس ڈر سے وہ عوام کے ساتھ ہم آواز ہو جاتے اور ان جاہلوں کے ساتھ بت پرستی کے مراسم میں شرکت کرتے رہتے۔ پس اس طرح سے وہ اپنے کو ان تمام خطرات سے محفوظ

---

[1] سورہ حج آیت ۱۸

کر لیتے کہ جن کا عوام کی مخالفت کی صورت میں انہیں ڈر ہوتا تھا۔

بسا اوقات ایسا بھی ہوتا رہا ہے کہ ایک قوم میں کچھ دانا اور تجربہ کار لوگ محرومیت ومشکلات کے سخت حالات میں زندگی گزار رہے ہوتے اوران پر ایسے خودسر اور ظالم فرمان روا مسلط ہوتے کہ جو فقط حکومت کرنے تک اکتفاء نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر وہ خدائی کا دعویٰ کر دیتے اور عوام کو حکم دیتے کہ وہ ان کی پوجا کریں اور ان کے سامنے عبودیت وبندگی کا سجدہ ادا کریں۔ ان حالات میں ان دانا لوگوں کے گروہ کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہ ہوتا کہ ان حکمرانوں کی الوہیت کا اقرار کریں اور انکی اطاعت بجالائیں۔ کیونکہ حالات اس قدر سنگین ہوتھ تھے کہ ایک ادنیٰ سی مخالفت بھی سخت ترین شکنجوں اور روح فرسا سزاؤں سے دو چار کر دیتی تھی۔

انہی جبر وخودسری سے مخمور دماغ رکھنے والوں میں سے ایک بدتر مثال فرعون مصر کی ہے جو حضرت موسیٰؑ بن عمران کے زمانے میں ہوا، یہ شخص خدائی کا دعویٰ کرتا اور عوام کو اپنی پرستش وبندگی کی دعوت دیتا تھا۔ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات کے بیان میں فرعون کے دعوائے الوہیت، اس کے غرور آمیز کلمات اور ناروا افعال کا ذکر بڑی صراحت کے ساتھ آیا ہے۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۱۷﴾ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۸﴾ وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ﴿۱۹﴾ فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ﴿۲۰﴾ فَكَذَّبَ وَعَصٰى ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ﴿۲۲﴾ فَحَشَرَ فَنَادٰى ﴿۲۳﴾ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿۲۴﴾[1]

قیام موسیٰ علیہ السلام

خداوند تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ فرعون کے ہاں جاؤ کہ وہ بڑا سرکش ہو گیا ہے اسے کہو کیا تو چاہتا ہے کہ کفر سے پاک ہو جائے اور میں تجھے پروردگار کی راہ دکھاؤں تاکہ تو اس کی عظمت سے ڈرنے لگے اور اس کے سامنے تعظیم کے لئے سر جھکا دے؟ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام حکم خدا کے مطابق فرعون کے پاس پہنچے اور اسے ایک بڑا معجزہ بھی دکھایا۔ لیکن بجائے اس کے کہ فرعون اسے بیدار ہوتا اور اس مہلت سے فائدہ اٹھاتا، وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جھٹلانے لگا اور حسب سابق عصیان وطغیان پر برقرار رہا۔ پھر اس نے موسیٰ علیہ السلام سے روگردانی کر لی اور اپنی تازہ کوششوں میں مصروف ہو گیا۔ پس اس نے اپنی مملکت کے بڑے بڑے سرداروں کا اجلاس بلایا اور ان کے اجتماع میں دیوانہ وار اپنی سابقہ گفتگو کو دہرانے لگا۔ وہ بلند آواز سے بولا: میں ہی تمہارا سب سے بڑا پروردگار ہوں۔

فرعون نے یہاں تک ہی اکتفاء نہ کی کہ صرف اپنی خدائی کا تکرار کرتا اور اپنی الوہیت کا اعلان کرتا۔ بلکہ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کھلی کھلی دھمکی دی اور بولا: اگر تو نے معبود کے طور پر میرے علاوہ کسی اور کو منتخب کیا تو میں دوسروں کی طرح تجھے بھی

---

[1] سورہ نازعات آیت ۱۷ تا ۲۴

زندان میں ڈال دوں گا۔ جیسا کہ اس آیت میں ہے۔

قَالَ لَىِٕنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ﴿٢٩﴾[1]

اب اگر موسیٰ علیہ السلام ایک عام انسان ہوتے تو فرعون کی خشونت اور دھمکی سے ہراساں ہو جاتے اور مارے ڈر کے دل چھوڑ بیٹھتے۔ لیکن وہ تو اللہ تعالی کے برگزیدہ نبی تھے اور دیگر پیامبران الٰہی کیطرح حق تعالیٰ کی قدرت لایزال پر بھروسہ رکھتے تھے۔ خدا نے انہیں اسی مقصد سے مبعوث کیا تھا کہ وہ نوع انسانی کو آزادی و نجات بخشیں اور اس سلسلے میں فرعون کی سرکشی کے سامنے پوری قوت کے ساتھ سینہ سپر ہو جائیں۔ تا کہ ان بدبخت عوام کو مصر کے ان ظالم و طاغوت کی قید و بند سے رہائی دلانے میں کامیاب ہوں۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نہ صرف یہ کہ فرعون کی دھمکیوں اور سختیوں کے مقابلے میں حواس باختہ نہ ہوئے اور اپنی حیثیت کو بھلا نہ بیٹھے بلکہ اس کے برعکس آپ نے انتہائی اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ اس سے گفتگو فرمائی اور اس پر واضح کیا کہ تیرا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ تو نے عوام کو اپنا غلام قرار دے رکھا ہے۔۔ چنانچہ فرمایا:۔

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ﴿٢٢﴾[2]

تو نے بنی اسرائیل کو ظالمانہ طور پر اپنا غلام بنا رکھا ہے پھر اپنے اس سفاکانہ عمل کو مجھ پر احسان قرار دیتا ہے۔

بہرکیف حضرت موسیٰ علیہ السلام خداوند عالم کی قدرت و قوت پر بھروسہ کرتے ہوئے فرعون جیسے مدعی ربوبیت کے ساتھ ٹکرا گئے اور بالآخر اسے غرور و اقتدار کی کرسی سے اتار پھینکنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ اس طرح کہ اسے دریائے نیل کی موجوں میں ڈبو کر اس کے شرمناک زندگی کا چراغ گل کر دیا اور عوام کو ایک ظالم اور خود پرست شخص کی غلامی اور پرستش سے نجات دلا دی۔

اس گفتگو کا نتیجہ یہ ہے کہ توحید عبادت اور یکتا پرستی کی راہ سے انحراف کرنے والا اولین گروہ وہ لوگ ہوئے جو کسی دباؤ میں آ کر دنیوی موجودات کی خدائی کا اعتراف کرتے تھے۔ وہ ظالم لوگوں کی دھمکیوں سے مرعوب ہو جاتے اور حالات سے مجبور ہو کر اپنے قلبی میلانات کے برعکس ان مادی چیزوں کی عبادت کرتے اور ان کے سامنے سجدہ ریز ہوتے تھے۔ پھر بہت بڑی بدبختی یہ ہے کہ سابقہ ادوار میں ایسے افراد کثیر تعداد میں رہے ہیں کہ جو بامر مجبوری اس مصیبت اور سختی میں پھنسے رہے ہیں۔

دوسرا گروہ یعنی وہ لوگ جو غیر خدا کی بندگی کا قرار کر کے ان ارضی یا سماوی اشیاء میں سے کسی ایک کو معبود کے طور پر پوجتے رہے ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو حد سے زیادہ محبت یا اندھی تقلید میں گرفتار ہو کر یا انتہائی بے اصل خیالات کے زیر اثر کسی مخلوق میں فوق العادت قدرت کا گمان کر بیٹھتے تھے۔ پس وہ اسے قابل پرستش سمجھنے لگتے اور بندگی کے اراد سے اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے تھے۔ اپنی اس عبادت گزاری سے ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ اس کے بدلے میں یہ معبود ہم پر نظر کرم فرمائے گا۔ ہم اس کے مورد توجہ بن جائیں گے اور پھر اس کی عظیم قدرت سے ہمیں خوش بختی اور کامیابی کا گوہر مقصود حاصل ہو جائے گا۔

---

[1] سورۂ شعراء آیت ۲۹

[2] سورۂ شعراء آیت ۲۲

انسان دشمن کردار

انسانوں کی بدبختی کی حد ہوگئی کہ دور حاضر میں بھی اس دنیا کے گوشہ دکنار میں اسے نادان افرد پائے جاتے ہیں جو ایسے خود ساختہ معبودوں کی خوشنودی اور رضا مندی حاصل کرنے اور ان کی خیالی قدرت سے مدد لینے کی خاطر ایسے ایسے غیر معقول اور انسان دشمن اقدامات کرتے ہیں کہ بشریت ان کی پست حرکات پر خجالت اور شرمندگی کے ساتھ سر جھکانے پر مجبور ہوجاتی ہے۔

مثلاً بھارت کے شہر جے پور کی فوجداری عدالت نے وہاں کے دو افراد کو سزائے موت سنائی کہ جنھوں نے ایک بارہ سالہ بچے کو اپنے معبودیت کی بھینٹ چڑھانے کے لئے قتل کردیا تھا۔ یہ ملزمان شہر میں پینے کا پانی سپلائی کرنے والے ادارے کے لئے پانی کے بڑے بڑے ٹینکر تیار کرنے کا ٹھیکہ لیا کرتے تھے۔ چنانچہ گزشتہ ماہ ٹھیکے کا کام شروع کرنے سے پہلے انہوں نے اپنے کام میں نفع حاصل کرنے کے لئے ایک بارہ سالہ بچے کو اس بت کے آگے ذبح کردیا۔ تاکہ وہ اس قربانی پر خوش ہو کر ان کے اس کاروبار میں اپنی نظر کرم سے برکت دے۔ ان ملزمان کے ساتھی بھی اس جرم میں شریک تھے اور عدالت نے انہیں عمر قید با مشقت کی سزا سنائی ہے۔ جب پولیس کو اس بچے کی گمشدگی کی اطلاع ملی تو وہ اسے ڈھونڈنے میں مصروف ہوگئی۔ کافی عرصہ تک انہیں اس کا کوئی سراغ نہ ملا، لیکن بالآخر جب انہوں نے اس بت کے سر اور چہرے پر خون کے چھینٹے دیکھے تو اس نے انہیں اس جرم کے ارتکاب کا شبہ ہوا۔ چنانچہ اس بنیاد پر مزید تفتیش ہوئی تو وہ اس بت سے کچھ فاصلے پر مقتول بچے کی لاش ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس کے بعد سے پولیس نے اس قسم کی کاروایوں پر کڑی نگرانی رکھنا شروع کردی ہے۔ لیکن پھر بھی اس شہر کے ہندو کبھی کبھی اپنے دیوتاؤں کے بتوں پر اس قسم کی قربانیاں پیش کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ [1]

صراط مستقیم سے انحراف

یہ لوگ اپنی عقل سے مدد نہیں لیتے، انسانیت کی ہدایت کے لئے آنے والے مردان حق کی تعلیمات پر کان نہیں دھرتے اور اپنی توہم پرستی اور خام خیالی پر مشتمل رسوم پر عمل کرنا ضروری سمجھتے ہیں جو معاشرے کے لئے ناسور کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے نتیجے میں یہ گروہ توحید عبادت کے صراط مستقیم سے منحرف ہوکر شرک کی راہ پر گامزن ہوجاتا ہے۔

قران مجید نے اپنی متعدد آیات میں مشرکین کے انحراف اور ان کے غلط طرز تفکر کی طرف اشارہ فرمائے ہیں، ہم ان کے

---

[1] روزنامہ اطلاعات شمارہ ۱۸۴۱۳

اس انحراف پر روشنی ڈالنے کے لئے چند آیات محترم قارئین کے سامنے پیش کئے دیتے ہیں۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰـهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ [1]

انہوں نے اپنے علماء اور راہبوں کے حق میں غلو کیا اور ان کے ساتھ حد سے زیادہ محبت میں وہ انہیں مقام ربوبیت تک لے گئے اور خداوند تعالیٰ کے حق کی شناخت کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس طرح انہوں نے مسیح بن مریمؑ کہ جو در حقیقت مخلوق خدا ہیں، انہیں معبود قرار دیا۔ حالانکہ انہیں اللہ وحدہ لاشریک کے علاوہ کسی دوسرے کی عبادت کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ وہ اللہ ان سب سے منزہ اور برتر ہے جن کو یہ لوگ اس کا شریک قرار دیتے ہیں۔

فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ۝ يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ۭ [2]

ان لوگوں نے (خدائی کے دعویٰ دار) فرعون کے حکم کی اتباع کی، حالانکہ اس کے حکم میں رشد و ہدایت نام کو بھی موجود نہ تھی۔ وہ بروز قیامت اپنے پیروکاروں کے آگے آگے چلتا ہوا سیدھا جہنم میں جائے گا اور ان سب کو اپنے ساتھ اس کی آگ کے سپرد کر دے گا۔

فکری جمود

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ۝ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَاۗءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ۝ [3]

جب (حضرت ابراہیمؑ) نے اپنے (منہ بولے) باپ اور اپنی قوم سے کہا: یہ جام و ساکت بت کیا ہیں کہ جن کی تم پوجا کرتے ہو اور خود کو اس فکری جمود کا اسیر بنا چکے ہو؟ وہ بولے: ہمارے آباؤ اجداد بھی انہیں کی پرستش کرتے تھے اور ہم بھی ان کی پیروی کرتے ہیں۔

قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـــًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ۝ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ [4]

---

[1] سورۂ توبہ آیت ۳۱

[2] سورۂ ہود آیت ۹۷۔۹۸

[3] سورۂ انبیا آیت ۵۲۔۵۳

[4] سورۂ انبیا آیت ۶۶۔۶۷

ابراہیمؑ نے کہا کیا اس اللہ کو چھوڑ کر کہ کائنات کے تمام امور جس کے دست قدرت میں ہیں، تم ان بتوں کی عبادت کرتے ہو جو نہ تمہیں کوئی نفع دے سکتے ہیں اور نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ افسوس ہے تم پر۔ اور ان تمام بتوں پر جن کی تم خدائے یکتا و یگانہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو۔ کیا تم عقل و فکر نہیں رکھتے ہو؟

اول و دوم ہر دو گروہ اگر چہ توحید و یکتا پرستی سے منحرف ہونے میں باہم شریک ہیں اور غیر خدا کی بندگی قبول کئے ہوئے ہیں، لیکن چند ایک جہان سے باہم تفاوت بھی رکھتے ہیں یہاں ہم ان جہات کی طرف اشارہ کریں گے، البتہ یہ نکتہ واضح ہے کہ گروہ دوم اپنی بدبختی۔ سیاہ روئی اور رخسارہ کاری میں گروہ اول کی نسبت بہت آگے ہے۔

اپنی عقل کی سرکوبی

گروہ اول کے لوگ خود اپنی رضا و رغبت سے کسی بت یا مدعی ربوبیت کی بندگی قبول نہیں کرتے، بلکہ وہ بت پرستوں یا ظلم واستبداد کے پیکر کسی خود پرست ظالم کے دباؤ میں آجاتے ہیں اور جھوٹے معبود کی عبادت ان پر مسلط کر دی جاتی ہے، یوں وہ ناچار و مجبور ہو کر ان جھوٹے معبودوں کی عبادت کیا کرتے ہیں۔ لیکن گروہ دوم کے لوگ اپنی نادانی و جہالت سے عقل کو چھوڑ دیتے اور رہبران الٰہی کی پکار سے بے اعتنائی برتنے کے سبب چند ایک ضعیف اور بے کار اشیاء مثلاً انسان و حیوان یا جمادات و نباتات میں سے کسی کو اپنا معبود حقیقی قرار دے لیتے ہیں اور خود ہی اس کی عبودیت کا طوق گلے میں ڈال لیتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی ناسمجھی کے تحت ایک کمزور موجود کو خدائی کے لئے منتخب کرتے اور پھر اپنے ارادہ اختیار کے ساتھ اس کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔ بلکہ بزعم خود تو وہ اپنے اس تذلل و بندگی کو ایک مقدس معنوی اور روحانی فریضہ سمجھتے ہیں اور یہ باور کرتے ہیں کہ ان کی سعادت و کامیائی کا راز اسی مخلوق پرستی میں پوشیدہ ہے۔

گروہ اول کے لوگ ان خود ساختہ خداؤں پر قلبی اور ایمانی عقیدہ نہیں رکھتے، بلکہ وہ اپنی جان و مال اور عزت و شرف کے ڈر سے ایسی جھوٹی عبادات اور باعث شرم پرستش کرنے کا اقرار کر لیتے ہیں۔ لیکن دوسرے گروہ والے اپنے منتخب کردہ معبودوں سے قلبی عقدیت بھی رکھتے ہیں او انہیں صمیم قلب سے قابل پرستش سمجھتے ہیں۔ وہ بڑے خلوص کے ساتھ ان کے سامنے نیاز مندی کا اظہار کرتے ہیں اور خلوت و جلوت ہر حال میں ان سے راز و نیاز کرتے ہوئے اپنی حوائج و مشکلات کے حل میں ان کی خیالی قدرت سے مدد کے طلبگار ہوتے ہیں۔

آزادی کی آرزو

پہلے گروہ والے چونکہ اپنی فطری آزادی کے خلاف جبر و اکراہ کے تحت بددلی سے ان جھوٹے خداؤں کے سامنے جھکتے اور اپنی اس اسیری و بدبختی کے غم میں گھلتے رہتے، اس لئے ہمیشہ اپنے دل میں یہ آرزو پالا کرتے کہ کبھی تو ایسا ایک آزاد جانباز مرد یا خدائی پیغمبر قیام کرے گا اور ان بتوں کو توڑ دے گا جو عوام کے لئے وبال جان بنے ہوئے ہیں یا اس خودسر، مسند حدائی کے دعویدار کے زوال کا

موجب بنے گا یا کم از کم اس کی ظالمانہ قوت کو اس حد تک کمزور کرنے میں کامیاب ہوجائے گا کہ عوام اس کی بندگی و پرستش سے آزاد ہو سکیں گے اور اس بدبختی و تیرگی سے نجات پالیں گے۔

چنانچہ اگر ایسا کوئی نجات دہندہ قیام کرتا اور حضرت موسیٰ بن عمران کی طرح فرعون کی خدائی پر ضرب کاری لگاتا تھا تو ایسے لوگ باطنی طور پر انتہائی مسرور و شادمان ہوتے تھے۔ کیونکہ اس کے طفیل ان کی کھوئی ہوئی آزادی ایک حد تک انہیں واپس مل جاتی اور چند دن کے لئے وہ ان خداؤں کی قید و بند سے خلاصی پانے اور آرام کا سانس لینے میں کامیاب ہوجاتے۔ لیکن دوسرے گروہ کے لوگ جو اپنی نادانی و بے عقلی سے عام موجودات کو معبود مانتے اور انتہائی خلوص و اعتقاد کے ساتھ ان کی پرستش میں مگن ہوتے اور انہیں ان خداؤں سے طبعاً دل بستگی اور محبت ہوجاتی تھی۔ لہٰذا اگر ان کے دور میں کوئی ابراہیم خلیل ان کے خداؤں کی اہانت یا زک پہنچاتا تو وہ سخت ناراض اور غمگین ہوجاتے تھے۔ وہ بتوں کے ساتھ اس سلوک میں اشکبار ہوتے فریادیں کرتے اور اس توہین کرنے والے کے گناہ کو ناقابل معافی جرم قرار دیتے اور مطالبہ کرتے تھے کہ اسے سخت ترین سزا دے کر کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔ تاکہ اس کاروائی کے ذریعے ان کے دلوں کو تسکین ملے اور وہ اپنے خداؤں کو بھی راضی و خوشنود کرنے میں کامیاب ہوجائیں۔

گروہ اول چونکہ خود ساختہ خداؤں سے قلبی اعتقاد و وابستگی نہیں رکھتا تھا، اس لئے ان کے لئے یہ امر بہت جلد ممکن ہوجاتا تھا کہ اس ناجائز پرستش کی زنجیروں سے خود کو آزاد کرلیں اور غیر خدا کی بندگی سے نجات پالیں۔ کیونکہ جوں ہی انہیں نیا ماحول میسر آتا اور وحشت انگیز فضا سے رہائی پاتے تو پھر انہیں جھوٹے خداؤں کے سامنے جھکنے کی کوئی ضرورت نہ رہتی، اس لئے دوبارہ ان کا نام تک بھی نہ لیتے اور اس قسم کی غیر واقعی و ناشائستہ پرستش و عبادت سے گلوخلاصی حاصل کرلیتے۔ لیکن گروہ دوم والے چونکہ غلط فکری کی بنیاد پر کسی شئی کو اپنا خدا بنا بیٹھتے اور اپنی رضا و رغبت کے ساتھ اس کی بندگی کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیتے تھے۔ اس لئے وہ اس پوچ عقیدے اور ٹیڑھے راستے سے ہرگز خلاصی نہ پاسکتے تھے، سوائے اس کے کہ ان کا ذہن بیدار ہو، طرز تفکر تبدیل ہو اور اپنی عقل کی طاقت سے اس باطل عقیدے کا داغ اپنے سینے سے دور کرنے میں کامیاب ہوجائیں اور اپنے دامن سے شرک کی اس نجاست کو الگ کردیں۔ پس یہی ایک راستہ تھا جس کے ذریعے سے وہ اس ذلت کی بندگی کی قید سے آزاد ہوسکتے تھے۔

پیغمبر اسلام کا فریضہ

اسلام کے پیغمبر گرامیؐ توحید عبادت اور یکتا پرستی کی روح زندہ کرنے کے لئے حق تعالیٰ کی طرف سے مامور کئے گئے تاکہ ان دونوں گروہوں کی نجات کے لئے کوشش فرمائیں۔ آپ کا فریضہ یہ تھا کہ بہر صورت اس باطل کی بندگی کے خلاف جہاد کریں۔ عوام کے کندھوں سے اس بھاری بوجھ کو اتاریں اور ان کی مجبوری و اسیری کی یہ زنجیریں توڑ دیں۔

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ [1]

---

[1] سورۂ اعراف آیت ۱۵۷

آپ اس امر کے لئے مامور تھے کہ ایک طرف تو بتوں اور بتکدوں کو ویران کریں، متکبرین اور مدعیان الوہیت کے ظالم ہاتھوں سے ان مظلوم انسانوں کو آزاد کرائیں اور عوام کو لکڑی، پتھر، سورج، چاند نیز بت، درخت، انسان اور حیوان یا ہر ایسی شئی کی پرستش سے نجات دلائیں جس کی عبادت میں شرک کا شائبہ موجود ہوتا ہے۔ دوسری طرف آپ کا یہ بھی فریضہ تھا کو معاشرے میں فکر وعقل کی بیداری پیدا کریں اور عوام میں ایک فکری تحریک برپا کریں، تاکہ وہ لوگ از خود اپنی عقل وخرد کے پرتو اور فکر وشعور کی قوتوں سے ان عقائد کی پستی اور کمزوری سے آگاہ ہوجائیں اور شرک عبادت کی غلطی سے واقفیت حاصل کرلیں۔ پس وہ خود ہی اپنے آپ کو باطل عقائد اور غیر خدا کی بندگی وغلامی کی قید سے آزاد کرلیں۔

ہاں تو آیت الکرسی اس دوسرے گروہ کے افراد کے عقول کو بیداری بخشنے اور انہیں باطل پرستی سے نجات دلانے کے لئے نازل ہوئی ہے۔ اس میں ایسے مضامین موجود ہیں جن سے عقل وخرد کی قوت کو کام کرنے کی تحریک ہوتی ہے اور حقیقی معبود کی شناخت حاصل ہوتی ہے گویا یہ آیت انسانوں کو شرک اور بت پرستی سے رہائی دلاتی ہے۔ آیت الکرسی آزادی بشر کو عبادت اور عبودیت کے صحیح راستے کی ہدایت کرتی ہے۔ آیت الکرسی لوگوں کو خداوند علیم وقدیر کے ایسے صفات کی شناسائی عطا کرتی ہے، جو اس ذات اقدس کی بندگی کرنے کی دعوت دیتے ہیں، آیت الکرسی الٰہی صفات کمال کے بیان کے ساتھ ساتھ لوگوں کو خود ساختہ خداؤں کے نقائص کی طرف بھی متوجہ کرتی ہے۔

وہ انہیں یاد دلاتی ہے کہ عقل کی نعمت سے مالا مال انسان جسے اس قدر عظمت وبزرگی حاصل ہے، اس کے لئے ہرگز مناسب نہیں کہ وہ اپنی آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھائے اور خود اپنے ہاتھوں جمادات ونباتات یا حیوان وانسان میں سے کسی کی بندگی کا طوق اپنے گلے میں ڈال لے اور ایک ناچیز وپست مخلوق کو معبود قرار دے کر اس کی پرستش کرنے لگے۔

آیت کی لفظی تشریح:

اللہ لا الہ الا ھو

اللہ: یہ ذات اقدس الٰہی کا نام ہے، اس لئے یہ اس کے علاوہ کسی اور مورد میں استعمال نہیں ہوتا۔

الہ: اس کا معنی ہے ہر وہ ذات کہ جس کی عبادت وپرستش کی جائے، چاہے وہ حق ہو یا باطل ہو۔ اسی لئے قرآن مجید میں یہ لفظ الہ: باطل معبودوں کے لئے بھی بار بار استعمال کیا گیا ہے۔

قَالُوا يٰمُوسَى اجْعَل لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ [1]

انہوں نے کہا اے موسیٰ! ہمارے لئے بھی ایک معبود بناؤ جیسے ان کے معبود ہیں۔

افرأیت من اتخذ الهه هواه [2]۔

---

[1] سورۂ اعراف آیت ۱۳۸

[2] سورۂ جاثیہ آیت ۲۳

کیا تو نے اس کو دیکھا کہ جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔

قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ [1]

انہوں نے کہا اسے جلاڈالو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو۔

یکتا پرستی

رسول اکرمؐ ایسے ماحول میں تشریف لائے جہاں پتھر یا لکڑی کے سینکڑوں چھوٹے بڑے بت بنا کر کعبہ کی دیوار میں ٹکا دیئے گئے تھے اور ان میں ہر بت ایک خاص قبیلے اور قوم کا ''الہٰ'' یعنی معبود تھا۔ وہ لوگ ان جمادات کی عبادت کرتے اور ان کے سامنے تذلل اور بندگی کا اظہار کیا کرتے تھے۔ آنحضرتؐ کو مامور کیا گیا کہ ان جھوٹے اور خودساختہ معبودوں کو ختم کر دیں، اس ناروا بندگی و پرستش کو روک دیں اور عبادت کو فقط اس حقیقی معبود سے مختص کر دیں، جو ساری کائنات کا پروردگار ہے۔

یہ کام مشرکین کے لئے انتہائی دشوار اور موجب اضطراب تھا اور وہ اسے ناقابل عمل سمجھتے تھے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ۳۶۰ معبودوں کی جگہ ایک معبود کو لایا جائے اور وہ لوگ ان معبودوں کو ترک کر کے ایک معبود سے وابستہ ہو جائیں۔

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ○ [2] ہ

کیا وہ سب خداؤں کو ایک معبود بنا رہا ہے یقیناً یہ تو بڑی عجیب شئے ہے۔

اسلام کے اس عالی مرتبت پیشوا۔ نبی اکرمؐ نے سعادت بخش اور نجات دینے والی دعوت کا آغاز کلمۂ توحید کے اعلان کے ساتھ فرمایا اور لوگوں سے کہا:

قولو الا الہ اللہ تفلحوا

ان تمام خودساختہ اور جعلی خداؤں کو دل سے نکال دو اور عبادت و بندگی فقط ایک خدا سے مختص کر دو کہ جو خالق۔ قادر اور پروردگار ہے۔ اپنی زبان کو لا الہ الا اللہ کے نعرے سے آراستہ کرو اور دل سے اس پر اعتقاد رکھو۔ یہ توحید و یکتا پرستی کا نعرہ ہے اور اطمینان رکھو کہ اسی کے سائے میں تمہیں تمام سعادتیں اور کامیابیاں حاصل ہو جائیں گی۔

رمز رستگاری

لا الہ الا اللہ اسلام کا وہ کلمۂ توحید ہے جو عوام کے قلوب میں یکتا پرستی کی بنیاد قائم کرتا ہے۔ اس کلمے کا اصلی ہدف یہ ہے کہ بشر کو تمام ناروا غلامیوں سے آزادی بخشے، جعلی اور خودساختہ معبودوں سے نجات دلائے اور حقیقی الوہیت و معبودیت کو خالق کائنات

---

[1] سورۂ انبیا آیت ۶۸

[2] سورہ ص آیت ۵

خداوندلایزال کے لئے ثابت ورائج کرے۔

ماضی کے طویل ترین ادوار میں انسان نے اپنی نادانی اور نارسائی سے یہ خیال کئے رکھا کہ یہ ارضی یا سماوی موجودات فوق العادت قدرت کے مالک ہیں اوراپنے اندرایک قسم کی غیبی طاقت رکھتے ہیں،لہٰذا اگر آدمی ان باقدرت موجودات کا غلام بن جائے اورخودکوان کا بندہ قراردے تو اسے یہ سہولت ہوجاتی ہے کہ وہ اپنی حاجات ومشکلات کے حل میں ان کی ناشناختہ قدرت سے استفادہ کرے اوراپنی مرادیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے۔

فکری جمود

یہ غلط عقیدہ ان مشرک لوگوں میں فکری جموداور عقلی تاریکی کا باعث ہوااورانہیں کمال وبلندی سے محروم کرتارہا جوایک آزاد فکراورروشن عقل کی پیداوار ہوتے ہیں۔جب انسان نے اس غیر واقعی تصور کو قبول کرلیا تو مطالعہ۔تفکر اور عقل وخرد سے کام لینا چھوڑ دیا۔اس طرح اس نے اپنے انسانی پیکر میں ایک سخت ترین وارکیااورخودکوتوہم وخرافات کے تاریک اور کثیف زندانوں میں بندکرلیا۔

جوشخص شرک کی طرف مائل ہوتا ہے وہ کسی انسان۔حیوان۔نبات یا جماد کی بندگی وغلامی میں جکڑا جاتا ہے اوراس کا یہ عمل اسے انسانیت کے آسمان رفیع سے نیچے پھینک دیتا ہے۔پھر وہ اس قدرپستی وبدبختی کا شکار ہوجاتا ہے کہ معاشرے کونوچنے والے خونخوار وڈیرے اسے لالچ کی نگاہ سے دیکھتے اوراس کوشش میں لگ جاتے ہیں کہ اس شخص کے کمزوراور پست وجود کا شکار کریں اوراسے اپنا لقمہ بنالیں۔اگر بالفرض وہ ان خونخواروں کے چنگل سے بچ جائے تو بھی اسے انسانی معاشرے میں کوئی مقام حاصل نہیں ہوسکتا اورحوادث کے طوفان اس بے عقل اورکوتاہ فکر شخص کوایک تنکے کی طرح اٹھا کر ذلت وخواری کے گہرے کھڈ میں پھینک دیتے ہیں اور وہ انسانی عظمت سے محروم ہوکر طاق نسیان میں اٹکارہتا ہے۔

وَمَنۡ يُّشۡرِكۡ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخۡطَفُهُ الطَّيۡرُ اَوۡ تَهۡوِىۡ بِهِ الرِّيۡحُ فِىۡ مَكَانٍ سَحِيۡقٍ ۳۱ [1]

اور جوبھی اللہ کا شریک ٹھہراتا ہے، پس وہ ایسا ہے کہ گویا آسمان گر پڑا ہو۔پھراسے ایک پرندے نے اٹھا کر یا ہوا نے اڑا کر ایک دورافتادہ مقام پر پھینک دیا ہو۔

کلمہ توحید''لا الہ الا اللہ'' نعرۂ آزادی اورتمام غلامیوں اور ناروا بندگیوں سے رہائی کی علامت ہے۔اسلامی احکام کے مطابق آزادی عطا کرنے والا یہ نعرہ تمام اسلامی شہروں میں اذان کے ذریعے ہرروز بلند کیا جاتا ہے۔اس طرح قرآن مجید کے پیروکار توحید ویکتا پرستی کی یہ آواز پوری کائنات کے باسیوں کے کانوں تک پہنچانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔نیز ہر مسلمان فرد کے لئے ضروری ہے کہ وہ اقامت میں یا دیگر یومیہ فرائض میں بار بار اس مقدس نعرے کا تکرار کرتا رہے اوراقسام وانواع کی غلامیوں سے

---

[1] سورۂ حج آیت ۳۱

آزادی حاصل ہونے کی سعادت کو یاد رکھنے میں کوشاں رہے۔

''لا الہ الا اللہ'' یہ کلمہ توحید ایک مسلمان کا اولین شناختنامہ ہے اور جو بھی انسان اسلام سے شرف ہونا چاہتا ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس مقدس شعار کو قبول کر کے ابتداء ہی سے خود کو بندگی وغلامی کے تمام اقسام سے آزاد کرائے۔ وہ تمام بناوٹی خداؤں کو پاؤں تلے روندڈالے اور خدائے یکتا ویگانہ کے علاوہ کسی دیگر موجود کو خواہ وہ انسان ہو یا حیوان، نبات یا جماد، ارضی ہو یا سماوی اس کو قابل پرستش خیال نہ کرے اس کے بعد اپنے پورے وجود کے ساتھ اپنے یکتا پرستی کے عقیدے کو زبان پر لائے اور شھد ان لا الہ الا اللہ کے الفاظ سے اس کا اعلان کرے۔

اسلام کا بلند ہدف

اسلام کے مقدس مکتب کا بلند ترین ہدف اور گرانقدر مقصد پنہاں وآشکار بندگی کی تمام اقسام سے نجات اور آزادی کا حصول ہے۔ ایک مسلم فرد پر فرض ہے کہ ہمیشہ اپنی حفاظت کرے اور نگاہ رکھے کہ کہیں بھی اس کا قدم یکتا پرستی کی راہ پر لغزش نہ کھانے پائے۔ وہ غیر خدا کی عبودیت کا طوق کبھی بھی اپنی گردن میں نہ آنے دے اور اپنی اس قیمتی آزادی اور بیش بہا حریت کو ایک لحظے بھی اپنے ہاتھوں سے نہ جانے دے۔

عن الصادق علیہ السلام من أصبح مهموما لسوى فكاك رقبة فقد هون عليه الجليل ورغب من ربه في الربح الحقير۔ [1]

حضرت امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں جو شخص صبح اٹھے اور اس کے دل میں اپنی انسانی آزادی سے ہٹ کر کسی دوسری چیز کا غم ہو اور وہ اس کے بارے میں متفکر ہو تو وہ یاد رکھے کہ اس نے ایک بلند ترین انسانی ہدف کو کمتر اور حقیر شمار کر رکھا ہے۔ وہ اپنی توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف مبذول کرنے کی بجائے ایک ناچیز منفعت میں اپنا دل لگائے ہوئے ہے۔

نتیجہ توحید

کلمہ توحید ''لا الہ الا اللہ'' اس جہان میں باایمان افراد کو دو اعتبار سے فائدہ پہنچاتا ہے۔ پہلا فائدہ یہ کہ انہیں ایک زندگی بخش آزادی کی لذت سے آشنا کرتا ہے اور دوسرا یہ کہ انہیں ارضی وسماوی موجودات کی پرستش اور غلامی کے عذاب سے رہا کر دیتا ہے۔

جہاں تک بعد از موت دوسری دنیا میں اس مقدس کلمے کے فوائد کا تعلق ہے تو اہل البیت علیہم السلام کی روایات کے بموجب اسی کے صدقے میں وہاں بہشت کی نعمات اور عذاب الٰہی سے نجات ملتی ہے اور یہ جہنم سے بچاؤ کے لئے قلعے کا کام دیتا ہے۔ پس دوسری دنیا میں کلمہ توحید کا فائدہ دو اعتبار سے مرتب ہوتا ہے۔ پہلے یہ کہ موحدین بہشت کی جاودانی نعمات کے حصول میں کامیاب اور

---

[1] تحف العقول ص ۳۰۲

ان کی لذت سے خوشنود ہوتے ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ عذاب ابدی سے ہمیشہ کے لئے مامون ہو جاتے ہیں۔

قال ابو عبداللہ علیہ السلام قول: لا الہ الا اللہ ثمن الجنة۔ [1]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:۔"لا الہ الا اللہ" کہنا جنت کی قیمت ہے۔

لما وافی الو الحسن الرضا علیہ السلام نیسبا بور فاراد ان یرحل منہا الی المامون اجتمع الیہ اصحاب الحدیث فقالو ایا بن رسول اللہ ترحل عنا ولا تحدثنا بحدیث نستفیدہ منك وکان قد قعد فی العماریة فاطلع رأسہ وقال سمکت أبی موسی بن جعفر یقول سمعت ابی محمد بن علی یقول سمعت ابی علی بن الحسین یقول سمعت أبی الحسین علی یقول سمعت أبی امیر المومنین علی بن ابی طالب یقول سمعت رسول اللہ (ص) یقول سمعت جبرئیل یقول سمعت اللہ عزوجل یقول لا الہ الا اللہ حصنی فمن دخل حصنی أمن من عذابی فلما مرت الراحلة نادی بشروطھا وانا من شروطھا۔ [2]

قلعہ الٰہی

حضرت ابوالحسن امام علی رضا علیہ السلام اپنے سفر کے دوران جب نیشاپور شہر میں وارد ہوئے تو کچھ دیر آرام فرمایا۔اس کے بعد جب دوبارہ اپنی سواری کے محمل میں سوار ہوئے کہ اس شہر سے روانہ ہوں تو اصحاب حدیث نے گھیر لیا اور عرض کرنے لگے اے فرزند رسول اللہؐ! آپ ہمارے شہر سے جا رہے ہیں، لیکن آپ نے ہمیں کوئی حدیث نہیں سنائی کہ جس سے ہم فائدہ اٹھانے۔حضرت نے اس وقت اپنی عماری سے سر اقدس باہر نکالا اور فرمایا میں نے اپنے والد گرامی امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام سے سنا انہوں نے فرمایا کہ میں نے اپنے والد محترم امام جعفر صادق علیہ السلام سے سنا پھر آپ اپنے اجدا پاک کی سند کا تذکرہ کرتے گئے تا آنکہ حضرت امام علی بن ابی طالب علیہ السلام تک پہنچے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا۔انہوں نے فرمایا کہ میں نے جبرئیل امین سے سنا اور انہوں نے فرمایا میں نے ذات الٰہی سے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: الا الہ الا اللہ" میرا قلعہ ہے اور جو بھی میرے قلعے میں آ گیا وہ میرے عذاب سے محفوظ ہو گیا۔جب آپ کی سواری چل پڑی تو آپ نے دوبارہ اپنی عماری سے سر نکالا اور باآواز بلند ندا دے کر فرمایا: یہ کلمۂ توحید چند ایک شرائط کے ساتھ الٰہی قلعہ ہے اور میں خود بھی ان شرائط میں سے ایک شرط ہوں۔

ایک عظیم الشان روایت کا آخری جملہ کچھ زیادہ قابل غور ہے، گویا امام رضا علیہ السلام اصحاب حدیث اور مسلمانوں کی

---

[1] ثواب الاعمال ص ۱۸

[2] ثواب الاعمال ص ۲۱

جمعیت کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ''لا الہ الا اللہ'' کو اس قدر اہمیت اور اس کی اتنی قدر و قیمت صرف اس وجہ سے نہیں کہ آدمی اس کے مفہوم کا معتقد ہو جائے اور یکتا پرستی پر ایمان لے آئے۔ بلکہ یہ کلمہ عذاب الٰہی سے بچانے والا خدائی قلعہ تبھی بن سکتا ہے جب کلمہ گو ایمان توحیدی کے علاوہ اس کی تمام شرائط سے بھی وابستہ ہو گیا ہو اور اس کے تمام مقررات پر عمل در آمد کرتا ہو نیز یہ کہ ان شرائط کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کو واضح کرنے کے لئے چند ایک مطالب کا تذکرہ ضروری ہے اور وہ ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں۔

آزادی کی طرف تمایل

آزادی کی طرف دلی میلان انسان کی طبیعی خواہشات میں سے ایک اہم ترین خواہش ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حکیمانہ فیصلے کے تحت یہ خواہش انسان کی فطرت میں ودیعت فرمادی ہے۔ ہر ملت اور قوم کے تمام افراد حریت و آزادی کے شیفتہ ہوتے ہیں، لیکن جو نکتہ یہاں قابل ملاحظہ ہے یہ ہے کہ کسی قوم میں خوئے آزادی اور پائیداری استحکام جبھی حاصل ہو سکتا ہے کہ اس کی حدود کا تعین صحیح اندازوں کے ساتھ کیا گیا ہو اور وہ حد سے تجاوز نہ کرنے پائے۔ کیونکہ اگر آزادی اپنی صحیح حدود سے تجاوز کر جائے تو اسکا الٹا اثر مرتب ہوتا ہے اور آزادی کے سلب ہونے کا موجب بن جاتی ہے۔

بالفاظ دیگر صحیح اور معقول آزادی و حریت جو نوع بشر کے لئے مایۂ سعادت و خوش بختی قرار پاتی ہے، وہ ہی حریت ہے جو افراط و تفریط سے محفوظ ہو۔ کیونکہ اگر وہ حد سے تجاوز کر جائے اور افراط کا رنگ لے لے تو ہرج و مرج اور بے نظمی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور اگر آزادی اپنی واقعی حد تک پہنچنے ہی نہ پائے تو وہ ناروا محرومیت و محدودیت کا باعث بن جاتی ہے۔

تمام عادلانہ قوانین جو پیغمبران الٰہی یا عقلاء نوع بشر کی طرف سے انسانی خواہشات کو محدود رکھنے کے لئے وضع کئے گئے ہیں۔ وہ ظاہری نگاہوں میں ایسے دکھائی دیتے ہیں کہ گویا عوام کی آزادی کی خواہش کا ایک حصہ ان کے ذریعے پامال کر دیا گیا ہے۔ لیکن حقیت بین نگاہیں سمجھتی ہیں کہ فی الواقع یہی قوانین آزادی کی حفاظت کے ضامت اور ہرج مرج سے بچاؤ کا واحد وسیلہ ہیں۔

آغاز آزادی

ویل ڈورانٹ کہتا ہے: آزادی کی اولین شرط محدودیت ہے کہ زندگی چند مخالف طاقتوں کے درمیان توازن و تعاول پیدا کرنے کا نام ہے، جس طرح زمین کا فضا میں معلق ہونا چند مخالف طاقتوں کے درمیان تعادل کا نتیجہ ہے۔[1]

جان ڈیوئی کہتا ہے: خاص قوانین وضع کرنے کی ضرورت کا ادراک آزادی میں بہت بڑا نقش قائم کرتا ہے آزادی درحقیقت ایک ضرورت کو حقیقی طور پر درک کرنے کا نام ہے اور جب م عواقب کی پیش بندی یا نتائج کے حصول کے لئے قانون کا

[1] لذات فلسفہ ص ۳۴۵

استعمال کرتے ہیں تو وہیں سے ہماری آزادی کی ابتدائی ہوجاتی ہے۔[1]

وہ لوگ جو آزاد رہنا چاہتے ہوں اور مسلسل آزادی گزارنا چاہتے ہوں، ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ شرائط آزادی کے سامنے سر تسلیم خم کریں۔ وہ ان تمام صحیح اور عادلانہ قوانین کو مان لیں اور ان پر صمیم قلب سے عمل کریں جو ناروا آزادی کو محدود کرنے کے لئے بنائے جاتے ہیں، ورنہ وہ الٹے پاؤں پلٹ جائیں گے اور آزادی ہی نابود کردیں گے۔

قال علی السلام: من قام بشرائط الحرية اهل للعتق ومن قصر عن احكام الحريه اعيد الى الرق۔[2]

امام علی السلام نے فرمایا: جو بھی آزادی کی شرائط کو انجام دے گا وہی آزادی کے لائق ہوگا اور جو بھی آزادی کے شرائط ومقرارت سے پیچھے ہٹے گا اور کوتاہی کرے گا وہ غلامی کی طرف پلٹ جائے گا۔

رہبر کی ضرورت

اسی قانون کی بنیاد پر ماہرین اجتماعیات کہتے ہیں آزادی سے بہرہ ور ہونے کے لئے ایک رہبر کا وجود ضروری ہے جو عوام کو بتلائے کہ وہ آزای سے کس طرح استفادہ کریں۔ یعنی وہ اپنے حق آزادی سے مستفید ہونے کے لئے اس طرح اقدام کریں کہ دوسروں کی آزادی پر تجاوز نہ ہو اور خود بھی حق آزادی سے محروم نہ ہوجائیں۔

کلمہ ''لا الہ الا اللہ'' اسلام میں معنوی آزادی اور روحانی حریت کا اعلان ہے جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔

پہلے حصے میں تمام معبودوں کی نفی اور ہر قسم کی بندگی سے آزادی مطلق اور دوسرے حصے میں خدائے واحد و یکتا کی برحق معبودیت کا اعتراف و یقین اور اس کی ذات اقدس کی بندگی و عبودیت کی قبولیت و تسلیم ہے۔

در جھان آغاز کا راز حرف لا است
این نخستین منزل مرد خدا است

اس جہاں میں کام کی ابتداء حرف نفی سے ہوتی ہے اور ایک مرد خدا کی اولین منزل یہی ہے

تانہ رمزلہ لاالہ آ یہ بدست
بندہ غیر اللہ رانتوان گست

جب تک لا الہ یعنی نفی معبود کی رمز پر آگاہی نہ ہو تب تک غیر اللہ کے بندھن کو کھولنا ناممکن رہے گا۔

---

[1] اخلاق وشخصیت ص ۲۷۸

[2] غرر الحکم ص ۶۶۱

پیش غیر اللہ لاگفتن حیات
تازہ ازہنگامہ او کائنات

غیراللہ کے سامنے لا (یعنی نہ) کہہ دینا یہ دراصل زندگی ہے، بلکہ اس کے صدقے سے یہ کائنات تروتازہ ہے

ہر کہ اندر دست اور شمشیر لا است
جملہ موجودات را فرمانرواست

ہر وہ شخص کہ جس کے ہاتھ میں لا کی شمشیر ہے وہی ان تمام موجودات پر حاکم ہے

ریز ریز ازضرب اولات ونات
درجہات آزاداز بند جہات

اسی لا کی شمشیر کی ضرب سے لات ومنات ریزہ ریزہ ہوئے اور جہات کے اندر رہتے ہوئے جہات کی بندش سے آزادی حاصل ہوگئی

عالمی در آتش او مثل خس
ایں ہمہ ہنگامہ لا بودو بس

سارا جہاں اس لا کی آگ میں تنکے کی مثل ہے۔ یہ سب کچھ لا کے نعرے کیوجہ سے ہوا اور اس کے علاوہ کچھ نہیں

لا والا احتساب کائنات
لا والا فتح باب کائنات

لا اور الا یعنی سب کی نفی اور فقط ایک کا اثبات ہے اور اسی نفی واثبات میں پوری کائنات کا نظام ہے اور اسی لا والا سے ہی پوری کائنات کا دروازہ کھلا ہے۔

ہر دو تقدیر جہاں کاف ونون
حرکت ازلا ز ایداز لا سکون

کلمہ کن فیکون جس سے اس کائنات کے وجود میں آنے کی طرف قرآنی اشارہ ہے اس کن کے کاف ونون والے جہان کی تقدیر یہ دونوں لا والا مل کر بنتے ہیں یعنی تقدیر کائنات کا راز خدائے وحدہ کی معبودیت کے اثبات اور دیگر ہر خدا ومعبود کی نفی میں پوشیدہ ہے۔ اس لا، یعنی ہر معبود کی نفی سے حرکت پیدا ہوتی ہے اور یہ ایک انقلاب آور حقیقت ہے اور الا سے سکون آ جاتا ہے یعنی ذات وحدہ کے لئے معبودیت کا اعتراف کرنے سے تسکین قلب حاصل ہوجاتی ہے۔

فکر گر در تند باد با بماند
مرکب خود راسوی الا نراند

اگر کسی کی فکرلا کے طوفان ہی میں گم ہوکررہ جائے تو وہ اپنی سواری کوالا کی طرف حرکت نہ دے یعنی اگر کوئی شخص غیر اللہ سے معبودیت کی نفی کی حقیقت خود بخود کھل جائے گی اور اوراس کا شک وتردد دور ہوجائے گا۔

در مقام لانیا ساید حیات
سوی الامی خرامد کائنات

مقام لا میں زندگی کو آسائش نصیب نہیں ہوتی اور پوری کائنات اصل میں الا کی طرف ہی خراماں خراماں جارہی ہے۔یعنی فقط نفی معبود سے چین وآرام ملنا ناممکن ہے۔جب تک اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لئے معبودیت کا اثبات نہ کیا جائے

بانگ حق از صبح خیز یہای اواست
ہرچہ ہست از تخم ریز یہای اوات

حق کی صدااس کی صبح خیزیوں کا صدقہ ہےاور ہرموجود کا وجوداسکی تخم ریزیوں کی وجہ سے ہے۔

لا والا ساز وبرگ امتان
نفی بے اثبات مرگ امتان

لا اورالا دونوں مل کران اقوام عالم کی آبادی کا بنیادی سامان بنتے ہیں اور اگر فقط نفی کی جائے اوراثبات نہ کیا جائے تو اس سے کائنات کی ہلاکت وتباہی ہوجائے گی یعنی غیر اللہ کی الوہیت کی نفی اور اللہ کے لئے الوہیت کا اثبات ایک حقیقت ہے۔پس اس میں پوری کائنات کی آبادی اور زندگی کا راز مضمر ہےاور اگر معبود کی مطلقاً نفی کردی جائے اور نہ اللہ کو معبود مانا جائے اور نہ ہی غیر اللہ کو تو پھر یہ جہان بے وارث نظر آتا ہے اور اس صورت میں جہان کا قائم رہنا ناممکن ہے۔اسلئے ضروری ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اللہ اس جہان کا موجد وناظم اور باقی رکھنے والا ہے،اس کے علاوہ کوئی نہیں کہ جس نے یہ جہان بنایا اور اسے قائم رکھے ہوئے ہو اوراس کو بھی معبود مانا جائے،پس نفی واثبات کا یہ مجموعہ ایک حقیقت ہے اور تمام قوموں کی آبادی کا راز اسی میں مضمر ہے

خداوند تعالیٰ کی بندگی قبول کرنا معنوی آزادی میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو اجتماعی آزادی میں عادلانہ قوانین کو قبول کرنے کی حیثیت ہے۔

یعنی جس طرح صحیح اور عادلانہ اجتماعی آزادی کو ہرج مرج سے محفوظ رکھتے ہیں،اسی طرح خالق وحدہ لاشریک کی عبادت روحانی آزادی کو بے قید ہونے کے خطرے سے بچانے کا باعث بنتی ہے۔

ایک آزادقوم

اس کو واضح طریقے سے یوں تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ وہ قوم ایک آزادملت نہیں جو اپنی آزادی کی خواہش پر جیسے چاہے عمل کرے اوراس بارے میں کسی قیدوشرط کو برداشت نہ کرے۔کیونکہ ایسی روش کا نتیجہ بے لگامی اور آزادی کی نابودی کی شکل میں برآمد ہوا

کرتا ہے۔ درحقیقت آزاد ملت اس کو کہا جاتا ہے جو آزادانہ فکر کرے، اپنے اجتماعی مصالح ومفاسد کو خوب اچھے طریقے سے سوچے اور ان میں توازن کرے۔ وہ اپنی زندگی کی تمام ضروریات کو تشخیص دے اور پھر رضا ورغبت کے ساتھ اپنی آزادی محدود کرنے کے لئے عادلانہ قوانین واضع کرے اور انہیں قوانین کے دائرے میں رہتے ہوئے آزادی کی اس خواہش کو عملی جامہ پہنائے۔

ایسی ملت نہ فقط حقیقی معنی میں آزاد ہے بلکہ ''جان ڈیوئی'' کے بقول آزادی بشر کا آغاز ہی تب ہوتا ہے جب وہ مصلحت کے مطابق قانون پر عمل کرتا اور ضرورت کے مطابق خود کو محدود کر دیتا ہے۔

بے لگامی

یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی آزادی کی طرح بھی اگر بے قید وشرط ہو جائے تو انسان ہرج ومرج سے دو چار ہو جاتا ہے اور یہ آزادی بھی غلامی اور بے بسی میں بدل جاتی ہے۔ یعنی انسان وحیوان کی پرستش، آفتاب وماہتاب کی عبادت۔ درخت اور بت کی پوجا اور ان کی مثل دیگر انواع کی پرستش جو عقل دشمنی پر مشتمل ہیں وہ گزشتہ ادوار میں ایک معمول بن گئی تھیں۔ بلکہ آجکل بھی اس دنیا جہان کے گوشہ وکنار میں کم وبیش ان کا وجود باقی ہے اور یہ صورت معنوی آزادی کے بے لگام ہونے کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ اسی طرح کی متعدد دیگر پرستشیں ہیں جو نئے دور اور متمدن دنیا میں رائج ہیں جو دور حاضر میں بشر کی اخلاقی پستی کا موجب بنی ہیں۔ ان میں خواہش پرستی۔ خود پرستی۔ جاہ پرستی۔ عہدہ پرستی۔ فرد پرستی۔ حزب پرستی۔ شہوت پرستی۔ زر پرستی۔ تعصب پرستی اور اس قسم کی متعدد کثیف پرستشیں شامل ہیں کہ جن سے موجودہ دنیا آلودہ ہو چکی ہے اور اس اخلاقی پستی کے بھنور میں گھر کر رہ گئی ہے تمام عالمی جنگوں یا عام حالات میں انسان نے جو غیر انسانی لچھن دکھائے ہیں یہ اسی اخلاقی انحطاط کا اثر اور آزادی معنوی کو بے لگام چھوڑ دینے کا نتیجہ ہیں۔

''لا الہ الا اللہ'' اسلام کا نعرہ آزادی ہے جو اپنے پہلے جزء ''لا الہ'' کے ساتھ تمام خود ساختہ معبودوں کو خدائی کے تخت سے نیچے اتار دیتا ہے۔ وہ عوام کو ان کی بندگی اور پرستش کے دائرے کے اندر محدود کر کے اس کی معنوی آزادی کو ہر قسم کے خطرے سے محفوظ کر دیتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ جس طرح اجتماعی آزادی اس قوم وملت کا حق ہے جس کے افراد عادلانہ قوانین کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں۔ اسی طرح معنوی آزادی بھی اس قوم کے لائق ہے جس کے افراد ایک خداوند برحق کی الوہیت پر صمیم قلب سے ایمان لاتے اور اس کی بندگی کے قوانین پر صحیح طریقے سے عمل کرتے ہیں۔

رہبر کا فریضہ

ایک اور نکتہ جس کی طرف توجہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح اجتماعی آزادی سے بہرہ ور ہونے کے لئے رہبری اور

ہدایت ضروری ہوتی ہے اور بغیر ایک رہبر کے ایک قوم اپنی آزادی سے صحیح طور پر مستفید نہیں ہوسکتی۔اسی طرح روحانی آزادی سے بہرہ ور ہونے کے لئے بھی ایک رہبر و رہنما کی احتیاج ہے اور اس رہبر کا فریضہ ہے کہ وہ ایک طرف عوام کو ان تمام اقسام شرک سے آگاہ کرے اور آزادی کی دشمن عبادتوں کی شناخت کرائے جو گوناگون صورتوں اور مختلف شکلوں میں ان کو لاحق ہوسکتی ہے اور ایک انسان ان کے دام میں پھنس سکتا ہے۔ چنانچہ وہ انہیں خبردار کرے کہ ان تمام اقسام شرک سے اپنا دامن بچا کر رکھیں اور خود کو ان پرستشوں سے آلودہ نہ ہونے دیں، تاکہ وہ ان کی آزادی کو ہر قسم کے انحراف وسقوط سے محفوظ رکھ سکے۔ پھر دوسری طرف سے اس رہبر کا فریضہ ہے کہ عوام کو خداوند یکتا ویگانہ کی عبادت و پرستش کے لئے دئے گئے مفصل ضابطے سے آگاہ کرے اور انہیں وہ تمام اوامر الٰہی پہنچائے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے بارے میں نازل فرمائے ہیں اور اس طرح وہ عبادت کو اپنے وسیع معانی میں ان کے سامنے واضح کرے۔ وہ انہیں بتائے کہ تمہیں اپنے تمام اخلاقی وعملی اور اجتماعی واقتصادی امور بلکہ زندگی کے تمام شعبہ جات میں اس خداوند عظیم کا مطیع بندہ بننا ہے اور ضروری ہے کہ تم سب بلا شرط وقید اس کے اطاعت گزار بندے بن جاؤ، کیونکہ اس طریقے سے ہی واقعی سعادت ونیک بختی کے حصول میں کامیابی ہوسکتی ہے۔ نیز اسی طرح پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان بھی تحقق پذیر ہوسکتا ہے کہ جس میں فرمایا:۔

قولو الا الہ الا اللہ تفلحوا "لا الہ الا اللہ کہو تاکہ فلاح پاؤ۔

معلوم ہوا کہ لا الہ الا اللہ کا کلمہ توحید تبھی الٰہی قلعہ ثابت ہوتا ہے جب اس کا ماننے والا اس تحریک کے رہبران اور اس کے پیشوایان کا صحیح پیروکار بن جاتا ہے۔ ہاں یہی وہ شرائط ہیں جن کی طرف حضرت امام علی رضا علیہ السلام نے نیشاپور والوں کو اپنی مشہور ومعروف حدیث میں متوجہ کیا اور فرمایا ''بشروطہا وانا من شروطہا'' یہ سب کچھ اپنے شرائط کے ساتھ ہوتا ہے اور میں ان میں سے ایک شرط ہوں۔

اس سلسلے میں اولین رہبر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدائے تعالیٰ کے برگزیدہ نبی ہیں اور آپ کے بعد ائمہ معصومین علیہم السلام ہیں کہ آنحضرتؐ نے لوگوں کو بحکم خدا ا ہستیوں کا تعارف کروایا۔ ان میں سے ایک رہبر خود امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام ہیں اور اسی لئے آپ نے فرمایا: ''والان من شروطہا'' میں بھی ان شرط میں سے ایک ہوں۔

ان رہبران کا وظیفہ خداوند کریم کی تعلیمات کی تبلیغ کرنا ہے کہ جن کا ایک حصہ ''قرآن مجید'' کے نام سے بطریق وحی حضرت نبی اکرمؐ پر نازل ہوا اور دوسرا حصہ ''سنت وحدیث'' کے نام سے پیغمبر اکرمؐ اور ائمہ علیہم السلام کی زبان سے صادر ہوا۔

بندہ ہوائے نفس

ان الٰہی رہبران کی نگاہ میں غلط بندگی اور آزادی کی مخالف پرستش فقط ان مشہود ومحسوس خداؤں اور ان ارضی وسماوی اشیاء کی پرستش تک محدود نہیں اور نہ ہی ان تک منحصر ہے۔ کیونکہ کئی افراد ایسے ہوسکتے ہیں جو نہ کسی بت یا درخت کی پرستش کرتے ہیں اور نہ ہی

بظاہر شرک میں گرفتار ہوتے ہیں۔لیکن باطن میں وہ اپنی ہوائے نفس ریا کاری اور دیگر نفسانی خواہشوں کے مکمل غلام وبلا قید وشرط مطیع بندے بن چکے ہوتے ہیں۔ان کے وجود کا اندرونی بت بڑے بڑے حیلہ ونیرنگ کے ساتھ ان سے معنوی آزادی سلب کر لیتا ہے اور غلامی کا طوق ان کی گردن میں ڈال دیتا ہے جبکہ خود انہیں اس کا احساس بھی نہیں ہو پاتا۔

عن ابی محمد علیہ السلام قال الا شراك فی الناس اخفی من دبیب النمل علی المسح الأسود فی اللیلة المظلمة[1]

حضرت امام علی حسن عسکری علیہ السلام نے فرمایا:۔لوگوں کے قلوب میں شرک کا نفوذ اس سے بھی زیادہ پنہاں اور مخفی طریقے سے ہوتا ہے جس طرح تاریک رات میں ایک سیاہ چیونٹی کسی سیاہ پتھر پر چل رہی ہو۔

یعنی جس طرح ایک انسان تاریک رات میں کسی سیاہ پتھر پر ایک سیاہ چیونٹی کے چلنے سے آگاہ نہیں ہوسکتا۔اسی طرح وہ اپنے شر سے بھی قطعاً آگاہ نہیں ہوسکتا، کیونکہ شرک تو اس سے بھی پنہاں اور مخفی طور پر حرکت کرتا ہے

لیکن اگر کوئی شخص اس تارے شب میں ایک روشن چراغ لے کر آئے جو اس مقام کو روشن کر دے تو حتماً وہ چراغ اس نظر نہ آنے والی چیونٹی کی حرکت کو آشکار کر دے گا۔اسی طرح دینی قوانین بھی ان رہبران خداوندی کے ہاتھ میں روشن اور پرنور چراغ کے مانند ہیں، پس ان کی پیروی مخفی شرک کی تمام اقسام کو آشکار کر دیتی ہے اس سے آدمی ہر قسم کی ظاہر و پوشیدہ غلامیوں سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

بندۂ شہوت

ایک سیاہ روز اور بدبخت جوان جب تمام انسانی اور اخلاقی مقررات کو پس پشت ڈال دیتا ہے اور اپنے غریزہ جنسی کو ہر ناجائز طریقے سے پورا کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے تو خیال کرتا ہے کہ وہ تمام قیود سے رہائی پا چکا ہے اور ایک آزاد انسان بن چکا ہے، اس لئے کہ اب وہ جو کام چاہے انجام دے سکتا ہے۔

لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے کہ اگر چہ وہ حیوانی اور غریزی طور پر آزاد ہے لیکن معنوی اور انسانی طور پر آزاد نہیں ہے۔

خدائی پیشوا اور الٰہی رہبر اس کی اس غلط روش کو شہوت کی بندگی وغلامی اور اپنے غریزہ کی باقید وشرط اندھی اطاعت کے علاوہ اور کچھ نہیں سمجھتے۔وہ کہتے ہیں۔یہ آزاد نہیں۔یہ اپنی ہوائے نفس کا غلام ہے کہ اس کی جنسی شہوت نے اس کی معنوی آزادی کو پامال اور اس کی انسانیت کو روند کر رکھ دیا ہے۔ہاں تو اسی شہوت نے اپنی عبودیت و بندگی کا پھندا اس کے گلے میں ڈال دیا اور اس کو اپنا بے اختیار قیدی بنالیا ہے، اب وہ جہاں چاہے اس کو لے جائے اور تباہ کر دے۔

---

[1] بحار الانوار ج ۱۶ قسمت اول ص ۱۵۸

قال علی علیه السلام: عبد الشهوة اذل من عبد الرق [1]

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:۔شہوت کا غلام ایک زرخرید غلام سے زیادہ ذلیل ہوتا ہے۔

وعنه علیه السلام: عبد الشهوة أسیر لا ینفك اسره۔ [2]

آپ ہی نے فرمایا:۔شہوت کا غلام ایک ایسا قیدی ہے جو اپنی قید سے ہرگز رہائی نہیں پا سکتا۔

تمام رہبران الٰہی کی اطاعت کرنا اوران کے اسلامی ضوابط کو جاری کرنا۔کلمۂ توحید کے شرائط میں سے ایک اہم ترین شرط ہے اوراس کے بغیر کامیابی ہرگز ممکن نہیں ہے۔وہی لوگ اللہ تعالیٰ کے محفوظ قلعہ میں وارد ہوتے اوراس کے عذاب سے محفوظ ہو سکتے ہیں جوان اوامرالٰہی کے عملاً پابند ہوتے ہیں اورخودکوتمام گناہوں اور برائیوں سے دوررکھتے ہیں۔

عن النبی صلی الله علیه وآله سلم قال: من قال لا اله الا الله مخلصا دخل الجنة واخلاصه بها ان تحجزه لا اله الا الله عما حرم الله [3]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:۔جوبھی اخلاص کے ساتھ کلمۂ توحید پڑھتا ہے وہ بہشت میں داخل ہوگا اور اخلاص سے مراد یہ ہے کہ ''لا الہ اللہ'' اس کوگناہ وحرام کے ارتکاب سے باز رکھے۔ایک دانا اوردلسوز باپ اپنے فرزند سے کہتا ہے:۔بیٹا محنت کروتا کہ یونیورسٹی میں داخلہ لینے میں کامیاب ہوجاؤ، کیونکہ یونیورسٹی ایک ایسا قلعہ ہے جوبھی اس میں داخل ہو،کہ جہالت کی مصیبتوں سے مامون ہوجا تا ہے۔کیاباپ کی اس نصیحت کا مطلب یہی ہے کہ اس کا فرزندفقط یونیورسٹی میں داخلہ لینے پر اکتفاء کرے اوراپنے طالب علمی کے فرائض پرعمل نہ کرے؟ کیا اس کے باپ کونصیحت میں درس پڑھنا یونیورسٹی کی تمام تعلیمی سرگرمیاں باقاعدہ حاضری دینا اورآموختہ پرمحنت کرناوغیرہ یہ سب امورشامل نہیں ہیں؟ جب وہ نوجوان یونیورسٹی کے امتحان میں کامیاب ہوکرداخلہ لے لےاورپھرطالب علمی کے فرائض میں کوتاہی کرے توکیا اسے یہ حق ہے کہ اب وہ باپ سے یوں کہنے لگے: میں نے آپ کے ارشاد کے مطابق مقابلے کے امتحان میں کامیابی حاصل کر لی ہے توبس اسی سے کامیاب ہوجاؤں گا اس سے آگے مجھے محنت اورکوشش کی ضرورت نہیں ہے۔سب جانتے ہیں کہ اس کی ان باتوں کا جواب نفی میں ہوگا۔

اسی طرح خداوندکریم نے بھی فرمایا ہے''لا الہ الا اللہ'' میرا قلعہ ہےاورجوبھی اس میں داخل ہو،وہ عذاب سے امان پالیتا ہے۔

رسول اکرمؐ نے بھی فرمایا''لا الہ الا اللہ'' کہوتو فلاح پا جاؤ گے۔لیکن ان تمام روایات کوتکمیل بخشنے اورانہیں تمام تک پہنچانے والاحضرت امام علی رضا علیہ السلام کا وہ ارشاد ہے کہ جس میں آپ نے فرمایا:۔''بشروطها وانا من شروطها''

اسلام نے''الا الہ الا اللہ'' کے کلمہ توحید کے ساتھ تمام خودساختہ معبودوں کی پرستش کا خاتمہ کر دیا اوراہل اسلام کوتمام

---

[1] فہرست غررص ۱۸۷

[2] غررالحکم ص ۴۹۹

[3] ثواب الاعمال ص ۲۰

بندگیوں سے رہائی دے دی۔اس نے اپنے پیروکاروں کوحکم دیا کہ ہرروزاپنی یومیہ نمازوں میں چند بار''ایاك نعبد'' کی تکرار کریں تا کہ یہ بات ان کے اعماق قلب میں نفوذ کر جائے۔یعنی یہ امران کے قلب وذہن میں راسخ ہو جائے کہ پرستش فقط ذات الٰہی کے لئے ہےاوراس کے علاوہ کوئی بھی بندگی وعبودیت کے لائق نہیں ہے۔

حقیقی آزادی

اس آسمانی تربیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان ایک واقعی آزادی اورحقیقی حریت سے ہمکنار ہو گئے اورانہوں نے جہاں کہیں بھی قدم رکھا توکسی بھی مادی چیز کے سامنے بندگی کے لئے سر جھکانے پرآمادہ نہ ہوئے۔یہاں تک کہ وہ زندگی کے سخت ترین حالات میں بھی مخلوق پرستی کی ذلت اورزبوں حالی کا رنگ اپنانے پرتیارنہ ہوئے، یہاں بطورنمونہ دومقامات کی طرف اشارہ کیا جا تا ہے۔

(ا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مکہ معظّمہ سے ہجرت سے قبل مشرکین نے مسلمانوں پر سخت دباؤ ڈال رکھا تھااوروہ ان پر نا قابل برداشت سختیاں کررہے تھے۔چنانچہ مسلمانوں کی ایک جماعت رسول اکرمؐ کی اجازت سے ملک حبشہ میں پناہ گزین ہوئی، تا کہ چندروز کے لئے ان مصیبتوں سے امان میں رہ سکیں۔

ادھرمشرکین نے عمارہ بن ولیداورعمرو بن عاص کوبیش بہا تحائف دے کرشاہ حبشہ کی طرف روانہ کیا، تا کہ وہ ان مسلمان مہاجرین کودوبارہ مکہ لانے کی کوشش کریں اورپھراس طرح ہم انہیں شکنجوں میں گرفتار کرنے میں کامیاب ہوجائیں۔

جب وہ دونوں حبشہ میں وارد ہوئے تو جوتحائف وہ اس ملک کے حکمرانوں اورمعززین کے لئے لائے تھے وہ ان میں تقسیم کئے نیزشاہ حبشہ کے لئے جوخصوصی تحفہ لائے تھے وہ اس کی خدمت میں پیش کیااوراس کے ساتھ ہی اس سے ان مہاجرین کی واپسی کی درخواست بھی کر دی۔شاہ حبشہ نجاشی جوایک فہمیدہ اوردانا شخص تھا۔اس نے کہا: میں بغیرتحقیق اورتفشیش کے ان مہاجرین کومشرکین مکہ کے حوالے کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوں۔یہ لوگ میرے ملک میں آئے ہیں اورانہوں نے مجھے دیگرلوگوں پرترجیح دی ہے۔اس لئے ضروری ہے کہ میں بذات خودان سے ملاقات کروں اوران باتوں کوبھی سنوں۔تا کہ میں ان کے طرز تفکر سے آگاہی پاؤں اور پھر اس بارے میں اپنی ایک رائے قائم کروں۔چنانچہ اس نےحکم دیا کےفلاں وقت معین پرمہاجرین کومیرے حضورلایا جائے۔

انتہائےخضوع

سجدہ کرنا اوراپنی پیشانی خاک پررکھنا۔اپنے مسجود کے سامنے سجدہ گزاروں کا سب سے بڑاخضوع ہوتا ہے۔اسلام جیسے حریت پرورمکتب نے کلمہ توحید کی بنیاد پراپنے پیروکاروں کوایک عزت نفس اورایک شخصیت عنایت فرمائی اورانہیں تعلیم دی ہے کہ سجدہ فقط اس ذات اقدس الٰہی کے سامنے کیا جا سکتا ہے جواس جہان کا خالق اور پوری کائنات کا حقیقی مالک ہے۔پس ایک مسلمان انسان کے لئے کسی بھی حالت میں جائزنہیں کہ وہ غیرخدا کوسجدہ کرے اوراپنے ایمان کے بیش قیمت موتی اوراپنی عزت نفس کے انمول جوہر کا

کسی بھی شئی کے بدلے سودا کرے۔

سئل ابو عبدا للہ علیہ السلام أیصلح لغیر اللہ تعالیٰ قال لا قیل فکیف أمر اللہ الملائکۃ بالسجود لآدم۔ فقال ان من سجد بأمر اللہ فقد سجد اللہ فکال سجودہ للہ اذ کان عن أمر اللہ تعالیٰ[1]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا! آیا غیر اللہ کے لئے سجدہ درست ہوسکتا ہے۔آپ نے فرمایا۔نہیں! پھر اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو حضرت آدم علیہ السلام کے لئے سجدہ کا حکم کیسے دیا؟ آپ نے جواب میں فرمایا: جوشخص اللہ کے حکم سے غیر خدا کو سجدہ کرتا ہے تو دراصل وہ خدا ہی کو سجدہ کرتا ہے۔لہٰذا یوں کہنا چاہئے کہ ملائکہ نے آدمؑ کو سجدہ کرتے ہوئے درحقیقت اللہ تعالیٰ کو سجدہ کیا تھا، کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت آدمؑ کو سجدہ کیا تھا۔

اس دور میں رواج تھا کہ جو کوئی بھی نجاشی کے حضور حاضر ہو،اس کے لئے ضروری تھا کہ نجاشی کو سجدہ کرے اور اسکے ذریعے اس کے سامنے اپنی بندگی اور تذلل کا اظہار کرے۔اب ان مہاجرین کے لئے سخت دشوار مرحلہ آ گیا تھا کہ اسلام کے مکتب آزادی کی رو نجاشی کو سجدہ کرنا کلمہ توحید اور یکتا پرستی کے اصول کے خلاف تھا۔ادھر اس کو سجدہ نہ کرنا اسے ناراض کرنے کا باعث بھی بن سکتا تھا اس کے نتیجے میں ممکن تھا کہ وہ ان کو ملک سے نکال باہر کرنے کا حکم دے دیتا۔پس مشرکین اپنے مقصد میں کامیاب ہوکر انتقام جوئی کے جذبے کے تحت انہیں دوبارہ مظالم کا شکار بناتے اور یہ لوگ ان کے روح فرسا شکنجوں میں پھنس جانے پر مجبور ہو جاتے۔ چنانچہ مہاجرین اس دوراہے پر آن پہنچے اور ان کی تصمیم گری کا سنگین امتحان آ گیا۔

لیکن ایمان۔خدا اور یکتا پرستی پر اعتقاد ان کے وجود میں اسقدر راسخ ہو چکا تھا کہ ان سب نے یہ ارادہ کرلیا کہ وہ نجاشی کو ہرگز سجدہ نہیں کریں گے اور پھر ان پر جو سختی بھی آئے گی اسے برداشت کرلیں گے۔حضرت جعفر طیار جو ان مہاجرین میں سے ایک تھے۔فرماتے ہیں جب ہم نجاشی کے دربار میں حاضر ہوئے تو سجدہ کیا،تب حاضرین نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

مالکم لا تسجدون للملک قلنا لا نسجد الا اللہ عزوجل[2]

وہ بولے! تمہیں کیا ہوا ہے کہ تم بادشاہ سلامت کو سجدہ نہیں کرتے؟ ہم نے جواب دیا: ہم اللہ عزوجل کے علاوہ کسی کو سجدہ نہیں کیا کرتے۔

(۲) روم کے دربار میں دحیہ کلبی کے ساتھ بھی انہیں مہاجرین حبشہ جیسی صورت حال میں پیش آئی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی عمر شریف کے اواخر میں دیگر ممالک کے زمامداران کو خطوط روانہ کئے اور انہیں مقدس دین اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تھی۔چنانچہ ان خطوط میں سے ہر ایک خط مسلمانوں میں سے ایک فرد کو دے کر ان حکمرانوں

---

[1] سفینۃ البحار ''سجد'' ص ۵۹۸

[2] سیرۃ حلبیہ ج ۱ ص ۳۷۸

کے پاس روانہ کیا تھا۔ان میں سے ایک خط روم کے بادشہ قیصر کو لکھا اور دحیہ کلبی کہ جو مکتب اسلام کا تربیت یافتہ،توحید و یکتا پرستی کا دل دادہ شخص تھا،اس کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے یہ فریضہ سونپا گیا کہ وہ یہ خط قیصر روم تک پہنچائے۔چنانچہ اس نے طویل سفر طے کیا تا آنکہ پائے تخت روم میں آن پہنچا۔

فقال قومه لدحية اذا رأيت الملك فاسجد له ثم لا ترفع رأسك حتى يأذن لك قال دحية لا افعل هذا ابدا ولا اسجد لغير الله[1]

قیصر کی قوم کے لوگوں نے حضرت دحیہ کلبی سے کہا کہ جب بادشاہ کے حضور جانو اس کے سامنے سجدہ میں گر جانا اور جب تک وہ اجازت نہ دیں اپنا سر نہ اٹھانا۔لیکن دحیہ کلبی (جو اس توحید دشمن بات سے نالاں ہو چکے تھے) انہوں نے کمال صراحت کے ساتھ جواب دیا کہ میں ہرگز ایسا کام نہیں کروں گا کیونکہ میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کے سامنے سجدہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔

ایمان وشامت

یہ شجاعت۔شہامت اور آزادی جو اسلام کے آسمانی مکتب جزو ہے،فقط مسلمانوں کو ہی نصیب ہوئی اور یہ خدا پر ایمان لانے اور اس کی لامحدود قدرت پر بھروسہ کرنے کا فطری نتیجہ ہے۔کلمۂ توحید پر اعتقاد رکھنا اور یکتا پرستی کو قبول کرنا عوام کے قلوب میں ایک ایسا عمیق انقلاب اور حیرت انگیز تبدیلی کرتا ہے کہ غلامی اور اسارت کی تمام زنجیریں ٹوٹ کر گر پڑتی ہیں اور غلامی کے تمام بندھن یکے بعد دیگر کھل کر نابود ہوتے چلے جاتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اہل اسلام خدائے یگانہ کی عبادت کے طفیل تمام بندگیوں کو پاؤں تلے روند کر انتہائی قلیل مدت میں آزادی کی بزرگ ترین نعمت کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے جو ایک انسان حقیقی کی شان کے لائق ہے۔

وظیفہ شناسی

یہاں دلچسپ بات یہ ہے کہ رسول اکرمؐ کے آئین میں آزادی کو اس قدر اعلیٰ وارفع طریقے سے سمویا گیا ہے کہ مکتب اسلام کے درجہ اول کے شاگردان اپنے خالق و مالک کی بندگی میں بھی حریت کے اس پہلو کو ملحوظ رکھتے رہے ہیں۔اسی لئے تو وہ اپنے پروردگار کی عبادت بھی شکر گزاری اور وظیفہ شناسی کے جذبے سے کرتے ہیں کہ جو انسانیت اور آزادی ہی کی عظیم نشانی ہے۔

عن الحسين عليه السلام: ان قوماً عبدوا الله رغبة فتلك عبادة التجار، وان قوما عبدو الله رهبة فتلك عبادة العبيد وان قوماً عبدو الله شكراً فتلك عبادة الأحرار وهي افضل العبادة[2]

---

[1] سیرۃ حلبیہ ج ۳ ص ۲۷۲

[2] تحف العقول ص ۲۴۶

حضرت امام حسین علیہ السلام فرماتے ہیں: ایک گروہ خدا تعالیٰ کی عبادت اس جذبے سے کرتا ہے کہ وہ ہمیں اپنی لامحدود نعمات عنایت فرمائے گا اور ہمیں بہشت نصیب ہوگی ۔ یہ تاجروں اور سوداگروں والی عبادت ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو اپنے اللہ کی عبادت اس کی شکر گزاری اور اپنے انسانی فریضے کی ادائیگی کے جذبے سے کرتے ہیں، یہ آزاد افراد کی عبادت ہے اور ایسی ہی عبادت تمام عبادات سے افضل و برتر درجہ رکھتی ہے۔

قال علی بن الحسین علیہ السلام: انی لا کرہ ان اعبد اللہ لا غرض لی الا ثوابہ، فأکون کالعبد الطمع المطیع ان طمع عمل والا لم یعمل وا کرہ ا اعبدہ الا لخوف عقابہ فأکون کالعبد السوء ان لم یخف لم یعمل، قیل فلم تعبدہ قال لما ھو اھلہ بأیادیہ علی وانعامہ۔ [۱]

امام زین العابدین علیہ السلام نے فرمایا:

مجھے یہ ناپسند ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کروں جبکہ میری غرض اس کے ثواب کے حصول کے علاوہ اور کچھ نہ ہو۔ کیونکہ اس صورت میں میری مثال اس لالچی فرماں بردار غلام کی سی ہوگی، جو طمع کے تحت کام کرتا ہے۔ اور طمع نہیں ہوتی تو کام نہیں کرتا۔ اسیطر ح مجھے یہ بھی پسند نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت فقط اس کے عذاب سے خوف کھاتے ہوئے کروں کہ اس صورت حال میں اس بدکار غلام کی طرح ہوں گا جو بغیر خائف ہونے کے اطاعت نہیں کرتا۔ تب آپ سے پوچھا گیا پھر آپ کس بنیاد پر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہو؟ آپ نے فرمایا۔ اس خالق کی ان نعمات اور احسانات کی وجہ سے جو اس نے مجھ پر فرمائے ہیں، ان کی وجہ سے وہ اس لائق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔

اسلام اور آزادی

خلاصہ یہ کہ مقدس اسلامی آئین آزادی انسان کی بنیاد پر استوار ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزاد خلق فرمایا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کو انسان کلمۂ توحید کے سائے میں آزاد رہے اور آزاد زندگی بسر کرے۔ اس پر لازم ہے کہ وہ اپنی آزادی کو لیٹروں اور چوروں کی دستبرد سے محفوظ رکھے۔ وہ بیدا اور ہوشیار رہے اور یہ موقع نہ دے کہ ہوائے نفس یا دیگر اندرونی معبود یا خدائی کے جھوٹے مدعی اودوسرے خودساختہ خدا اس سے یہ آزادی سلب کرلیں اور اسے اپنا غلام بنانے میں کامیاب ہوجائیں۔

واکرم نفسک عن کل دنیة وان ساقتک الی الرغائب، فانک لن تعتاض من تبذل من نفسک عوضا ولا تکن عبد غیرک وقد جعلک اللہ حرا [۲]

امام علی مرتضیٰ علیہ السلام اپنے فرزند امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے نام خط میں تحریر فرماتے ہیں: اپنے نفس کی عزت کو ہر پستی

---

[۱] مجموعہ ورام ج ۲ ص ۱۰۸

[۲] نہج البلاغہ مکتوب ۳۱

سے محفوظ رکھو، اگرچہ وہ پستی تمہارے بہت سے مقاصد اور بہت سی تمناؤں کے حصول کا باعث ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ ان کے عوض اپنی عزت وشرافت کا سرمایہ ہاتھ سے دینا ایسی قیمتی چیز کا لٹانا ہے جس کا بدل پھر کبھی تمہیں حاصل نہیں ہو سکے گا۔ نیز کسی اور کا غلام ہرگز نہ بننا کہ خداوند تعالیٰ نے مجھے آزاد پیدا کیا ہے۔

غیر خدا کی بندگی سے آزادی

آیت الکرسی کا آغاز کلمۂ توحید "اللہ لا الہ الاھو" سے ہوا ہے۔ قرآن شریف میں کلمۂ توحید بار بار آیا ہے اور ہر جگہ اس مقدس کلمہ کا مقصد بشر کو خودساختہ معبودوں سے آزاد کرنا اور ایک ذات اقدس لم یزل ولا یزال کی عبادت تک محدود کر دینا ہے۔

الٓمّٓ ﴿۱﴾ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ﴿۲﴾ [1]

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ [2]

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ [3]

وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ [4]

آیت الکرسی کو ان تمام مقامات کی نسبت ایک خصوصی اہمیت حاصل ہے کہ اس میں کلمۂ توحید کے بعد متعدد ایسے صفات بیان کئے گئے ہیں جو خداوند عالم سے مختص اور حقیقی "الہٰ" کے لائق ہیں۔ پھر چند ایک ایسے صفات کی طرف اشارہ ہوا ہے جو عجز وضعف کی علامت ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات کو ان سے مبراء ومنزہ قرار دیا ہے۔ "اللہ" آیت الکرسی کا آغاز اس عظیم نام سے ہوا ہے، گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ "اللہ ھو الا لہ" یعنی فقط اللہ تعالیٰ کی ذات برحق ہی اصلی معبود اور پرستش کے لائق ہے۔

"لا الہ الا ھو" اس ذات بزرگ وبرتر کے علاوہ کوئی ذات ایسی نہیں ہے جو الوہیت کے قابل اور بندگی وپرستش کے لائق ہو۔ اس جہان ہستی کی کوئی شئی ایسی نہیں اور نہ ہی ان ارضی وسماوی موجودات میں کہ جو وجود بشر کے علاوہ خارج میں ہیں۔ نہ کوئی موجود اس قابل ہے، نہ ہی انسانی وجود کے اندر پنہاں کوئی شئی ایسی ہے کہ جسے معبود قرار دیا جا سکے۔ خواہ ہوائے نفس ہو یا دیگر باطنی قویٰ اور تمنائیں ہوں، بہرحال سوائے اللہ کے کوئی بھی قابل عبادت نہیں اور نہ ہو سکتا ہے۔

---

[1] سورۂ آل عمران آیت ۲

[2] سورۂ آل عمران آیت ۱۸

[3] سورۂ نساء آیت ۸۷

[4] سورۂ قصص آیت ۷۰

دوسری تقریر

حیات وزندگی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے:

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ [1]

یہ آیت الکرسی ہے جس میں حق تعالیٰ کے لئے سب سے پہلی صفت اور معبود حقیقی کے اوصاف کمال میں سے جو اولین کمال بیان کیا گیا۔ وہ حیات ہے۔ یعنی وہ ہستی جو معبود حقیقی اور بندگی و پرستش کے لائق ہے وہ زندہ اور حی ہے۔ وہ ان خود ساختہ معبودوں مثلاً بت۔ آگ۔ سورج۔ چاند وغیرہ کی طرح جامد اور مردہ نہیں ہے۔

زندگی ایک ناشناختہ حقیقت

زندگی ایک ناشناختہ حقیقت ہے اور دیگر بہت سے ناشناختہ حقائق کی طرح ماضی سے حال تک دانش ور انسانوں کے لئے نامعلوم رہی ہے۔ بلکہ ابھی تک وہ اس کے راز سے ناواقف ہیں اور کسی کو معلوم نہیں کہ یہ کس طرح ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ چند بے جان طبیعی عناصر اور معدنی نمکیات کو ایک مخصوص وزن اور خاص حساب کے مطابق اس دنیا کے خزائن طبیعت میں سے لے لیتا ہے اور پھر قانون حیات کے مطابق انہیں موجودات میں تبدیل کر کے انہیں تحرک حیات عطا کر دیتا ہے اور انہیں قسم قسم کے افعال انجام دینے کی صلاحیت دے دیتا ہے۔

قدرت تغذیہ

کلوروفل والے پودوں کی ہیت ترکیبی میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ ایسے تمام اجسام مثلاً پانی۔ معدنی۔ نمکیات، کاربن ڈائی آکسائیڈ اور آکسیجن وغیرہ جو ایک سادہ قسم کی چیزیں ہوتی ہیں، اس طرح کہ وہ ان کو ایسے جسم میں تبدیل کر سکتے ہیں جو ایسے مواد کی شبیہ ہوتا ہے جس سے وہ پودے خود تشکیل دیئے گئے ہیں اور پھر وہ ان کو اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں۔ یہ کام چند ایک متوارت تبدیلیوں سے انجام پذیر ہوتا ہے اور ان ترکیبی تغیرات کے بعد وہ تیار شدہ مواد مخصوص مقامات پر قرار پاتا ہے۔ اس کے بعد وہ پودوں

---

[1] سورۂ بقرہ آیت ۲۵۵

کے ریشوں تک پہنچتا ہے پھر وہ ان کی بناوٹ کا حصہ بنتا ہے اور بالآخران کے جسم کا حصہ بن جاتا ہے۔[1]

ایک زندہ جسم کے اندر اپنی خاص صورتوں میں ہزاروں لاکھوں مرتبہ کیمیاوی عمل انجام پاتے ہیں اور مجموعی طور پر متابلیسم کرتے رہتے ہیں۔ان تمام کیمیاوی عملیات میں نہ فقط اعلیٰ درجے کی زمانی اور مکانی ہم آہنگی ہوتی ہے اور وہ اس نوسازی کے عمل میں باہم مربوط رہتے اور اجتماعی طور پر کام کرتے ہیں، بلکہ یہ سارا عمل ایسے منظم طریقوں کے ساتھ انجام پذیر ہوتا ہے کہ پورے زندہ جسم کی حفاظت اور تعمیر ہوتی رہتی ہے اور وہ اپنے کمال کی طرف بڑھنے کی ہدایت پاتا رہتا ہے[2]۔

موت اور زندگی

زندگی کی طرح موت بھی ایک حیرت انگیز حقیقت ہے،اس جہان کی تمام زندہ موجودات۔وہ نباتات ہوں یا حیوانات۔۔ وہ ابدی زندگی کی مالک نہیں اور اس نظام آفرینش میں عناصر کے باہمی تفاوت کے تحت ہر زندہ وجود اپنی ایک معین طبیعی عمر لے کر آتا ہے۔ چنانچہ جوں ہی اس زندگی کا دورہ مکمل ہوتا ہے،اس کی طبیعی موت کا وقت آجاتا ہے اور اس وقت یہ زندہ وجود مر جاتا ہے۔پس اب اس کے طبیعی عناصر اور اس کے جسم کو تشکیل دینے والے تمام مواد کتاب خلقت کے مقرر کردہ مخصوص نظام کے مطابق تحلیل ہونے لگتے ہیں اور پھر سے خزائن طبیعت میں بے جان مواد کی شکل میں شامل ہوجاتے ہیں۔

یہ مسلسل تبدیلی اور پے در پے تغیر کہ جو قانون موت وحیات کا نتیجہ ہے،قرآن مجید اس کو اللہ تعالیٰ کی حکیمانہ آیات میں ایک آیت قرار دیتا ہے اور اس عمل کو خداوند قادر وتوانا سے منسوب کرتا ہے۔

قرآن کہتا ہے:۔

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ[3]

یہ اس جہان کا عظیم خالق ہے جو مسلسل زندہ موجودات کو بے جان عناصر میں سے ظاہر کررہا ہے اور ان زندہ موجودات کو بے جان عناصر کی شکل میں تبدیل کرتا رہتا ہے۔

عن علی علیه السلام: واعلم انمالك الموت هو ما لك الحياة وان الخالق هو المعيت[4]

حضرت علی علیہ السلام: اپنے فرزند امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے نام ایک خط میں فرماتے ہیں۔

---

[1] چہ میدانم؟ علم نباتات ص ۳۳

[2] حیات طبیعت ومنشاء تکامل آں ص ۶۱

[3] سورۂ روم آیت ۱۹

[4] نہج البلاغہ مکتوب ۳۱

اے میرے پیارے بیٹے:۔ جان لو کہ اس عالم میں موت کا مالک اور اس کا فرماں روا وہی ہے جو زندگی کا مالک ہے، وہی جس نے پیدا کیا ہے وہی موت دینے والا ہے۔یعنی اس عالم کے مبداء دو نہیں (ایک ہے)

مسئلہ حیات جو اس عالم طبیعت کے اہم ترین مسائل میں سے ہے، گزشتہ ادوار سے آج تک ہمیشہ دانشوروں اور مفکرین کے ہاں غور وخوض کا مرکز رہا ہے اور یہ لوگ مختلف زاویوں سے اس کا مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ ان محققین نے اس کی کئی ایک علامات اور نشانیاں بھی ذکر کی ہیں اور پھر مفسرین وشارحین نے ان علامات کی روشنی میں حیات پروردگار ''اللہ تعالیٰ کی زندگی'' کے مفہوم کے بارے میں بہت گفتگو کی ہے۔

حیات مادی نقطۂ نگاہ سے

وہ اس تلاش وجستجو میں مصروف رہے کہ زندگی کا وہ کون سا معنی ہے جو ذات اقدس الٰہی کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔ مادی نقطۂ نگاہ سے زندگی کی تحقیق کرنے والوں اور اس کے طبیعی پہلو کا مشاہدہ کرنے والوں کا کہنا ہے: زندگی اس توانائی کو کہتے ہیں جس کے نتیجے میں ایک زندہ موجود غذا کھاتا ہے، ہضم کرتا ہے، جذب کرتا ہے اور خارج کرتا ہے اور خلئے بناتا ہے تاکہ ایک طرف سے وہ اس کے اندر سے تحلیل ہونے والے حصے کا بدل بن سکے اور دوسری طرف سے اس زندہ موجود کے رشد وترقی کا موجب بنے۔

''انیجلز کہتا ہے: زندگی انڈے کی سفیدی کی طرح کا ایک وجود ہے، اس مواد کا بنیادی خاصہ یہ ہوتا ہے کہ وہ غذائی جذب ودفع کے وسیلے سے پیدا ہونے والی متواتر کیمیائی تراکیب کے ذریعے سے خود سازی کرتا ہے''[1]

عالم طبیعت کے زندہ اجسام یعنی نباتات۔ حیوانات اور انسان میں زندگی کی یہی علامات قدر مشترک ہیں۔لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حیات کو اس وضاحت کے ذریعے ظاہر نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اس قسم کی تعبیر سے حیات الٰہی کی تشریح ہوسکتی ہے۔ کیونکہ وہ ذات الٰہی جسم اور تمام جسمانی نقائص سے منزہ مبراء ہے تو حتماً اس جسمانی زندگی کی علامات اس میں موجود نہیں ہوسکتی ہیں۔

زندگی معنوی نقطہ نظر سے

بعض محققین نے زندگی کی معنوی نقطۂ نظر سے تفسیر کی اور کہا ہے کہ حیات ایک ایسی واقعیت ہے جو بھی موجود اس کو پالیتا ہے وہ علم ادراک اور قدرت کا حامل بن جاتا ہے

الحیی من کان علی صفة لا یستحیل معها ان یکون قادراً عالما ۔[2]

---

[1] حیات طبیعت ومنشاء تکامل آں ص ۶۳

[2] تفسیر مجمع البیان ج ۱۔ ۲ ص ۳۶۱

زندہ وہ ہوتا ہے جوایسی صفت پر ہو کہ اسکے لئے قادر و عالم بننا محال نہ ہو۔

فخر الدین رازی کہتے ہیں:۔

لقائل ان یقول لما کان معنی الحیی ھوا الذی یصح ان یعلم ویقدر وھذا القدر حاصل لجمیع الحیوانات فکیف یحسن ان یمدح اللہ نفسہ بصفۃ یشار کھا فیھا اخس الحیوانات[1]

یہاں ایک معترض کے لئے گنجائش ہے کہ وہ یہ سوال کرلے کہ جب زندگی کا معنی یہ ہے کہ ایک زندہ وجود وہ ہوتا ہے جس میں علم وقدرت کی صلاحیت موجود ہو،اس معیار پر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ امر حیوانات کی تمام اقسام میں موجودنظر آتا ہے۔اب یہ کیسے مناسب ہے کہ خداوند تعالی اپنی تعریف ایک ایسی صفت کے ساتھ کرے کہ حیوانات میں سے ایک پست ترین حیوان بھی اس صفت میں اس کے ساتھ شریک اور سہیم ہے۔

پس نبات۔حیوان اورانسان کی زندگی کی حقیقت بھی اس عالم طبیعت کی دیگر بہت سی اشیاء کے حقائق کی طرح ابھی تک ناشناختہ ہے۔ ماضی وحال کے محققین ومفکرین میں سے کوئی بھی ابھی تک زندگی کی حقیقت کی نقاب کشائی پر قادر نہیں ہوا اور نہ ہی حیات کی گہرائی تک پہنچنے میں کامیاب ہوا ہے، یہ راز بھی تک راز ہی ہے اورکوئی بھی اس سے پردہ نہیں ہٹا سکا ہے۔

زندگی کی علامات

طبیعی نقطۂ نظر سے زندگی تغذیہ اور ہضم وجذب کا نام ہے اور معنوی نقطۂ نگاہ سے علم وقدرت کی صلاحیت حاصل کرنے سے عبارت ہے۔ یہ اس جہان طبیعی کی زندگی کی علامات اوراس کے آثار کی تعبیریں تو قرار پاسکتی ہیں لیکن انہیں خودزندگی کی حقیقت کی تفسیر قرار نہیں دیا جاسکتا۔اس کی مثال ہے جیسے کوئی شخص ''بجلی'' کی تعریف وتفسیر میں یوں کہے کہ وہ ایک ایسی طاقت ہے جو بلب کو روشن کرتی ہے،لاؤڈ سپیکر میں آواز پیدا کرتی ہے،استری کوگرم کرتی ہے اور کارخانوں میں مشینیں چلا دیتی ہے۔اس طرح واضح ہے کہ ان تعبیرات کوبجلی کی حقیقت کی تفسیر قرار نہیں دیا جاسکتا،یہ توبجلی کے آثار ونتائج کا بیان ہے اور خود بجلی کی حقیقت کا بیان ہے۔لہٰذا اس کی حقیقت تو اسی طرح ناشناختہ ہی رہ جاتی ہے۔

انسانی ادراک کی ناتوانی

وہ انسان جو کانٹے دار جھاڑی یا ایک ناچیز سے کیڑے کی زندگی کی حقیقت کے ادراک سے عاجز ہے اور جوخود اپنی زندگی اور دیگر ایسے موجودات کی زندگی حقیقت تک پہنچنے سے بھی قاصر ہے جو اس کرۂ ارض میں ہمیشہ اس کے سامنے موجود ہیں اور ان کے

[1] تفسیر کبیر ج ۲ ص ۴۶۶

ساتھ اس کا رابطہ بھی قائم ہے۔پس بدیہی ہے کہ یہ انسان کبھی اس امر پر قادر نہیں ہوسکتا کہ وہ اس کائنات کے خالق خداوند بزرگ و برتر کی حیات کی حقیقت پر آگاہی حاصل کر سکے۔لہٰذا اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں کہ ہم حیات الٰہی کے بارے میں بحث کرنے کی بجائے گفتگو کا رخ قوانین کی طرف موڑ دیں اور مسئلہ حیات پر عملی اور دینی جہات سے بحث کریں،امید ہے کہ یہ بحث عوام کے لئے مفید رہے گی۔

اجرام فلکی میں زندگی

اول:۔آج کی ترقی یافتہ دنیا میں بہت سے دانش ور ایسے ہیں جن کا نظریہ ہے کہ زندگی کی پیدائش فقط اسی کرۂ زمین تک منحصر نہیں، بلکہ دیگر اجرام فلکی میں بھی زندگی کا وجود ہے۔

قرآن شریف اور دین اسلام کے اولیاء کرام نے آج سے چودہ سو سال قبل کی تاریک دنیا میں وحی و الہام کے نورانی پرتو کے ذریعے اس راز سے پردہ اٹھایا اور اپنے پیروکاروں کو آگاہ فرمایا تھا کہ دیگر اجرام فلکی میں زندہ موجودات پائے جاتے ہیں۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ۭ [۱]

اور خداوند عالم کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنا اور ان زندہ متحرک موجودات کو پیدا کرنا جو اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین ہر دو میں پھیلا دیئے ہیں۔

اس آیت میں کلمہ ’’دابہ‘‘ سے مراد زندہ اور حرکت کرنے والے مادی اجسام ہیں۔۔ملائکہ اور ارواح پر ’’دابۃ‘‘ کا اطلاق نہیں ہوتا کیونکہ ان کی حیات روحانی ہے اور وہ جسم و مادہ سے عاری ہیں۔

عن أبي عبد الله عليه السلام قال: ان من وزاء عين شمسكم هذا رعين شمساً فيها خلق كثيرو ان من وراء قمر كم اربعين قمر فيها خلق كثير لا يدرون ان الله خلق آدم ام لم يخلفه [۲]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: تمہارے اس پر جوش چشمہ آفتاب کے علاوہ چالیس دیگر آفتاب بھی موجود ہیں کہ ان کے نظام ہائے شمسی میں کثیر مخلوق آباد ہے۔اسی طرح تمہارے اس چاند کے علاوہ چالیس دیگر چاند موجود ہیں اور ان کے کرہ جات میں بھی کثیر مخلوق موجود ہے اور وہ مخلوق اس امر کی خبر نہیں رکھتے کہ آیا خداوند عالم نے کرۂ زمین میں بشر کی تخلیق فرمائی ہے یا نہیں؟

ہماری کہکشاں میں تقریباً ایک سو پندرہ کروڑ ثابت ستارے شمار کئے گئے ہیں جن میں ایک قابل توجہ تعداد ہمارے سورج کی شبیہ نظر آتی ہے۔لہٰذا اس بات کی کوئی دلیل نہیں کہ ہم یہ اعتقاد رکھے رہیں کہ فقط ہمارا یہ کرۂ زمین ہی آباد ہے اور زندہ مخلوق کی آبادی

---

[۱] سورۂ شوریٰ آیت ۲۹

[۲] بحار الانوار ج ۱۴ ص ۸۱

فقط اسی میں منحصر ہے۔[1]

عن امیر المومنین علیه اسلام: انه قال هذه النجوم التی فی السماء مدائن مثل المدائن التی فی الارض[2]

تمدن اور کرات سماوی

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: آسمان کے ان ستاروں میں اس طرح شہر آباد ہیں جس طرح کرۂ زمین میں ہیں۔

اس روایت سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ اجرام فلکی میں یہ فقط زندہ موجودات پائی جاتی ہیں بلکہ وہاں عاقل اور متمدن مخلوق بھی اس روایت سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ اجرام فلکی میں نہ فقط زندہ موجودات پائی جاتی ہیں بلکہ وہاں عاقل اور متمدن مخلوق بھی موجود ہے۔ وہ لوگ اپنی زندگی کے لئے عاقلانہ انداز سے شہر بناتے ہیں اور انہوں نے اپنی حیات کی بنیاد تمدن اور شہرنشینی پر رکھی ہوئی ہے۔

دسمبر ۱۹۶۴ء میں روس کے عالمی شہرت یافتہ پچاس سائنس دانوں کا ایک اجلاس ستارہ شناسی کے رصد خانہ واقع (بورا کان) میں بلایا گیا۔ اس اجلاس میں ان روسی ماہرین میں سے ایک رکن ژوزف شمو یلو ویچ نے ایک نا قابل یقین ریوٹ پیش کی جس کا خلاصہ یہ ہے:

ہماری فضا میں کچھ ریڈیائی علامات نشر ہوتی ہیں اور ان سے ایسا نظر آتا ہے کہ کسی دوسری دنیا میں کوئی متمدن مخلوق آباد ہے جو دیگر کرہ جات کے عوام کی توجہ اپنی طرف جلب کرنا چاہتی ہے۔ اس کے دو سال بعد ریاست ہائے متحدہ امریکا سے ایک کتاب شائع ہوئی کہ جس کا نام "کائنات میں باہوش زندگی" ہے اور وہ پانصد صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب پر دو سائنس دانوں کی تصدیق موجود ہے۔ ان میں ایک ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر "کارل ساگان" اور دوسرے روسی پروفیسر "ژوزف شمو یلو ویچ" ہیں ادونوں ماہرین نے ایک دوسرے کو ابھی تک نہیں دیکھا اور صرف بذریعہ مراسلت ایک دوسرے سے رابطہ کرتے رہے ہیں۔

پھر اس موضوع پر ایک اور کتاب شائع ہوئی کہ جس کا نام "ہم اس جہان میں تنہا نہیں ہیں" اور یہ "والٹر سوسبوان" کی تالیف ہے۔ چنانچہ "ساگان" "شکلر وسکی" اور دیگر بہت سے ستارہ شناسوں اور ماہرین فلکیات کے نزدیک یہ امر مسلم ہے کہ کرۂ زمین کے باہر بھی تمدن موجود ہے، بلکہ اہل زمین کے تمدن سے بہت زیادہ ترقی یافتہ تمدن موجود ہے۔[3]

---

[1] دانستنی ہای جہان علم ص ۲۲۸

[2] مجمع البحرین مادہ کوکب

[3] دانستی ہای جہان علم ص ۲۲۷

کرۂ زمین میں قوانین حیات

دوم:۔اس کرۂ زمین میں زندگی ایسے متعین قوانین اور مقرر نظام پر قائم ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے حکیمانہ فیصلوں کے مطابق جاری فرمائے ہیں۔ چنانچہ وہ تمام زندہ موجودات جو ان قوانین کی بنیاد پر وجود میں آتے ہیں، وہی مخصوص ومیزات لے کر آتے ہیں جو اس کرۂ خاکی کے قانون حیات پر منطبق کئے گئے ہیں۔

ماہرین نے اس دنیا کے زندہ موجودات پر تحقیق کی تو وہ اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ اس کرۂ زمین میں طبیعی نقطۂ نگاہ سے زندگی کی علامات۔تغذیہ اور ہضم وجذب ہیں اور بالآخر اپنے جسم کے تحلیل ہوجانے والے اجزاء کا بدل تیار کرنا اور اس سے ایک زندہ موجود کے نشوونما اور رشد کی ضمانت دینا ہے۔تاہم معنوی نقطۂ نگاہ سے زندگی کی علامات علم وقدرت کی صلاحیت رکھنا اور اس کا اہل ہونا ہے۔

یاد رہے کہ اس کرۂ خاکی کے زندہ اجسام کی ان علامات کا مطلب یہ نہیں کہ جہاں کہیں جن شرائط وحالات میں کوئی زندہ موجود ملے تو ضروری ہے کہ اس میں بلاکم وکاست یہ صفات حتماً پائی جائیں۔ کیونکہ ہم نے واضح کیا ہے کہ یہ صفات وعلامات صرف اس کرۂ زمین کے قانون حیات کے تحت وجود میں آنے والے زندہ موجودات کے لئے ہیں۔لہٰذا کسی کو حق نہیں کہ وہ دعویٰ کرنے لگے کہ پوری کائنات میں ہر جگہ قانون حیات یکساں ہے اور ہر مقام پر کرۂ زمین کا دستور زندگی ہی زیر عمل ہوگا۔

اس سے بھی بڑھ کر تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اس زمین کے زندہ موجودات کی مختلف انواع کے قوانین حیات بھی باہمی طور پر واضح فرق رکھتے ہیں۔ چنانچہ ماہرین اس تحقیق میں کامیاب ہوگئے ہیں کہ کچھ جانور ایسے ہیں جو بعض حالات میں اپنی زندگی کی خود حفاظت کرتے ہیں اور اپنے ناقص اعضاء کی خود تکمیل کر لیتے ہیں۔ جبکہ انہیں حالات میں دیگر بہت سارے حیوانات مرجاتے ہیں یا اس ناقص عضو کے ساتھ باقی رہتے ہیں اور اس کی تکمیل نہیں کر سکتے ہیں۔

سرطان کی طرح کے بعض حیوانات ایسے ہیں کہ جب کبھی ان کا پنجہ یا کوئی عضو کٹ جائے تو اس سے مربوط خلئے فوراً عضہ کے مفقود ہونے کی اسے اطلاع دیتے ہیں اور اس کے جبران وتلافی میں مصروف ہوجاتے ہیں۔ پھر جوں ہی اس کم شدہ عضو کی تجدید کا کام مکمل ہوجاتا ہے تو وہ تولیدی خلئے از خود رک جاتے ہیں، گویا وہ سمجھ لیتے ہیں کہ اب ان کے کام کے اختتام کا وقت آگیا ہے۔ اسی طرح اسفنجی رنگ کا ایک حیوان جو میٹھے پانی میں زندگی بسر کرتا ہے اگر کوئی اسے درمیان سے دوحصوں میں تقسیم کر دے تو اسکا ہر حصہ خود بخود اپنی تکمیل میں مصروف ہوجاتا ہے اور بالآخر ایک فرد کامل بن جاتا ہے۔اسی طرح اگر آپ سرخ رنگ کے ایک کیڑے کا سر کاٹ دیں تو دوسرے دن وہ ایک اور سر بنالیتا ہے[1]۔

---

[1] رازآفرینش انساں ص ۸۵

مختلف انواع میں تفاوت

مختصر یہ کہ ہمارے اس جہان میں جس طرح نباتات کی زندگی کے شرائط حیوانات کے زندگی سے جدا گانہ ہیں یا جس طرح بری موکودات کی زندگی بحری موجودات سے متفادت ہے اسی طرح ممکن ہے کہ ہر کرۂ مسکونی کی زندگی کے قوانین دوسرے کرہ کے قوانین حیات سے جدا ہوں اور پھر وہ سب قوانین ہماری اس زمین کے قوانین حیات سے علیحدہ ہوں۔ نیز یہ تفاوت اس حد تک زیادہ ہو کر کرہ کے عاقل اور صاحب ادراک لوگ شاید اپنے طور پر ان شرائط میں زندگی کا وجود ہی ناممکن قرار دیتے ہوں اور یہ تصور کرتے ہوں اور یہ تصور کرتے ہوں کہ ان حالات کے علاوہ زندگی کا وجود نا قابل تسلیم ہے۔

(کارل) اور (ژوزف) اپنی کتاب میں لکھتے ہیں: اس نظام شمسی میں زمین کے سوا زندگی کا احتمال انتہائی ضعیف ہے، کیونکہ (مریخ) اور (زہرہ) سخت گرم ہیں اور (مشیری) اور (زحل) ایمونیک (AMMONIAC) اور میتھین (METHANE) گیسوں میں گھرے ہیں۔لیکن اگر ہم خود کو ان سیاروں میں کسی ایک کی مخلوق قرار دے دیں تو اب ہم زمین کے بارے کیا کہیں گے؟ پس بدیہی ہے کہ ایک مریخی ستارہ شناس جب دیکھے گا کہ ہماری زمین آکسیجن جیسی گیس میں گھری ہے تو چونکہ وہ اپنی نگاہ میں اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہے کہ ہمارا بدن اس آکسیجن گیس سے کس قدر سازگار رہتا ہے اس لئے وہ خیال کرے گا کہ اس زمین میں زندگی نا قابل تصور ہے۔"[1]

آباد کرات میں تکامل حیات

قوانین حیات کے باہمی تفاوت کے اس ممکنہ احتمال سے ایک اور مسئلہ قابل توجہ قرار پاتا ہے جو ان آباد کرات میں زندگی کے تکامل کے درجات کا باہمی تفاوت ہے۔ چنانچہ بعض ماہرین نے اپنے اپنے اندازوں اور علمی احتمالات کی بنیاد پر حیرت انگیز خیالات پیش کئے ہیں کہ اس کرۂ زمین کے موجودہ متمدن لوگوں کے لئے اس کا تصور بھی دشوار نظر آتا ہے۔

چند ایک محققین کا کہنا ہے: دیگر کروں کے احتمالی موجودات کے بارے میں ممکن ہے کہ وہ اپنی ترقی کی بنیاد پر اس وقت خالص توانائی کی شکل اختیار کر چکے ہوں۔ اگر ایسا ہے تو پھر ایسے موجودات کے جو خالص توانائی اور انرجی میں بدل جاتے ہیں ان کی قدرت و امکانات حد سے بڑھ جاتی ہے۔ ہمارے موجودہ زمینی شعور پر قیاس کرتے ہوئے ان کا شعور بھی نا قابل تصور اور وحشت انگیز ہوگا۔

---

[1] دانستنی ہای جہان علم ص ۲۲۸

زندگی بدون موت

امریکہ کے بابائے تحقیقات میزائیل (فون برون) کے اعتقاد کے مطابق ایسے موجودات جو انرجی اور مادہ پر تسلط پانے میں کامیاب ہو جائیں ان کے لئے ایسی زندگی پا لینا ممکن ہے جس کے بعد موت نہ ہو۔ البتہ تاریخ کے ان لمحات میں یہ زمینی انسان چونکہ کائنات کے متعلق بہت کم معلومات رکھتا ہے اور دیگر آسمانی کرات میں احتمالی زندگی کے متعلق بھی نہیں جانتا لہٰذا اس کے لئے ممکن نہیں کہ وہ دیگر کرات پائی جانے والی باشعور زندگی کے متعلق بتا سکے کہ وہ کس حد تک بلند ترین۔ ترقی یافتہ اور ہماری اپنی زندگی سے کتنے زیادہ شعور پر فائز ہیں۔ اس کے لئے فقط یہی ممکن ہے کہ اپنے ذہن کی تصوراتی اور تخیلاتی کائنات میں یہ خاکہ تیار کرے کہ اس قسم کی بالاتر زندگی رکھنے والی مخلوق کا وجود ہمارے اس ترقی یافتہ تمدن پر ایک بہت بڑی ضرب لگانے کا باعث بن سکتا ہے۔[۱]

قیامت میں قانون حیات

قانون حیات کے تفاوت اور اسی طرح درجات تکامل میں تفاوت کی بحث اور اسکا دیگر اجرام فلکی میں ثابت ہونا ایک قابل قبول عقلی احتمال تو ہے، لیکن جہاں تک اس کے واقعیت رکھنے اور تحقق پذیر ہونے کا تعلق ہے تو ابھی تک ہمیں اس بارے میں کوئی اطلاع نہیں ہے۔ کیونکہ انسان اپنی اس حیرت انگیز سائنسی ترقی اور علمی پیشرفت کے باوجود فلک کے اس عمق تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوسکا او دیگر مسکون کروں میں کارفرما قانون حیات پر مطلع نہیں ہوسکا۔ البتہ قرآن مجید اور اسلامی احادیث سے جو مجموعی نتیجہ سامنے آتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم قیامت کا قانون حیات اس کرۂ زمین کے قانون حیات سے بہت زیادہ متفاوت ہوگا۔ وہ فرق بعض اوقات اس قدر زیادہ نظر آیا ہے کہ اس کا کرۂ زمین کے مقررات زندگی پر قیاس کرنا بھی ممکن نظر نہیں آتا بطور نمونہ چند ایک موارد آپ کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں۔

۱۔ ہمارا یہ کرۂ ارض زمین ایک مردہ جرم ہے جسے پانی اور بے جان گیسوں نے گھیرا ہوا ہے۔ اس کے قانون حیات کے مطابق چند ایک معدنی نمکیات اور طبیعی مادے یکے بعد دیگرے تکامل حیات کے سفر میں قدم رکھتے ہیں اور بالآخر گیاہی یا حیوانی زندگی پاکر زندہ موجودات بنتے ہیں اور پھر چند روز زندہ رہنے کے بعد سوکھ سڑ کے مر جاتے ہیں۔ لیکن جہان آخرت، زمین قیامت اور اسکے سارے ماحول کی کیفیت اس سے جداگانہ ہے کہ وہ تکامل حیات رکھتے ہیں اور وہاں حیات و زندگی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۭ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝[۲]

---

[۱] روزنامہ کیہان شمارہ ۸۵۸۸

[۲] سورۂ عنکبوت آیت ۶۴

اگر لوگ آگاہی رکھتے تو جان لیتے کہ یہ دنیوی زندگی تو کھیل تماشا کے سوا کچھ نہیں اور آخرت ہی ایک ایسا جہان ہے جو سراسر حیات و زندگی ہے۔

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ۝٤ بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا ۝٥ [1]

قیامت کی زندہ زمین اس دن بولے گی اور اپنے اخبار خود بیان کرے گی کہ اسے تیرے رب نے وحی کی ہے اور اسے کام پر مامور فرمایا ہے۔

۲۔ ہماری دنیا کی اس زمین کا شکم گیا ہی خلیوں کی پرورش کا رحم ہے اور رحم مادر انسانی نطفے کی پرورش کا مقام ہے۔

لیکن قیامت میں قانون حیات بالکل تبدیل ہو جائے گا اور قیامت کی زمین ایک ایسا زندہ وجود رکھتی ہوگی جو انسان کے لئے رحم مادر کا کام کرے گا اور ایک بشر اس خاک کے شکم ہی سے نئی زندگی پالے گا۔

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ وَكَذَٰلِكَ تُخْرَجُونَ ۝١٩ [2]

خداوند قدیر وہ ہے جو اس کائنات کے مردہ مادوں سے زندہ موجودات کو ظاہر کرتا ہے اور زندہ اشیا کے پیکر سے مردہ مادے باہر نکالتا ہے۔ وہی وہ خدا ہے جو مردہ زمین کو زندگی بخش دیتا ہے اور اس کی خاک کے اندر سے زندہ پودے سر نکال لیتے ہیں'' اے لوگو بروز قیامت تم بھی اسی طرح خاک کے پیٹ سے نکال لئے جاؤ گے۔

۳ اس دنیا میں موجودات کی نشوونما اور رشد و تکامل تدریجی ہے اور اس کی بنیاد خلیوں کی تقسیم کے قانون پر قائم ہے۔ ایک انسان کا نطفہ رحم مادر میں نو ماہ تک رہنے کے بعد ایک ضعیف نوزاد کی شکل میں باہر آتا ہے اور پھر کئی سال کے بعد ایک قوی اور توانا جوان کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن جہان آخرت میں یہ قانون ٹوٹ جائے گا اور آدمی انتہائی قلیل مدت میں زمین کے اندر ہی اندر بن سنور کر ایک سالم انسان کی شکل میں خاک سے باہر نکل آئے گا۔

فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَاحِدَةٌ ۝١٣ فَإِذَا هُم بِالسَّاهِرَةِ ۝١٤ [3]

ایک آگاہ زمین

پس ایک مرتبہ سخت دھاڑنے والی صدا بلند ہوگی کہ ناگاہ انسان شکم خاک سے نکل کھڑے ہوں گے اور خود کو ایک ایسی زمین پر پائیں گے جو بیدار اور آگاہ ہے۔

---

[1] سورۂ الزال آیت ۴۔۵

[2] سورۂ روم آیت ۱۹

[3] سورۂ نازعات آیت ۱۳۔۱۴

۴۔ کرۂ زمین میں قانون حیات کی تشکیل قانون موت کے مقابلے میں ہوئی ہے۔ایک زندہ شیئی کی زندگی کا آغاز ایک نقطے سے ہوتا ہے جو تدریجاً تکامل پاتا ہے وہ طبیعی قدرت وتوانائی کے اوج تک پہنچ جاتا ہے اس کے بعد وہ ضعف وناتوانی کا شکار ہونے لگتا ہے اور رفتہ رفتہ کمزور و بوسیدہ ہونے لگتا ہے تا آنکہ موت کی آغوش میں سو جاتا ہے۔

لیکن جہان قیامت کی زندگی کے برعکس پائیدار اور ابدی ہے، وہاں ناتوانی، پیری اور موت کا کوئی وجود نہیں اور ایک زندہ انسان مسلسل اور دائمی طور پر حیات وتوانائی کی نعمت سے بہرہ ور رہتا ہے۔

لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰی [۱]

''اہل بہشت وہاں ایک کامل پر امن زندگی پائیں گے'' اور اس پہلی دنیوی موت کے بعد پھر کبھی موت کا ذائقہ نہ چکھیں گے۔

دائمی زندگی اور لذت والم

۵۔ ہمارا اس جہان میں ایک زندہ وجود غذا کھاتا ہے، اس سے لذت اٹھاتا ہے اور اپنی توانائی میں اضافہ کرتا ہے۔اس سے اس کے بدن میں نئے خلئے وجود میں آتے ہیں، تاکہ ایک طرف وہ ان سے نشو ونما اور رشد وتکامل پانے میں کامیاب ہو تو دوسری طرف ان مردہ خلیوں کی جگہ پر ہوتی ہے جو اس لمبی زندگی میں موت کا شکار ہوتے رہتے ہیں لیکن قیمت کا تغذیہ مردہ خلیوں کی کمی کو پورا کرنے اور رشد وتکامل کے لئے نہیں ہوگا، کیونکہ وہاں تو موت کا نام ہی نہیں لہٰذا خلئے کی موت کا بھی کوئی مذکور نہیں ہے۔ہاں جہاں تک پاکباز افراد کے لئے مناسب غذا سے لذت اٹھانے اور بدکار افراد ہونے کے لئے عذاب سے آور اور درد انگیز غذاؤں سے تکلیف اٹھانے کا تعلق ہے تو وہاں یہ پہلو بھی محفوظ ہے اور لوگ ان سے لذت اور الم اٹھائیں گے۔

دنیاوی زندگی اور علم وقدرت

۶۔ ہماری اس دنیا میں زندگی علم وقدرت کی قابلیت پیدا کرنے کا بنیادی سبب ہے، یعنی دنیا کی زندگی ایک زندہ کے لئے عالم وقادر بننے کا امکان پیدا کرتی ہے۔پس ناممکن ہے کہ اس کے بغیر کوئی علم وقدرت حاصل کر سکے، علماء اسی امکان کو ''لا یستحیل'' یا ''یصح'' کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

الحی من کال علی صفة لا یستحیل معها ان یکون قادرا عالما [۲]

الحی هو الذی یصح ان یعلم ویقدر [۳]

---

[۱] سورۂ دخان آیت ۵۶

[۲] تفسیر مجمع البیان ج۱ ص ۳۶۱

[۳] تفسیر کبیر ج ۲ ص ۴۶۶

ان دونوں عبارتوں کا مطلب یہ ہے کہ ایک زندہ وجود کے لئے عالم وقادر بننا محال نہیں بلکہ علم وقدرت کا حصول اس کے لئے صحیح یعنی ممکن اور قابل تحقق ہوتا ہے۔لیکن عالم قیامت میں زندگی اور علم وقدرت ایک دوسرے کو لازم ہیں۔وہاں کی زمین زندہ ہے اور اپنے اخبار کو بیان کرتی ہے لوگوں کی آنکھوں سے پردے اٹھ چکے ہوتے ہیں پوشیدہ حقائق آشکار ہو جاتے ہیں۔خود انسان کے اپنے اعضاء اور جہان قیامت کے دیگر موجودات ادراک وگویائی پر قادر ہو جاتے ہیں، ہاں یہ سب امور قرآن شریف کی آیات سے مستفاد ہوتے ہیں۔

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ﴿٤﴾ بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا ﴿٥﴾ [1]

لَقَدْ كُنتَ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَٰذَا فَكَشَفْنَا عَنكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ ﴿٢٢﴾ [2] ؏

الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٦٥﴾ [3] ؏

وَقَالُوا لِجُلُودِهِمْ لِمَ شَهِدتُّمْ عَلَيْنَا ۖ قَالُوا أَنطَقَنَا اللَّهُ الَّذِي أَنطَقَ كُلَّ شَيْءٍ [4]

اس دن زمین اپنے اخبار بیان کرے گی کہ تیرے رب نے اسے وحی کی ہے۔

تحقیق تو اس سے غافل تھا۔پس ہم نے تجھ سے تیرے پردوں کو دور کر دیا ہے۔لہٰذا اب تیری آنکھ خوب تیز ہو چکی ہے۔

آج کے دن ہم ان کے منہ پر مہر لگا دین گے اور ان کے ہاتھ ہم سے گفتگو کریں گے اور ان کے پاؤں ان کی تمام کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔

اور وہ اپنے چمڑوں سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟ تو چمڑے بول کر کہیں گے ہمیں اس اللہ تعالیٰ نے قوت گویائی عنایت فرمائی جو ہر شئی کو قوت گویائی دیتا ہے۔

آخرت میں علم وقدرت کی ضرورت

اگرچہ قرآن کریم نے قیامت کے زندہ موجودات کے بارے میں توضیحات فرمائی ہیں،لیکن اگر ہم علم وقدرت کے لحاظ سے دنیوی زندگی کی علامات کو اخروی زندگی کے ساتھ جانچنے کی کوشش کریں تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ دنیوی زندگی سے اس زندہ موجود کو علم وقدرت کے حصول کا امکان حاصل ہو جاتا ہے،لیکن اخروی زندگی ملنے سے اس زندہ موجود کے لئے علم وقدرت ضروری اور لازمی

---

[1] سورۂ الزال آیت ۴۔۵

[2] سورۂ ق آیت ۲۲

[3] سورۂ یٰس آیت ۶۵

[4] سورۂ حم سجدہ آیت ۲۱

ہو جاتا ہے، یعنی آخرت میں ایک موجود حتماً عالم اور قادر ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ قیامت کا قانون حیات دنیا کے قانون حیات سے متفاوت ہے، ہاں تو کہا جا سکتا ہے کہ عین ممکن ہے کہ دیگر اجرام فلکی میں رہنے والی مخلوق کے قانون حیات کا اس کرۂ ارض پر رہنے والی مخلوق کے قانون حیات سے اس قسم کا کوئی تفاوت ہو۔

اس نکتے پر توجہ کرنے سے کہ حیات ایک نامعلوم اور ناشاختہ حقیقت ہے اور اس کے پیش نظر کہ ممکن ہے خداوند قدیر نے کہ دیگر اجرام و کرہ جات میں مختلف قوانین حیات کے مطابق کچھ مخلوقات پیدا کی ہوئی ہوں۔ اس سے یہ نتیجہ بر آمد ہوتا ہے کہ حقیقت حیات کی بحث کو اتنی ہی وسعت کے ساتھ زیر تحقیق لانا چاہیئے کہ جتنی وسعت اس عظیم حقیقت کے اندر موجود ہے۔ پس یہ کافی نہ ہوگا کہ ہم محض کرۂ ارض پر موجود زندگی کے محدود دائرے کا مشاہدہ کریں اور اس ناشاختہ حقیقت کو اس کرۂ خاکی کی زندگی کے علامات ونشانات تک محدود دائرے کا مشاہدہ کریں اور اس ناشاختہ حقیقت کو اس کرۂ خاکی کی زندگی کے علامات ونشانات تک محدود قرار دے دیں۔ تب ہم یہ تصور کرنے لگیں کہ جہاں کہیں اور جس قسم کے حالات وشرائط میں بھی زندگی پائی جائے۔ ضروری ہے کہ اس میں اس ارضی زندگی کے علامات ونشانات بلا کم وکاست موجود ہوں۔

اگر فخر الدین رازی اس دنیوی زندگی سے بالاتر ہو کر زندگی کا مطالعہ کرتے، اس پر غور کرتے اور اس وسیع اور غیر معلوم حقیقت کو فقط اس زود گزر دنیوی کے علامات تک محدود نہ سمجھتے تو اس کا ہرگز موقع نہ دیتے کہ کوئی اللہ تعالیٰ کی حیات اقدس کا حیوانات کی پست ترین کے ساتھ مقایسہ کرے اور کہے:

لقائل ان یقول لما کان معنی الحی ھوانه الذی یصح ان یعلم ویقدر وھذا القدر حاصل لجمیع الحیوانات فکیف یحسن ان یمدح الله نفسه بصفة یشارکه فیھا اخس الحیوانات[1]

(ترجمہ گزر چکا ہے)

[1] تفسیر کبیر ج ۲ ص ۴۶۶

تخلیق حیات

زندگی ابتداء کے متعلق فکر کی نارسائی

نہ فقط یہ کہ بشر زندگی کی حقیقت پر آگاہ نہیں اور نہیں جانتا کہ زندگی کی واقعیت کیا ہے؟ بلکہ وہ تو ابھی تک اس کرۂ ارض پر زندگی کی پیدائش کی کیفیت کو درک کرنے اور اس عجیب مخلوق کے وجود میں آنے کی صحیح شکل سے بھی نابلد رہا ہے۔ بشر نہیں جانتا کہ اس جہان کا ایک بے جان مادہ کس طرح ایک زندہ موجود میں بدل جاتا ہے اور اس انقلاب وجودی کے شرائط و کیفیات کیا ہیں؟ وہ یہ بھی نہیں سمجھ سکا کہ اس کائنات میں زندگی کے حیرت انگیز عمل نے اپنی حرکت وفعالیت کا آغاز کس طرح کیا ہے؟

روان راندانست کس زاد گاہ

چنانش کہ نشاخت معیاد گاہ

ترجمہ: روح وجان ایسی شئی ہے کہ کوئی اس کی ابتداء کو نہیں پہچان سکا جیسا کہ کوئی اس کی انتہا کو بھی نہیں سمجھ سکا۔

بعض لوگ کہتے کہ آزاد الیکٹرانوں کے تکامل سے ایٹم بنا، پھر اٹیم کے تکامل سے زندگی پیدا ہوئی اور زندگی کے تکامل کے نتیجے میں انسان وجود میں آیا۔ لیکن الیکٹرانوں میں ان تبدیلیوں کی کیفیت اس قدر نامعلوم اور ناشناختہ ہے کہ علم وسائنس ان کے گہرے فاصلوں پر اطلاع حاصل کرنے سے عاجز رہے اور ان انقلابات کو توضیحات وتوجیہات پیش کرنے پر قادر نہیں ہو سکے۔

ناقابل عبور فاصلہ

جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ الیکٹرون کے ایٹم بن جانے تک کے درمیان ایک بہت بڑی فکری پیچیدگی ہے جو سرتاسر ناقابل عبور ہے۔ یعنی نہیں معلوم کہ یہ تبدیلی کس طرح ہوتی ہے؟ الیکٹرون سے ایٹم کے تشکیل پانے اور اسی طرح ایٹم کے تکامل پا کر حیات میں بدلنے تک جو فاصلے ہیں وہ بھی ناقابل فہم نظر آتے ہیں، (جبکہ زندگی ایٹم سے حاصل ہوتی ہے) اسی طرح ہمارا نظر آتی ہے کہ تکامل حیات سے تکامل انسان کے درمیان جو فکری گھاٹی موجود ہے وہ بھی ناقابل عبور نظر آتی ہے یعنی ہم اس کی صحیح کیفیت سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔ [1]

الٰہیین (خدا پرستوں) اور بادیین (مادہ پرستوں) میں سے کوئی بھی زندگی کی پیدائش کی رمز اور گیاہی وحیوانی خلیوں کے

---

[1] سرنوشت بشر ص ۱۲۱

وجود میں آنے کی کیفیت سے واقف نہیں ہوسکا۔

البتہ ان میں یہ فرق ضرور ہے کہ الٰہیین اصل آفرینش پر اعتقاد رکھتے اور کہتے ہیں کہ ایک خداوند حکیم ہے جو عالم وقادر اور حی ہے کہ جس نے اپنے الٰہی ارادے کے ساتھ اس جہان کا نظام قائم کیا ہے۔ اسی نے زندگی کو پیدا فرمایا اور پھر زندہ شئی کو ایسی قوتوں اور توانائیوں سے آراستہ فرمایا کہ جن کی اسے اپنی زندگی کی بقاء کے لئے سخت ضرورت لاحق رہتی ہے۔

مادہ پرستوں کا نظریہ تصادف

مادیون (مادہ پرست) جو پیدائش حیات کو ایک تصادف۔ اچانک حادثہ اور طبیعت کی اندھی قوت کا نتیجہ سمجھتے ہیں، اس میں وہ ایک عجیب علمی پیچیدگی کا شکار ہوگئے ہیں۔ چنانچہ وہ اس ناشناختہ مخلوق کی عقلی توضیح و توجیہ کے لئے ناگوں مفروضے سامنے لائے ہیں، لیکن ان میں کئی بھی مفروضہ اس پیچیدہ معمے کو حل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا اور اس نامعلوم حقیقت کی نقاب کشائی کا ذریعہ نہیں بن پایا سچ تو یہ ہے کہ ہمیں زندگی کی ابتداء کے متعلق کوئی علم نہیں، وحدتی مفروضہ کہ جو مفروضہ تکامل کی ایک شاخ ہے۔ اس کے پیش نظر زندگی طبیعی توانائی کے نتیجے میں اس بے جان مادے سے پیدا ہوئی ہے۔ اگر ہم خدائی آفرینش کے قائل نہ ہوں کہ جس سے یہ مسئلہ مزید مشکل ترین بن جائے گا۔ تاہم اس صورت میں درحقیقت ہوائی بیجوں کا زمین پر بکھرنا خودبخود تولیں پانا اس موضوع کی عقلی توضیح ہوسکتی ہے۔[1]

زمین کی طبیعی وضع اور زندہ اشیاء کی خلقت سے مربوط مباحث پر زیادہ سے زیادہ اطلاعات پانے کے لئے ماہرین اور محققین کی کتب سے ان کی عبارات کو بعینہ البتہ اختصار کے ساتھ نقل کرنا مفید رہے گا۔

زمین کی ابتدائی حرارت

کورسی موریسن کہتا ہے: اگر مان لیا جائے کہ زمین کے سورج سے جدا ہوتے وقت اس کا درجہ حرارت خود سورج کے درجہ حرارت۔ بارہ درجے کے برابر تھا تو اس صورت میں تمام عناصر اپنی خالص حالت میں اس میں موجود تھے اور پھر ان میں کوئی قابل توجہ کیمیاوی تبدیلی وجود میں نہیں آئی تھی۔ تب زمین نے اپنے پراگندہ قطعات سمیت بتدریج ٹھنڈا ہونا شروع کیا، عناصر کا اختلاط ہونے لگا اور پھر زمین کا وہ مرکزی نکتہ وجود میں آیا کہ جسے آج ہم پہچاننے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔

دریا اور آسمان

آکسیجن اور ہائیڈروجن خودبخود باہم مخلوط نہیں ہوسکتی تھیں۔ جب زمین کا فارن ہائٹ درجہ حرارت چار ہزار تک پہنچا تو

---

[1] چہ میدانم؟ بنیاد النواع ص ۱۴

یہ دونوں عنصر دفعتاً ایک دوسرے سے مخلوط ہو گئے اور اپنی اس ترکیب سے پانی کو وجود میں لائے۔ آج ہم تحقیق کے بعد جس امر کو سمجھنے میں کامیاب ہوئے ہیں، وہ یہ ہے کہ زمین کی تکوین کے اس دور میں لازماً اس کے اردگرد ایک غلیظ اور سنگین ہوا محیط تھی، یہ سارے دریا آسمان میں تھے اور یہ سب عناصر جواب باہم ترکیب پا گئے ہیں، اس وقت کی فضا میں پراگندہ تھے۔ پانی جوز میں کی بیرونی ہوا میں تشکیل پائے ہوئے تھا، وہ زمین کی سمت روانہ ہوا، لیکن زمین کے باہر کی ہوا بہ نسبت اس ہوا کے بہت زیادہ گرم اور جلا دینے والی تھی۔ کہ جو زمین کے باہر چند ہزار کیلومیٹر تک موجود تھی۔ اس لئے جوں ہی پانی زمین کی ہمسائیگی اور قرب میں آتا بخارات بن جاتا اور اس طرح پانی کا کوئی قطرہ کرۂ زمین کی سطح تک نہ پہنچ پاتا۔ بہرحال بتدریج زمین جس قدر سرد تر ہوتی تو جو دریا ہوا میں معلق تھے وہ زمین کی طرف بڑھنے لگتے تھے۔ اس وقت جو ہولناک سیلاب امنڈتے تھے وہ ہمارے اندازوں اور تصورات کی حد تک بہت دور رہیں۔ کئی ملین سال تک یہ فضائی انقلاب اور عظیم طوفان کرۂ زمین کی سطح پر غوغا بپا کئے رہے اور اس عجیب تخلیق کی دار و گیر جاری رہی۔ آکسیجن گیس دیگر ایسے مادوں کے ساتھ ترکیب پاتی رہی جن سے زمین کی بیرونی سطح وجود میں آئی ہے۔ ان میں سے ایک عمل آکسیجن کا ہائیڈروجن سے مرکب ہونا تھا کہ اس سے زمین اور دریا تشکیل پاتے تھے[1]۔

زمین کا ابتدائی دور

زمین ابتداء میں ایک نرم اور جلانے والا قطعہ تھا اور پانی جو زندگی کا بنیادی رکن اور ایک زندہ شئی کی پرورش کے لئے ضروری چیز ہے۔ وہ زمین کی حرارت کی شدت سے بخارات سے بخارات بن جاتا، اس لئے وہ زمین سے بہت دور اس کے گرداگرد گھومتا رہتا تھا۔ اس سے یہ ایک قطعی نتیجہ برآمد کیا جا سکتا ہے کہ اس کرۂ زمین پر ایسا زمانہ گزرا ہے کہ اس پر کوئی زندہ شئی موجود نہیں تھی۔ کئی ملین ہا سال اسی طرح گزرے، رفتہ رفتہ زمین کی سطح سرد ہوئی پھر پانی اس پر قرار پکڑنے میں کامیاب ہوا اور اس کے بعد زندہ موجودات وجود میں آنا شروع ہوئے۔

زندگی کے متعلق قدیم ترین مفروضہ

اب اس گفتگو سے زندگی کے بارے میں اس علمی اور عقلی بحث کا آغاز ہوتا ہے کہ اس زندگی کی پیدائش کے عوامل کیا تھے؟ زندگی کن شرائط کے تحت متحقق ہوئی۔ بے جان طبیعی مادے اور معدنی نمکیات جو اس کرۂ ارض میں پائے جاتے تھے، کس طرح وہ زندہ موجودات میں تبدیل ہونے لگے۔؟ اور یہ حیرت انگیز مخلوق کیونکر وجود میں آ گئی؟ زندگی کے بارے میں قدیم ترین مفروضہ یہ ہے کہ یہ زندہ موجود خود بخود وجود میں آیا ہے۔ سب لوگ دیکھتے تھے کہ مختلف قسم کے زندہ کیڑے ایسے ماحول میں موجود ہو جاتے کہ جہاں کوئی دوسرا زندہ موجود نہیں پایا جاتا تھا۔ مثلاً گندم اور جو کا آٹا یا چاول یا دیگر دانہ دار اجناس کو کچھ عرصہ تک ایسے ظروف میں رکھا جائے کہ جن

---

[1] راز آفرینش انساں ص ۲۱

کا منہ بندھا ہوا ہوتو ان میں خودبخود کیڑے پیدا ہوجاتے ہیں اور اسی طرح جب پھل یا ترشیاں خراب ہوتی ہیں تو ان میں بھی خودبخود کیڑے پیدا ہوجاتے ہیں۔ اگر پاک اور صاف پانی کچھ مدت تک گڑھوں یا حوضوں میں کھڑا رہے تو اس میں کئی ملین سرخ وسفید کیڑے اور دیگر زندہ موجودات پیدا ہوجاتے ہیں۔ ماہرین نے ان تمام مناظر کو دیکھا تو یہ مفروضہ قائم کیا کہ اسی طبعی ماحول میں یہ زندہ موجودات خودبخود وجود میں آجاتے ہیں۔

خودبخود تولید

چنانچہ بعض جانداروں کے خودبخود تولید پانے کا خیال ایک قدیمی نظریہ رہا ہے اور ارسطو کے زمانے سے سترہویں صدی عیسوی کے وسط تک لوگ یہی خیال کرتے تھے کہ کیڑے۔ مکوڑے۔ مینڈک۔ گھونگے۔ کیچوے۔ جونکیں اور دیگر تمام ایسے زندہ موجودات جو ہم گندگیوں۔ جوہڑوں۔ دلدلوں۔ کھڑے پانیوں اور گندے مادوں میں دیکھتے ہیں، یہ سب خودبخود تولید پاتے ہیں۔[1]

ہر زندہ کی پیدائش دوسرے زندہ سے ہے

سترہویں صدی کے دوسرے نصف کے بعد محققین نے ان خودبخود موجود ہونے والے زندہ موجودات پر تحقیق کی تو بہت سے تجربات کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ کوئی زندہ موجود خودبخود وجود میں نہیں آتا، بلکہ ہر زندہ موجود ایک اور زندہ موجود سے تولید پاتا ہے۔

''ریڈی'' (Redi) کے ۱۶۸۸ء میں کئے جانے والے تجربات سے ظاہر ہوا کہ گوشت میں جو کیڑے پیدا ہوتے ہیں وہ ان کیڑوں کے انڈوں سے پیدا ہوتے ہیں جو اس میں مکھیوں کے ذریعے منتقل ہوتے ہیں۔

(رائیسزی) نے ثابت کیا کہ کیڑے مکوڑوں کے انڈے نباتات کے شگوفوں میں ہوتے ہیں۔[2]

پاسچر ۱۸۶۱ء میں اس قابل ہوا کہ اکیڈمی میں اس امر کو پایۂ ثبوت تک پہنچائے اور اس پر قطعی دلائل پیش کرے کہ خودبخود تولید کا طریقہ غلط ہے۔ کیونکہ کوئی بھی شئی خودبخود زندہ نہیں ہوسکتی، بلکہ ہر زندہ موجود ایک دوسرے زندہ موجود ہی سے پیدا ہوتا ہے نہ تو دودھ خراب ہوسکتا ہے اور نہ ہی شراب ترش ہوسکتی ہے جب کہ ان میں زندہ موجودات کے انڈے شامل نہ ہونے دیئے جائیں۔ ہر ایسی جگہ جہاں کوئی تخم یا کوئی شراب بنانے کا مادہ یا کوئی زندہ میکروب وجود نہ رکھتا ہو، وہاں کوئی جاندار تولید نہ پائے گا نہ ہی شراب سازی کے لئے عمل تخمیر انجام پاسکے گا، نہ دودھ خراب ہوگا اور نہ ہی کوئی چیز باسی ہوگی۔

اس امر کی بہترین دلیل پاسچر یک تجربہ گاہ میں موجود یخنی ہے جسے اس نے ایک سلنڈر میں محفوظ کیا تھا۔ لیکن پون صدی

---

[1] چہ میدانم؟ بنیاد انواع ص ۱۴۔ ۱۵

[2] چہ میدانم؟ بنیاد انواع ص ۱۴۔ ۱۵

گزرنے کے باوجود وہ ابھی تک محفوظ ہے اور خراب نہیں ہوئی کہ آج بھی اسے وہاں دیکھا جا سکتا ہے۔

خود بخود تولید مثل کے بچے کھچے حامی ۱۸۷۶ء میں اس وقت آخر شکست کھا کر مان گئے جب انگریز سائنس دان ''جان ٹنڈل'' نے پاسچر کے تجربات کا پوری دقت کے ساتھ اعادہ کیا اور ''شارل ایڈورڈ شامبرلن'' نے وہ مخصوص اور صاف مائع تیار کی جو اس کے نام سے موسوم ہے، اس ایجاد کے ساتھ اس قدیم مفروضے کا خاتمہ ہو گیا اور کوئی بھی اس کا حامی نہ رہا۔[۱]

خود بخود تولید کا تزلزل

انیسویں صدی کے اواخر میں ماہرین نے جو تحقیقات کی ہیں، ان سے خود بخود تولید والا قدیمی نظریہ متزلزل ہو کر رہ گیا اور یہ عقلی احتمال بالکل کمزور اور صعیف ہو گیا ہے کہ کوئی زندہ خود بخود وجود میں آ سکتا ہے، اب اس نظریئے کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی۔

زندگی کی پیدائش کے بارے میں خود بخود تولید والے نظریئے کی جگہ ایک دوسرا نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ زندگی کا اصلی جوہر اس زمین پر کسی دوسرے کرے یا دیگر اجرام سے نازل ہوا ہے۔ وہ ایسے مناسب شرائط میں آیا کہ یہاں پرورش پانے لگا اور اس سے زندہ اشیاء وجود میں آنے لگی ہیں۔

اس نظریئے کے حامیوں کو امید لگ گئی ہے کہ اس کے مطابق اب زندگی کی ابتداء کا مشکل مسئلہ حل ہو جائے گا اور اس پر عقلی ومنطقی بحث ختم ہو جائے گی، یعنی یہ پیچیدہ موضوع کو امید لگ گئی ہے کہ اس کے مطابق اب زندگی کی ابتداء کا مشکل مسئلہ حل ہو جائے گا اور اس پر عقلی ومنطقی بحث ختم ہو جائے گی، یعنی یہ پیچیدہ موضوع علمی اعتبار سے قابل توضیح وتوجیہ بن جائے گا۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا اور دانش ور اس نظریئے پر اشکالات وارد کرنے میں کامیاب ہو گئے اور انہوں نے اس کو بھی فضول اور ناقابل اعتنا قرار دے دیا۔

نزول جرثومہ حیات

بعض ماہرین کہتے ہیں: زندگی کا جرثومہ کسی دوسرے سیارے سے نکلا پھر بہت صدیوں تک ہوا میں سرگرداں ہو رہا اور بالآخر ہماری اس زمین پر آن اترا۔

لیکن یہ نظریہ بھی قابل قبول نہیں۔ کیونکہ زندگی کی جرثومے کے لئے ناممکن ہے کہ فضائے مطلق ٹھنڈک میں زندہ رہ سکے۔ اگر اس سردی میں اس کا زندہ رہنا مان بھی لیا جائے تو عالم بالا کی طاقتور شعاعیں جو اس فضا میں بکھری ہوئی ہیں، وہ اس کو ختم کرنے کے لئے کافی ہیں۔ بالفرض وہ اس مرحلے سے گزرنے میں کامیاب ہو جائے تو پھر اتفاقاً اس کا کسی انتہائی مناسب مقام پر اترنا ضروری ہے۔ مثلاً دریا کی گہرائی کہ جہاں وہ اپنی زندگی کو برقرار رکھنے پر قادر ہو اور اس کے لئے دیگر شرائط بھی موجود ہوں، یعنی اسے ایک مناسب فضا فراہم ہوتا کہ اس طرح خود بھی زندہ رہے اور زمین کی دیگر اشیاء کو بھی وجود میں لا سکے۔ لیکن معاملہ پھر بھی ختم نہیں ہو گا کہ

---

[۱] تاریخ علوم ص ۶۱۵

ان سب مشکلات کے بعد بھی یہ سوال ہے کہ حقیقت زندگی کیا ہے؟ اور وہ دیگر سیارات میں کس طرح وجود میں آ گئی[1] ؟

اگر چہ پاسچر جیسے بعض ماہرین کی تحقیقات نے زندگی کی خود بخود پیدائش کے مفروضے کو نابود کر دیا، لیکن پھر بھی محققین آرام سے بیٹھ نہ سکے اور انہوں نے زندگی کی ابتداء کے بارے میں تلاش و جستجو کا عمل جاری رکھا، تا کہ وہ زندگی کی ابتداء کے مشکل سوال کو حل کرنے کے لئے کوئی معقول مفروضہ پیش کر سکیں اور اس کا مناسب جواب سامنے لا سکیں۔

تیکنیکی ترقی اور تجربہ گاہ کے لئے انتہائی باریک بین آلات کے وجود میں آنے کے بعد جب سائنس دان ان موجودات کو زیر مطالعہ لانے میں کامیاب ہوئے کہ جو خوردبین کے بغیر دکھائی نہیں دے سکتے تو انہیں طبیعت کی اس آرام گاہ میں انتہائی اہم ترین موجودات پر آگاہی حاصل ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خود بخود تولید کا مفروضہ دوبارہ رونق حاصل کرنے لگا اور کچھ دانش ور اس مفروضے کو صحیح قرار دینے کے لئے دوبارہ بحث و گفتگو کرنے لگے۔

زمین کے ابتدائی حالات

چنانچہ اس بحث کو دوبارہ تازہ کرنے کے لئے جو نکتہ بالخصوص مورد توجہ قرار پایا اور دانش وروں کے لئے سہارا بنا وہ اس کرہ زمین کے ابتدائی حالات اور آج کل کے طبیعی احوال میں پایا جانے والا تفاوت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ کرہ زمین آغاز میں مخصوص حالات واوضاع رکھتا تھا اور اس وقت اس میں خود بخود زندہ شئی کے وجود میں آنے کے سرائط موجود تھے۔ لیکن اب ملین ہا سال گزرنے اور پے در پے انقلاب آنے سے حالات واوضاع میں بہت بڑی تبدیلی آ گئی ہے۔ چونکہ پرانے حالات بالکل ختم ہو گئے ہیں اس لئے اب ہماری اس زمین پر کسی بھی موجود کا خود بخود زندہ رہ جانا ممکن نہیں رہا ہے۔

اس نظریئے کو ثابت کرنے کے لئے ضروری ہو گا کہ ہم کسی تجربہ گاہ میں کرہ زمین کے ابتدائی دور کے حالات و شرائط کے مطابق مصنوعی حالات وجود میں لائیں۔ یا کسی دوسرے ایسے کرے کو تلاش کر لیں جہاں ابھی اس قدر تکامل نہ ہوا ہو اور وہاں زمین کے ابتدائی حالات کے مطابق طبعی حالات ہوں پھر وہاں اس کی تحقیق کی جائے اور اس کے لئے تجسس کیا جائے کہ زندگی خود بخود کس طرح وجود میں آ گئی ہے۔

ابتدائی زندہ فرد کے خود بخود زندگی پانے کا دعویٰ

پاسچر کے تجربات میں اگر کوئی غلطی قرار دی جا سکتی ہے تو وہ فقط یہی ہو سکتی ہے کہ زمانے کا وہ عامل ناکافی ہے جو اس ماجرے میں دخیل ہے (یعنی اس تجربے میں آخری نتیجہ مرتب نہیں ہوتا)۔ کیونکہ دور حاضر کے کچھ سائنس دان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ جب ہمارا یہ سیاہ زمین وجود میں آ رہا تھا وہ مواد جو زندگی کی پیدائش میں کام کرتا ہے، اس میں ایک انتہائی اعلیٰ درجے کا کیمیاوی عمل

---

[1] راز آفرینش انساں ص ۵۶

واقع ہوا۔ یعنی ابتداء یہ مادہ جات اس وقت کے فضائی ماحول سے بنے اور پھر ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے۔ اس پیوستگی سے وہ اولین فرد وجود میں آیا جو اپنی مثل دیگر افراد کو وجود میں لانے پر قادر تھا اور خود ختم ہو کر اپنے جیسے چند ایک افراد کو وجود میں لا سکتا تھا اس طرح زندگی کا سلسلہ چل نکلا۔

اس میں شک نہیں کہ وہ کیمیاوی تبدیلی جس سے اولین خلیہ پیدا ہوا اور زندگی کی خلقت کا وہ انقلاب جس کے بعد یہ جاندار اشیاء وجود میں آنے لگیں جواب گونا گون اقسام پر موجود ہیں، اس سارے عمل کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ کئی لاکھ بلکہ کئی کروڑ سال گزریں کہ جن میں سے اس حد تک تبدیلیاں واقع ہو سکیں[۱]۔

زمین کا موجودہ فضائی ماحول

اس دور میں زمین کا ابتدائی فضائی ماحول آج سے بہت کچھ مختلف تھا، آج کے اس ماحول کا عمدہ حصہ نائٹروجن۔ آکسیجن۔ اینڈ ریڈ کاربانک، آبی بخارات اور چند ایک نادر عناصر سے مرکب ہے اور اس میں آکسائیڈ بنانے کی صلاحیت ہے۔ لیکن زمین کے اولین دور کی فضا آکسیجن سے بالکل خالی تھی، اس لیے وہ زندگی پیدا کرنے کی قوی طاقت رکھتی تھی، کیونکہ اس فضا میں آزاد ہائیڈروجن موجود تھی اور اس کے علاوہ اس کے اندر موجود دیگر عناصر حیات بخش حالت میں تھے[۲]۔

زندگی اور ابتدائی فضائی ماحول

بنابریں زندگی کی ابتدائی پیدائش کے بلاواسطہ شواہد پر اطلاع حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ یا کوئی مصنوعی تجربہ گاہ بنائی جائے یا کسی ایسے سیارے کو تلاش کیا جائے جہاں زندگی کا تکامل بہ نسبت زمین کے ابھی تک ابتدائی مراحل میں ہو۔ پھر وہاں تحقیق کی جائے تو ہو سکتا ہے کہ وہ تمام تفصیلی تدریجی تبدیلیاں جو زندگی کی پیدائش کے عمل میں مرحلہ بہ مرحلہ انجام پذیر ہوتی رہی ہیں، وہ سب زیر مطالعہ آئیں اور ان حقائق سے آگاہی حاصل ہو سکے[۳]۔

دعویٰ بلا دلیل

زندگی کے خود بخود وجود میں آنے والا مفروضہ کرہ زمین کے ابتدائی اوصاع واحوال کے مدنظر اب کافی ہوا خواہ وحامی پیدا کر گیا ہے اور دور حاضر کے سائنس دان بالخصوص مادہ پرست اور منکرین خدا سائنسی ماہرین میں یہ مفروضہ خاصہ مقبول رہا ہے۔ ان کی انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اس نظریہ کا دفاع کریں اور تاحد امکان اس نظریئے کے اثبات میں تائیدات لائیں۔ یہ لوگ بعض فزیکی

---

[۱] حیات در آسمانہا ص ۳۲۔۳۷۔۴۱

[۲] حیات در آسمانہا ص ۳۲۔۳۷۔۴۱

[۳] حیات در آسمانہا ص ۳۲۔۳۷۔۴۱

اور کیمیاوی مباحث کا سہارا لے کر امید باندھے ہوئے ہیں کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ جب ہم اپنے اس مفروضے کو علمی نقطہ نگاہ سے عام دانش وروں سے بھی تسلیم کرالیں گے۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ اس سے زندگی کا پیچیدہ اور مشکل ترین مسئلہ حل ہو جائے گا اور ہماری مادی منطق کے ذریعے زندگی کی حقیقت قابل توجیہ بن جائے گی، یعنی مادہ پرستی بھی برحق ثابت ہوگی اور زندگی کی حقیقت بھی واضح ہو جائے گی۔ لیکن ان کے مقابلے میں ماہرین کا ایک دوسرا گروہ ہے جو زندگی کے خودبخود پیدا ہونے کے نظریے کو معقول ہونے کی حد تک تو تسلیم کرتے ہیں، لیکن دوسری طرف اس بات کو بالکل غلط اور بے بنیاد قرار دیتے ہیں کہ زمین کے ابتدائی دور کے شرائط و حالات آج سے کچھ مختلف تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ آج جب پاسچر کے تجربات کے ذریعے ایک حقیقت واضح ہو چکی ہے۔ تو زندگی کے خودبخود پیدا ہونے والے نظریئے کے لئے اس بات کا سہارا لینا کہ کرہ زمین کے ابتدائی دور کے شرائط جداگانہ تھے۔ یہ بات ہمارے خیال میں ایک بلا دلیل دعوی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

جنیو یونیورسٹی کے پروفیسر ''امیل گونیو'' کہتے ہیں: ماہرین کی ایک جماعت کا نظریہ ہے کہ شاید زندگی کا آغاز ایسے حالات و شرائط سے ہوا ہے جو ہمارے موجودہ دور سے بہت ہی متفاوت تھے۔ چنانچہ اس دور کے شرائط اوضاع نے ایسی تراکیب اور اجزاء فراہم کئے جو زندگی کیلئے لازم ہو سکتے ہیں لیکن یہ نظریہ ایک ایسا مفروضہ ہے کہ جس کی کوئی حقیقت نہیں ہو سکتی۔ اگر ایسا ہی ہوا تھا کہ زندگی ایک بار اس دستور کے مطابق ایجاد ہوئی کہ اس دور کے شرائط اس کے لئے مناسب تھے تو پھر زمین کے مختلف حصوں میں کئی ایک مقامات پر خودبخود تولید کا یہ عمل بار بار کیوں واقع نہیں ہوا؟ نیز یہ سب موجودات کیوں یکسر نابود ہو گئیں کہ ان میں سے صرف ایک ہی تولید محفوظ اور باقی رہ سکی؟ اور اگر ایسا ہوا تھا تو ہمیں اس کا اطمینان کیسے حاصل ہو کہ حیوانات اور نباتات کی مختلف اقسام کہ جن کی ساخت میں ہم اساسی طور پر مشابہت پاتے ہیں، کیا یہ سب ایسے متعدد اسباب کے ذریعے پیدا ہوئے ہیں جو باہمی مختلف ہیں اور ہر ایک مستقل بھی ہے ہمیں یہ اطمینان کیسے حاصل ہوگا؟

ناپختہ مفروضہ

پس زندگی کے خودبخود وجود میں آنے والا مفروضہ باوجودیکہ ہمیں صرف یہی ایک معقول نظریہ دکھائی دیتا ہے، تاہم اس کو ماننے سے ایسی کئی مشکلات پیدا ہوتی ہیں کہ جن کا حل نکلتا نظر نہیں آتا۔ کیونکہ یہ نظریہ کسی مستحکم بنیاد پر استوار نہیں ہے۔ [۱]

امیل گونیو کہتا ہے: اپنی اس پیچیدہ جسمانی ساخت کے ساتھ ایک بکٹیریا کا خودبخود وجود میں آجانا یقینا ایک امر ہے۔ ایک طریقہ عمل (ازپسی) کہ جس میں تمام میکروب عفونت ختم کرنے والی ادویہ کے بغیر ہلاک کر دئے جاتے ہیں، اس سے یہ ثابت ہوا ہے کہ آج کے دور میں خودبخود تولید پانے کی کوئی صورت نہیں اور نہ کبھی یہ عمل انجام پذیر ہوتا ہے۔ پھر یہ کیسے مانا جا سکتا ہے کہ آج سے

[۱] چہ میدانم؟ بنیاد انواع ص ۱۶

لاکھوں سال قبل خودبخود تولید کا عمل انجام پا گیا تھا۔ آخر اسے کس دلیل سے تسلیم کیا جا سکتا ہے؟[1]

اسلام اور تفکر

قرآن مجید نے تو متعدد مقامات پر اصل زندگی و حیات اور ان زندہ اشیاء کی تخلیق میں موجود حکیمانہ دقائق کو باری تعالیٰ کے وجود کی علامت و نشانی قرار دیا ہے۔ یوں اس نے لوگوں کو شوق دلایا کہ وہ اپنی عقل کو کام میں لائیں، ان مخلوقات کا مطالعہ کریں، ان میں غور و فکر کر کے خداوند حکیم کے وجود سے باخبر ہوں اور پھر اس کی ذات اقدس پر ایمان لائیں۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر زمین کے ابتدائی دور کے حالات و شرائط کے تحت زندگی خودبخود متحقق ہو گئی، یہ مفروضہ مسلم ہے اور تمام سائنس دانوں اور محققین کے ہاں یہی مورد قبول واقع ہوتا ہے تو کیا اس سے الٰہیون (خدا پرستوں) کی منطق ضعیف اور کمزور پڑ جائے گی؟ کیا اس نظریے کا اثبات خدا پرستوں کے استدلال کو متزلزل نہ کر دے گا؟ ہماری طرف سے اس کا جواب نفی میں ہے، یعنی اگر یہ نظریہ ثابت ہو جائے تو بھی قرآن شریف کی منطق اپنے مقام پر برقرار رہے گی اور اس میں کوئی تزلزل نہ آئے گا۔ کیونکہ تمام زندہ موجودات کی زندگی کا حکیمانہ نظام اور ان میں سے ہر ایک وجود میں ایک خاص حساب اور صحیح انداز ے کا موجود ہونا یہ سب امور ایک علیم خالق کے وجود پر واضح اور روشن دلائل ہیں۔

زندگی کے مقدماتی مراحل

وضاحت: کرہ زمین میں زندگی کا مسئلہ علمی نقطۂ نگاہ سے متعدد مدارج و مراحل رکھتا ہے۔ آبی مادوں کا باہم آمیختہ ہونا۔ کیمیاوی مالیکیولوں کا تشکیل پانا۔ تغذیہ و رشد کی قوت کا آنا، نباتی خلیوں کے گروہ کا حیوانی خلیوں سے جدا ہونا، عالم نباتات کا حیوان کی زندگی کی بقاء کے لئے حیوان سے وابستہ ہونا اور حیوان کے اندر غریزی سرمائے کا وجود میں آنا۔ یہ اور ایسے ہی دیگر مراحل کہ جن کا حات سے گہرا ربط ہے، ان میں سے ہر ایک جداگانہ بحث کے قابل ہے، لہٰذا یہاں ہم ان میں سے بعض کے بارے میں مختصر گفتگو کریں گے۔

زندگی کی پیدائش مادیون اور الٰہیون کی نگاہ میں

سب سے پہلے کرہ زمین کے ابتدائی حالات و شرائط کے تحت زندگی کے خودبخود وجود میں آ جانے کے نظریے کی بنیاد پر ہم اس نکتے پر بحث و تحقیق کرنا چاہیں گے کہ کیمیاوی مالیکیوں کو تشکیل دینے والے مادوں کا باہم آمیختہ ہو جانا جیسے ممکن ہوا؟ اس لئے کہ یہی مسئلہ زندگی کی پیدائش کا سب سے اولین مرحلہ ہو سکتا ہے۔ مادیون اور الٰہیون ہر دو کے مابین یہ امر مسلم اور متفق علیہ ہے کہ

---

[1] چہ میدانم؟ بنیاد انواع ص ۱۷

اس جہان میں زندہ موجودات اسی جہان کے بے جان مادے سے وجود میں آئے ہیں۔ان دونوں گروہوں کا اختلاف یہ ہے کہ مادیون (مادہ پرست) افراد کا کہنا ہے کہ ان بے جان مادوں کی ترکیب، ان مردہ عناصر کی باہمی امیزش اور آخر کار زندگی کی پیدائش۔ یہ ایک قہری۔ جبری اور اتفاقی تکاملی عمل ہے اور اس کے پس منظر میں کسی ناظم کا ہاتھ کارفرما نہیں ہے پس یوں ہی بلا وجہ اور اندھے اور لاشعوری پن طبیعت میں ازخود یہ تکامل واقع ہو گیا ہے۔لہٰذا اس سارے عجیب وغریب عمل کی بنیاد سوائے تصادف، کسی اتفاقی حادثے اور لاشعوری میں ازخود ہو جانے والے واقعہ کے علاوہ کوئی اور وجہ اور سبب نہیں ہے۔

لیکن الٰہیون (توحید پرست) کہتے ہیں کہ اس عالم کے مردہ عناصر کا باہم آمیختہ ہونا۔ زندگی کے کیمیاوی مالیکیولوں کا بن جانا اور پھر زندہ اشیاء کا اپنی ان پوری طبیعی اور حیاتی کششوں کے ساتھ وجود میں آجانا یہ ایک منظم عمل، سوچا سمجھا منصوبہ اور تربیتی تکامل ہے۔ یہ تکامل خداوند حکیم کے فرمان سے ظاہر ہوا اور اس کے چند ایک حکیمانہ قوانین اور مدبرانہ طریقوں کے مطابق تحقق پذیر ہوا ہے۔

کرۂ ارض کے ابتدائی دور کے حالات میں زنگی کے ازخود وجود میں آجانے والے نظریئے کے حامی کہتے ہیں: زمین کا اولین ایٹم ہمارے موجودہ زمینی ایٹم سے بہت کچھ متفاوت تھا، کیونکہ موجودہ ایٹم اکسائیڈ بناتا ہے لیکن اولین ایٹم آکسیجن سے عاری تھا۔اس لیے زندگی کا موجب نہیں بن سکتا تھا اور اس کے علاوہ کچھ اور فرق بھی ہیں۔ پس وہ اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ آج کے حالات وشرائط میں کوئی موجودہ خودبخود زندہ نہیں ہوسکتا۔لیکن زمین کے ابتدائی حالات میں خودبخود تولید ہوسکتی تھی لہٰذا اس زمانے میں زندگی خودبخود پیدا ہوئی تھی۔

خودبخود پیدائش کے نظریئے کا رد یا قبول

اگر یہ نظریہ علمی نقطۂ نگاہ سے قابل تردید قرار دیا جائے تو ثابت ہوجائے گا کہ یہ ایک باطل مفروضہ اور غیر حقیقی تخیل تھا، لہٰذا اس پر کسی بحث وگفتگو کی حاجت نہیں ہے۔ ہاں اگر مستقبل میں یہی نظریہ محققوں اور دانش وروں کے نزدیک قبول ہوجائے اور علمی تحقیقات اس کی صحت واصالت کی تائید کرنے لگیں تو ہمارے لئے ممکن ہے کہ اس سلسلے میں مادی الٰہی بحث میں ایک بنیادی نکتے کو مورد استفادہ قرار دیں۔یعنی بے جان مادوں کا باہم آمیختہ ہونا، اور زندگی کے مالیکیولوں کا اس عالم طبیعت میں وجود میں آجانا ایک ایسا عمل نہیں ہوسکتا جو کسی سوچی سمجھی ترکیب کے بغیر محض ایک اتفاقی حادثہ ہو، بلکہ یہ ایک ایسی مخلوق ہے جو انتہائی پیچیدہ وحیرت انگیز حقیقت اور زندگی کا اولین ستون ہے۔اس لئے یہ قوانین ومقررات کے ایک ایسے سلسلے پر قائم ہے جو کرہ زمین کے ابتدائی ایام میں موجود تھا اور موجودہ دور میں ناپید ہو گیا ہے۔

ابتدائی دور میں زمین کے اندر زندگی کے شرائط

مثلاً آج سے تین ہزار سال قبل دس لاکھ ہیکٹر زمین قابل کاشت تھی اور صدیوں تک اس سے استفادہ ہوتا رہا۔لیکن

بعدازاں اس پر کھاری پانی کا سیلاب چڑھ آیا کہ جس سے اس کی مٹی کے تمام ذرات نمک آلود ہو گئے اور شورزمین کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ پس ہم یہی کہیں گے کہ پہلے تو یہ زمین کاشت کے قابل اور بیج کو پرورش دینے کے لائق تھی، لیکن اب وہ شورزمین میں تبدیل ہوگئی ہے۔ یہ امر واضح ہے کہ شورزمین کبھی بھی پیداوار نہیں دیتی، لہٰذا اس میں محنت اور زحمت کا بیج ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔ گویا کل کی قابلیت اور آج کی ناقابلیت کا معنی یہ ہے کہ زمین میں کسی بیج کی پرورش اور پودے کی نشوونما غیر منظم اور الٹ پلٹ طریقے پر منحصر نہیں، بلکہ یہ سلسلہ ایک منظم طریقہ کار اور قوانین کے تحت قائم ہے۔ چونکہ ہماری یہ زمین گزشتہ دور میں ان مقررات وقوانین کی حامل تھی، اس لئے بیج کو اپنی آغوش میں پروان چڑھانے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ لیکن اب شورزدہ ہوجانے کی وجہ سے ان قوانین ومقررات سے محروم ہوگئی ہے اور اس کی حالت بدل گئی ہے، لہٰذا پودوں اور بیجوں کی پرورش کے قابل نہیں رہی ہے۔

ایک غلط تصور

مادہ پرست یہ خیال کرتے ہیں کہ جس روز یہ بات ثابت ہوجائے گی کہ زمین کے ابتدائی ادوار میں زندگی نے خودبخود جنم لیا تھا، اسی روز ہمیں خدا پرست مکتب کے رد کی دلیل حاصل ہوجائے گی۔ کیونکہ ہم یہ کہہ سکیں گے کہ طبیعی مادوں کا باہم آمیختہ ہونا، زندگی کے مالیکیول کا بن جانا اور ایک زندہ موجود کا ازخود موجود ہوجانا ایک اتفاقی حادثہ ہے جو ایک نادان اور بے شعور طبیعت کے دامن میں وقوع پذیر ہوا اور اس کے پیچھے کسی قادر مطلق کا ہاتھ کارفرما نہیں ہے۔ حالانکہ وہ اس بات سے غافل ہیں کہ اگر کوئی ایسا دن آجائے اور ان کا یہ نظریہ ثبوت تک پہنچ جائے تو بھی خدا پرست اسی نظریئے سے اپنے مکتب کے حق میں استفادہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ اگر موجودہ دور میں کرہ زمین کا کوئی زندہ موجود ازخود وجود میں نہیں آتا اور ابتدائی دور میں ایسے حالات تھے کہ ایسا موجود خودبخود وجود میں آ گیا۔ تو یہی امر اسی چیز کی دلیل بن سکتا ہے کہ زندگی کی پیدائش عالم طبیعت کا ایک منظم اور مرتب عمل ہے اور اس کے لگے بندھے قوانین وقواعد ہیں۔ ان میں سے ہر قانون میں باقاعدہ نظم اور ترتیب ملحوظ خاطر رکھی گئی ہے اور جب بھی اس کے تمام شرائط متحقق ہوجاتے ہیں تو ایک زندہ موجود وجود میں آجاتا ہے۔ لیکن ان تمام قوانین کی بنیاد رکھنے والا، زندگی اور دیگر تمام طبیعی امور کو وجود بخشنے والا خداوند عالم کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔

ایک خاتون اپنی جوانی میں حاملہ ہونے کے تمام شرائط کی مالکہ ہونے کے باعث حاملہ ہوجاتی ہے اور پھر ایک بچہ جن دیتی ہے۔ لیکن وہی خاتون بڑھاپے کی عمر میں یائسہ ہوجاتی ہے اور اب اپنے شکم میں کسی بچے کی پرورش کی صلاحیت سے محروم ہوجاتی ہے کہ نہ حاملہ ہوتی ہے اور نہ بچہ جنتی ہے۔ پس کل تک اس کا حاملہ ہوسکنا اور آج کا نہ ہوسکنا یہ دونوں باتیں اس پروردگار حکیم کی نشانیاں، اساس توحید کی مئوید، اور اس حکیمانہ نظام آفرینش کے باقاعدہ اور منظم ہونے کی دلیل ہیں۔

اگر کسی دن اس کرہ زمین کے ابتدائی ادوار میں زندگی کے خودبخود پیدا ہوجانے کا مفروضہ ثابت ہوگیا تو مکتب توحید کے پیروکار خدا پرست یہ کہہ سکیں گے کہ خداوند حکیم نے کرہ زمین کو شروع ہی سے ایسے شرائط کے تحت خلق فرمایا تھا کہ اپنے ابتدائی دور میں

وہ یہ صلاحیت رکھتی تھی کہ بے جان مادے کو اپنی آغوش میں لے کر زندہ کردے، اس خاتون کے مانند کہ جو اپنی جوانی میں حاملہ ہونے اور بچہ جننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ لیکن موجودہ دور میں زمین کسی مادے کو خودبخود زندگی بخشنے کی صلاحیت سے اسی طرح محروم ہے کہ جس طرح وہ خاتون جو بوڑھی ہو جاتی ہے اور حمل ووضع کے قابل نہیں رہتی۔ پس جس طرح ایک عورت کی یہ دونوں حالتیں ایک حکیم کے وجود کی دلیل ہیں، اسی طرح کرہ ارض کی یہ دونوں طبیعی کیفیتیں اس خداوند حکیم اور خالق طبیعت کے وجود کی دلیل ہیں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام جو مکتب الٰہی کے عالی قدر رہبروں میں ایک عظیم رہبر ہیں، آپ نے انسانی بدن کے اعضا کی بناوٹ اوران کے حکیمانہ کردار پر مفضل سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا:

اذتأملتها واعملت فكرك فيها ونظرت وجدت كل شئيى منها قد قدر لشئيى على صواب وحكمة

جب تم ان اعضاء کا بغور جائزہ لوگے اوران کے افعال میں خوب فکر کروگے تو بڑی آسانی سے اس نتیجے تک پہنچ جاؤ گے کہ اس بدن کے تمام اعضاء کے درمیان بڑی دقت اور حکمت کے ساتھ تقسیم کار کی گئی ہے اور ہر عضو کے ذمے جو جو کام لگایا گیا ہے وہ اس کی بہترین صلاحیت رکھتا ہے۔

قال المفضل يا مولاى ان قوما يزعمون ان هذا من فعل الطبيهة فقال سلهم عن هذه الطبيعة اهى شيئى له علم وقدرة على مثل هذه الأفعال أم ليست كذالك فان اوجبو الها العلم والقدرة فما يمنعهم من اثبات الخالق فان هذه صنعة وان زعموا انها تفعل هذه الا فعال بغير علم ولا عمد وكان فى افعالها ماتراه من الصواب والحكمة علم ان هذا الفعل للخالق الحكيم وان الذى سموه طبيعة هو سنة فى خلقه الجارية على ما اجراها عليه[1]

مفضل نے عرض کیا: مولا! بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہ نظم وترتیب سب کچھ طبیعت ہی کا عمل ہے۔ امامؑ نے فرمایا: ان سے پوچھو کہ طبیعت کیا ہے؟ آیا طبیعت اپنے اس منظم ومرتب کام سے خود آگاہ ہے یا نہیں؟ کیا وہ اپنے ارادہ واختیار سے یہ کام کرتی ہے یا نہیں؟ اگر وہ اس کا مثبت جواب دیں گے اور کہیں کہ ہاں! طبیعت عالم اور قادر ہے، تو اب بتاؤ کہ ان کے لئے ایک ایسے خالق کو تسلیم کرنے سے کیا چیز سدراہ بنی ہوئی ہے، جو اس طبیعت کا خالق ہے اور یہ اس کی موضوع ہے۔ (یعنی وہ مان گئے کہ اس جہان کی ابتداء ایک عالم وقادر سے ہوئی ہے اور خدا پرست الٰہی لوگ بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں کہتے) لیکن اگر وہ لوگ منفی جواب دیں اور یہ گمان پیش کریں کہ طبیعت بدون علم وارادہ یہ کام کرتی ہے، جب کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس طبیعت نادان وبے شعور کا سارا عمل اعلیٰ درجے کی نظم اور حکیمانہ ترکیب پر مشتمل ہے۔ تب ہر بڑی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ اس پورے نظم وحکم کا اصلی مرکز ایک خداوند خالق

---

[1] بحارالانوار ج ۱ ص ۲۱

وحکیم ہے اور جس چیز کا نام ان لوگوں نے طبیعت رکھا ہوا ہے، وہ قانون ودستور کا نام ہے جو اس خالق حکیم نے اپنی ساری مخلوق کے لئے معین رکھا ہے اور اسی مطابق اس کائنات کی حرکت جاری ہے۔

نظام آفرینش میں الٰہی قانون

خلاصہ یہ کہ اگر کرۂ زمین کے ابتدائی ادوار میں زندگی کے خودبخو دوجود میں آجانے والا نظریہ ثابت بھی ہوجائے تو نہ فقط یہ کہ مکتب الٰہی کے منافی نہیں، بلکہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے فرمان کے مطابق وہ الٰہیون کا مئوید ہی ہوگا۔ کیونکہ بے شعور طبیعت خدا پرست الٰہیون کی نظر میں اس سنت وقانون الٰہی کا دوسرا نام آفرینش میں کارفرما ہے اور وہ اس کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے۔ لہٰذا اس ابتدائی دور میں زمین کے طبیعی مادوں کا باہم آمیختہ ہونا اور کیمیاوی مالیکیولوں کا وجود میں آنا کیا ہے؟ باالفاظ دیگر یہ پروردگار عالم کے اس قانون کا حرکت میں آجانا اور کام شروع کردینا اس جہان کے لئے مقرر فرمایا ہوا ہے۔

مسئلہ حیات اور اس کی باریک ترکیب اس قدر پیچیدہ۔ پوشیدہ اور حیرت انگیز ہے کہ عقل سلیم کی نظر سے یہ بات بالکل محال دکھائی دیتی ہے کہ یہ عجیب وغریب نظم وترتیب ایک بے شعور طبیعت کے ہاتھوں اتفاقی طور پر ایک بے ترتیب انداز میں وقوع پذیر ہوگیا ہو، عقل اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں دیکھتی کہ خود اصل زندگی اور پھر اس کے پرحکمت نظامات ایک حکیم ودانا پروردگار کی تخلیق ہیں۔ جب کہ طبیعت کے سارے قوانین ضوابط انہیں روشوں پر استوار ہیں جو اس رب حکیم ودانا نے اس جہان خلقت کے نظم کے لئے مقرر فرمائی ہیں اور اس جہان کو ان کے مطابق چلا رہا ہے۔

باایمان انسانوں کے اذہان کو اس نظام خلقت کے زندہ موجودات میں اللہ تعالیٰ کی حکمت کی نشانیوں کی طرف زیادہ سے زیادہ متوجہ کرنے اور اس جہان زندگی کے اندر موجود پیچیدہ حقائق سے مطلع کرنے کے لئے اس سلسلے میں ماہرین حیات شناسی کی تحقیقات سے چند ایک نمونے پیش کئے جاتے ہیں:

ہارورڈ یونیورسٹی کے حیات شناسی کے پروفیسر جارج والڈ لکھتے ہیں پروٹین کی تشکیل کے لئے سینکڑوں یا ہزاروں امائینو ایسڈ مالیکیولز مختلف نسبتوں اور گوناگوں اشکال کے ساتھ ایک طویل زنجیر کی صورت میں شاخ در شاخ یا تہ در تہ انداز سے ایک دوسرے سے باہم پیوست ہوجاتے ہیں۔ ان پروٹین کی اقسام واقعاً غیر محدود ہیں اور کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ شاید زندہ موجودات ان پروٹین سے استفادہ کرتے ہوں، کیونکہ ہمیں دونوع کے ایسے جانور ہرگز میسر نہیں آتے جن کے اندر ایک ہی طرح کے پروٹین موجود ہوں۔

جانوروں کا پیچیدہ بدن

بنابریں آبی مادوں کے مالیکیولز ایک ایسے عظیم گروہ کو تشکیل دیتے ہیں کہ ان کی اقسام لامحدود اور انکی پیچیدگی حیرت انگیز ہے۔ پروٹین کے بغیر کسی زندہ وجود کا تصور ناممکن ہے اور بنیادی اشکال بھی یہیں ہے۔ اس لئے کہ اگر ہم اس گتھی کو سلجھانا چاہیں کہ زندہ

فرد کیونکر وجود میں آیا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے یہ سمجھیں کہ یہ پیچیدہ مالیکیول کس طرح وجود میں آئے ہیں۔

ایک زندہ موجود چیز کو وجود میں لانے کے لئے نہ صرف لامحدود اقسام کے بہت زیادہ پروٹین چند خاص نسبتوں کے مطابق وجود میں لانا ضروری ہیں، بلکہ ان پروٹینوں کی صحیح ترتیب بھی ایک لازمی امر ہے۔ پھر اس مقام پر کیمیاوی ترکیب کے مطابق اس کے جسم کی عمارت کے وجود کا مسئلہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

پروٹین کی اپنی جسمانی ساخت بھی بذات خود بہت پیچیدہ امر ہے، آج تک انسان جو آلات اور مشینیں ایجاد کر چکا ہے، اگر ان میں پیچیدہ ترین مشینری ''مثلاً الیکٹرانک دماغ'' کا ایک زندہ شئی کے اندرونی نظام کے ساتھ مقابلہ کیا جائے تو وہ اس کے مقابلے میں ایک کھلونے سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔ یہاں مشکل کا باعث یہ امر ہے کہ جس مادے میں یہ پیچیدگی موجود ہے وہ مختلف اعتبارات سے ننھا سا یعنی ایک مالیکیولز کے برابر ہے وہ مالیکیولز باہر اس طرح لپٹے ہوئے ہیں کہ کوئی کیمیادان اور ماہر سائنس دان ان کو الگ کرنے پر قادر نہیں ہے۔ ایک شخص کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اس عمل کی عظمت پر غور و فکر کرے تا آنکہ ایک زندہ شئی کے خود بخود وجود میں آنے کا امکان اسکے سامنے واضح ہو جائے۔[1]

اگر اس کرہ زمین کے ابتدائی دور کے حالات میں مادوں کا خود بخود ترکیب پانا اور زندگی کے مالیکیول کا پیدا ہونا وقوع پذیر ہوا بھی ہو تو اس کا معنی یہ نہیں کہ ایک ایسا زندہ موجود وجود میں آیا جو تغذیہ، جذب اور دفع کی قدرت کا مالک تھا۔ کیونکہ جاندار شئی کا جسم اس قدر پیچیدہ اور گنجلک ہے کہ ہارورڈ یونیورسٹی میں حیات شناسی کا ماہر پروفیسر اسے حیرت انگیز اور تعجب آور کہتا اور اس کی تخلیق کی عظمت کو ایک زندہ جاندار کے خود بخود پیدا ہو جانے کے ناممکن ہونے کی دلیل بتا تا ہے۔

دربارِ الٰہی میں خضوع

ان موجودات کی حیرت انگیز ساخت میں غور و فکر کرنا اور ان کی حکیمانہ تخلیق کا اندازہ لگانا ایک ایسا امر ہے جو ہر منصف اور غیر متعصب سائنس دان کو خدا پرستی کی طرف کھینچتا اور اسے مجبور کرتا ہے کہ اس خالق قادر و حکیم کی عظمت کے سامنے عاجز ہو کر تعظیم کا سر جھکا دے۔

معروف انگریز طبیعات ڈارون کا دادا اور اٹھارہویں صدی کا مشہور ڈاکٹر اور سائنس دان ارا سم ڈارون کہتا ہے: یہ عالم ایک ناچیز ذرے سے آہستہ آہستہ مدارج کمال تک پہنچتا ہے، یعنی وہ ابتدائی توانائی جو اس کے اندر پائی جاتی تھی اس نے اسے بنایا۔ سنوارا اور آگے بڑھایا۔ اس سے ان تمام علتوں کی علت العلل اس بزرگ و برتر خالق کی لامحدود قدرت کا کس قدر عظیم تصور پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہم ان غیر محدود (مالیکیولوں) کو باہم متوازن کرنے پر قادر ہوتے تو بھی ہم اس امر کا اعتراف کرنے اور یہ بات ماننے پر مجبور ہو جاتے کہ اس طویل تخلیقی عمل کے پردے کے پیچھے ان معلومات کا انجام دینے والا ایک ایسا وجود موجود ہے جو واجب الوجود یعنی

---

[1] شناخت حیات ص ۱۱

ازخودموجود، بزرگ وبرتر اوران تمام علل ومعلولات کی ایجادکا باعث ہے۔[1]

حیات حیوانی کی نباتات سے وابستگی

کرہ زمین کے ابتدائی دور کے حالات میں زندگی کے خودبخود ظاہر ہوجانے کے نظریئے کوفرض کرنے سے محقق سائنس دانوں کے لئے ایک اورامر موردتوجہ قرار پایا اورایک خالق حکیم کے وجود پردلیل بنا ہے۔ وہ حیات حیوانی کا حیات نباتی کے ساتھ ارتباط ووابستگی اوروہ عجیب وغریب حکیمانہ توازن ہے جوخالق قادروحکیم کی طرف سے ارتباط کی تنظیم میں برقرار رکھا گیا ہے۔

حیات شناسی کے ماہر سائنس دان انتہائی تحقیق اور گہری سوچ بچار کرنے کے بعداس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پودے اورگھاس حیوانات کوزندگی مہیا کرنے والے مواد ہیں،کرہ ارض میں حیوانی زندگی کی بقاءنباتی حیات پرموقوف ہےاورگھاس پات کے وجود کے بغیرحیوان کی زندگی ناممکن ہے۔علم نباتات اورعلم البدن کے ماہر پروفیسر''رابی نوویج'' کہتے ہیں: فزیالوجی کی نگاہ میں تمام بری اور بحری جانوربشمول انسان چندناچیز اشیاء کاحکم رکھتے ہیں جونباتات کی اس عظیم کائنات کے طفیل زندہ ہیں۔اگرنباتات اوران پودوں میں قوت گویائی ہوتی اور یہ بولتے تو شایدان حیوانات کواسی نظرحقارت سے دیکھتے جس نظرسے ہم ان کیڑوں مکوڑوں کودیکھتے ہیں جو مثلاً کدووغیرہ کےاندر پیداہوجاتے ہیں اوران کی زندگی ان دوسری اشیاء کی مرہون منت ہوتی ہے۔

اس زمین یا کسی بھی دیگر سیارے میں نباتات کے بغیرزندگی کا وجود ناقابل تصور ہے،جس حدتک ہمیں معلومات حاصل ہو سکی ہیں۔ان کےمطابق فقط سبز پودے ہی زندگی کےضروری مادوں مثلاً پروٹین۔شکراور چربی کوغیرآبی مادوں اورسورج کی عام روشنی کی مدد سے تیارکرتے ہیں۔

یہ آخری تحقیق ہے جسے PHOTOSYNTHESIS کا نام دیا گیااوراس کودریافت کرنے والے ماہرین اسے میکرو سکوپ جیسی خوردبین کے ذریعہ بھی زیرتجربہ لانے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ یہ سرسبز درخت اورخوردبینی ذرات ہرروز یہ کام انتہائی مستعدی کے ساتھ بہت زیادہ مقدار میں انجام دیتے رہتے ہیں۔ ہماری اس زمین پر یہ پودے سالانہ ۱۵۰ میلیارڈٹن کاربن کو ہائیڈروجن کے ساتھ مرکب کرتے اوراور ۴۰۰ میلیارڈٹن آزادآکسیجن بناتے ہیں۔ان لوگوں کی تعداد بہت کم ہے جواس عظیم کیمیاوی عمل کانوے فیصد حصہ اپنی میکروسکوپوں اورخوردبینوں کے زیرنظرلا سکتے ہیں۔کیونکہ یہ عمل ان سمندری پانیوں کے نیچےانجام پاتا ہے،زمین پرفقط اس عمل کادس فیصدحصہ ان سبزیوں کے وسیلے سےانجام پذیرہوتا ہے۔''[2]

حیوانات اورنباتات کے درمیان اس ضروری ارتباط کی طرف توجہ کریں تومندرجہ ذیل سوالات سامنےآتے ہیں:

کیاسبب ہوا کہ کرۂ زمین کے ابتدائی ایام میں حیوانی اورنباتی خلئے وجودمیں آگئے؟

---

[1] دانستنی ہای جہان علم ص ۱۷

[2] شناخت حیات ص ۳۸

کس طرح ان دونوں قسم کے خلیوں کے گروہ ایسے حیاتی ارتباط میں بندھ گئے کہ ایک دوسرے کے بغیر رہ نہیں سکتے؟

اس کی کیا وجہ ہے کہ حیوانات ونباتات کے درمیان یہ رابطہ ایسے صحیح اور مناسب انداز سے برقرار ہوا کہ دونوں کو بڑی خوبی سے اپنی زندگی برقرار رکھنے اور اسے تسلسل بخشنے میں کامیابی حاصل ہوگئی؟

کیا ایک اتفاقی حادثے کو ان تمام سوالات کا جواب قرار دینے اور کرۂ زمین کے اولین دور کی فضا میں زندگی کے ازخود پیدا ہوجانے کی بات کرنے سے حاصل ہوسکتا ہے؟ اور کیا عقل سلیم اس جواب پر قانع ہوجاتی ہے؟

ایک غلط جواب

نیویارک کی سائنس اکیڈمی کا سربراہ ''موریسن'' کہتا ہے: یہ نامناسب نہ ہوگا کہ یہاں اس موضوع کی طرف اشارہ کردیا جائے کہ زمین میں زندگی کے ظہور کے وقت ایک عجیب اتفاق پیش آیا کہ جس نے زمین کے موجدات کی زندگی پر غیرمعمولی اثر مرتب کیا ہے۔ وہ یوں کہ ایک خلیہ اس عجیب خاصیت کا مالک بن گیا کہ سورج کی روشنی کے ذریعے چند کیمیائی تراکیب کو کام میں لائے اور اس عمل کے نتیجے میں اپنے اور دیگر خلیوں کے لئے غذائی مواد مہیا کرنے لگے پھر ان ابتدائی نسل کے خلیوں کی آئندہ نسلوں اور ان کے پوتوں پڑپوتوں نے ان غذاؤں سے استفادہ کیا جو ان کے بزرگان کے توسط سے تیار ہوئی تھیں۔ پھر انہوں نے حیوانات کی نسل کو وجود بخشا جب کہ کچھ دیگر خلیوں کی نسلیں بصورت نباتات ظاہر ہوگئیں اور انہوں نے اس دنیا کے پودوں کو تشکیل دیا اور اس طرح آج وہ اس زمین کی تمام مخلوقات کو غذا فراہم کررہی ہیں۔

آیا یہ امر قابل یقین پاسکتا ہے کہ محض اتفاقی طور پر ایک خلیہ حیوانات کی زندگی کی بنیاد بنا اور دوسرا خلیہ نباتات کی اصل واساس بن گیا؟

نیز سب سے زیادہ قابل توجہ وہ دقیق اور عجیب توازن ہے جو حیوانی اور نباتی زندگی کے مابین برقرار ہے، نبات اور حیوان کے درمیان خلیوں کی یہ تقسیم اصل زندگی کو سمجھنے کے لئے ایک بہت ہی عمدہ اور اساسی موضوع ہے کہ اس کے بغیر زندگی کا دوام پانا ایک غیرممکن امر قرار دیا جاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ اگر زندگی فقط حیوانات تک محدود ہوتی تو ساری آکسیجن مصرف میں آجاتی اور اگر زندگی بس نباتات تک ہی رہ جاتی تو زمین میں جو کاربن ڈائی آکسائیڈ تھی، وہ ساری کی ساری کام آجاتی۔۔ لیکن اس عمل کا نتیجہ ان دونوں طبقوں کی موت اور تباہی کی شکل میں نمودار ہوتا[1]۔

بہت عرصے کی بات ہے کہ عالمی اخبارات وجرائد بارہا یہ واویلا کرتے رہے ہیں کہ سائنس دانوں نے تجربہ گاہ میں ایک زندہ وجود بنانے میں کامیابی حاصل کرلی ہے۔ بلکہ کبھی کبھی توفن خبرنگاری کے ماہرین نے اس خبر کو اس قدر بڑھایا چڑھایا کہ قارئین یہ تصور کرنے لگے کہ واقعاً انسان اس بات پر قادر ہوگیا ہے کہ ایک اور انسان خلق کرلے یا ایک زندہ خلیہ وجود میں لے

---

[1] رازآفرینش انساں ص۵۹

آئے یا مختلف خلیوں کی ترکیب سے ایک نئی مخلوق تیار کر لے۔

ایسے موقع پر بے ایمان یا کمزور ایمان والے لوگوں کو موقع مل جاتا ہے اور وہ ایسے روزناموں کو متدین افراد کے پاس لاکر کہنے لگتے ہیں کہ آپ یہ تصور کرتے تھے کہ زندہ شئی کو پیدا کرنا اور زندگی بخشنا فقط ذات الٰہی کا کام ہے۔لیکن اب دیکھ لیجئے کہ سائنسی ترقی کے تحت خود ایک انسان بھی اس امر پر قادر ہو گیا ہے کہ ایک زندہ انسان یا ایک زندہ موجود کو پیدا کر دے۔مگر خدا کا شکر ہے کہ زیادہ دیر نہیں گزرتی کہ یہ واویلا ٹھنڈا پڑ جاتا ہے اور زندہ شئی بنا لینے والی خبر سرد خانے میں چلی جاتی ہے۔

کرۂ ارض میں زندہ موجودات کے وجود میں آنے اور زندگی کے ظہور کرنے کے متعلق چند بیانات پیش کئے گئے ہیں، میرے خیال میں ان کے ذریعے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ اس جہان طبیعت میں زندگی کے وجود کا مسئلہ اس قدر گنجلک او پیچیدہ ہے کہ کجا یہ بات کہ سائنس دان اور ماہرین ایک زندہ موجود کو پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے اور اس جہان کے بے جان عناصر کو زندگی بخشنے پر قادر ہو جاتے، وہ تو اس راز زندگی تک پہنچنے سے بھی عاجز رہ گئے ہیں۔لیکن آپ کی علمی معلومات میں اضافے کے لئے یہ مناسب رہے گا کہ آپ کو زندگی شناسی کے ماہر سائنس دانوں کی ان علمی اور عملی کاوشوں سے آگاہی حاصل ہو جائے کہ جو وہ ایک زندہ موجود بنانے کے لئے اب تک انجام دیتے رہے ہیں۔ چنانچہ اس موضوع سے مربوط چند ایک گزارشات بھی اختصار کے ساتھ پیش خدمت ہیں:

تقریباً گیارہ سال قبل اخبارات میں ایک مضمون کے ساتھ شائع ہوئی:

پیرس۔ ۱۴۔جنوری (ایجنسی فرانس پریس) آج اعلان ہوا ہے کہ پروفیسر ڈانیل جو کہ اٹلی کے زندگی شناسی کے مشہور سائنس دانوں میں سے ہیں، وہ اس تجربے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ مرد وزن کے نطفہ کی رحم مادر سے باہر ترکیب کریں اور اس سے ایک جنین پیدا کر کے مصنوعی طور پر اس کی پرورش کریں۔[۱]

اٹلی کے سائنس دان نے زور دے کر کہا ہے کہ میں نے جو فلم تیار کی ہے، وہ ٹھیک ٹھیک واضح کرتی ہے کہ تجرباتی ٹیوب کے اندر ایک (نطفہ) کس طرح (بچہ دانی) کے اندر وارد ہوتا ہے۔ چنانچہ اس سے جو تخم منعقد ہوا ہے وہ ۲۹ دن تک اس کے اندر نشوونما پاتا اور ترقی کرتا رہا ہے۔[۲] یہ جنین ۲۵ روز کے اندر اپنی مطلوبہ شکل پانے میں کامیاب ہوا ہے۔لیکن پھر ۲۹ روز کے بعد یہ تجربہ عمداً روک دیا ہے۔ کیونکہ احتمال تھا کہ اس جنین کو زیادہ پرورش دینے سے ایک خول وجود میں آجائے گا اور پھر اس کی نشوونما طبیعی ہو جائے گی۔ اس خبر سے معلوم ہوتا ہے کہ سائنس دان ابھی تک پوری طرح اس امر پر قادر نہیں ہوئے کہ انسانی نطفے کی پرورش کے لئے ضروری ماحول مہیا کریں اور انسانی بدن کے باہر اسے ایک نوزاد میں تبدیل کر لیں۔ بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ ابھی تک اس ادارے میں تغییر اشکال۔

---

[۱] روزنامہ اطلاعات شمارہ ۱۰۴۱۰۔ ۱۰۴۲۹

[۲] روزنامہ اطلاعات شمارہ ۱۰۴۱۰۔ ۱۰۴۲۹

ہارمون کے نفوذ اور دو انسانی نطفوں کے مابین پیش آنے والے حالات کے اسرار و رموز پوری طرح معلوم نہیں کئے جا سکے۔[1]

اٹلی کے اس سائنس دان کی تحقیق نے ایک عجیب عکس العمل مرتب کیا۔ اور اس قسم کی عبارتوں کے ساتھ خبریں بن بنا کر اخبارات و رسائل کی زینت بننے لگیں:

''بشر نے انسان سازی میں ہاتھ ڈال دیا''

''بشر نے زندہ موجود بنالیا''

''عنقریب تجربہ گاہ سے ایک نیا انسان ہمارے معاشرے میں قدم رکھنے والا ہے''

جاہلانہ زہرافشانیاں

نیز نوجوان متواتر خطوط اور ٹیلیفون کے ذریعے یہ سوال کرنے لگے کہ کیا اٹلی کے سائنس دان کے اس تجربے کے بعد بھی یہ کہنا ممکن ہے کہ فقط خداوند تعالیٰ ہی خالق بشر ہے؟ کیا اس تجربے نے قرآن شریف کی آیات پر ضرب نہیں لگا دی؟ اور اس طرح کے دیگر سوالات کئے جانے لگے۔

اس خبر کے نشر ہونے کے چند دن بعد مجھے ماہ رمضان المبارک کے اولین ایام میں بعض محافل میں خطاب کا موقع ملا تو میں اس موضوع کو زیر بحث لایا۔ چنانچہ میری اس تقریر کی تفصیل میری ایک کتاب ''کودک در بحث نظم طبیعی در موجودات زندہ'' میں پوری تشریح کے ساتھ شائع ہو چکی ہے، یہاں صرف اس کے ایک حصے کو نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

بعض جاہل اور بے دین افراد جن کا کام ہی جاہلانہ زہرافشانیاں کرنا ہے۔ وہ بعض اوقات سوء استفادہ کرتے ہوئے تعلیمات الٰہیہ پر حملہ آور ہونے لگتے ہیں۔ چنانچہ میں نے سنا ہے کہ اس مرتبہ وہ اس خبر سے سوء استفادہ کرتے ہوئے کہنے لگے ہیں کہ بشر خالق بشر بننے پر قادر ہو گیا ہے۔ اس طرح انہوں نے خدا پرست حضرات کے اس عقیدے پر ایک کاری وار کیا ہے کہ خاتصیت فقط حق تعالیٰ شانہ، سے مختص ہے، اس لئے ضروری ہے کہ اس موضوع سے مربوط چند جملے عرض کروں۔

مرغی کے ایک بچے کی پرورش یہ رہی ہے کہ انڈے کچھ دنوں تک مرغی کے پروں کے نیچے رہتے ہیں اور پھر ان انڈوں میں سے چوزے نکل آتے ہیں۔ چنانچہ چند سال قبل بعض لوگوں نے سوچا کہ ایک مشین میں مرغی کے پروں کے برابر درجہ حرارت پیدا کریں اور اس طرح چوزے نکلوالیں۔ اس پر تجربہ کیا گیا جو کامیاب ثابت ہوا اور آج یہ صنعت اتنی ترقی کر گئی ہے کہ انڈوں کو بذریعہ مشین چوزوں میں تبدیل کرا لیتے ہیں۔ لیکن آج اس امر پر قادر نہیں ہو سکا کہ ایک ایسا انڈہ ایجاد کر لے جو اپنے اندر چوزے کی نسل کشی والا خلیہ رکھتا ہو۔ یعنی وہ لوگ ایسے خلیئے ایجاد کرنے پر نہ قادر ہوئے اور نہ ہو سکیں گے، بلکہ وہ اسی طریقے سے انڈے حاصل کر سکتے ہیں جو خالق کائنات نے معین فرمایا ہے۔ یعنی انڈے مرغیوں سے ہی لیتے ہیں۔

---

[1] روزنامہ اطلاعات شمارہ ۱۱۰۴۱

آج اٹلی کے ایک سائنس دان نے مرد و زن کے نطفے کو ایک انڈے کی جگہ اسی طبیعی مقام سے حاصل کیا کہ جہاں یہ نطفہ بنتا ہے۔ پھر اپنی تجربہ گاہ میں ان نطفوں کو چوزہ مشین کی بجائے ایک اور مشین میں باہم آمیختہ کر دیا ہے۔ ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ چوزہ مشین کا کام مخصوص درجہ حرارت کی تنظیم ہے اور اٹلی کے اس پروفیسر کو اپنی تجربہ گاہ میں سینکڑوں ایسے اعمال انجام دینے پڑے ہونگے۔

مثلاً حرارت، رطوبت، مناسب ماحول، غذائی مواد، خلیئے کو غذا فراہم کرنا، اور اسی قسم کے کئی ایک دیگر ضروری عوامل کا انتظام کرنا پڑا ہوگا۔ ہاں یہ بات تو ہے کہ اس محقق نے علمی نقطہ نگاہ سے بہت ہی اہم اور قابل قدر کام کیا ہے، لیکن اس نے (نطفہ) اور تخم تو خود نہیں بنایا جو کچھ کیا ہے وہ یہ ہے کہ خلقت بشر کے لئے بنیادی شئی اور اساسی خلیہ اس نے دامن طبیعت سے اٹھایا ہے، یعنی یہ نطفہ قضاء الٰہی کی طرف سے جاری کردہ نظام کے تحت زن و مرد کے طبیعی آلات سے حاصل کیا ہے۔ پھر اس کو اپنی تجربہ گاہ میں باہم آمیزش دی، غذا پہنچائی اور تربیت کی ہے۔ اب اگر یہ کہنا جائز ہے کہ چوزہ مشین یا اس مشین کو تیل دینے والا یا اس میں مخصوص درجہ حرارت کا انتظام کرنے والا انسان اس چوزے کا خالق ہے تو پھر یہ کہنا بھی جائز ہوگا کہ مذکورہ پروفیسر صاحب اور ان کی تجربہ گاہ میں جنین کی خالق ہے؟ لیکن ایسا کہنا کیونکر ممکن اور جائز ہوسکتا ہے؟

گذشتہ سال زندہ موجود بنا لینے کے بارے میں ایک اور خبر شائع ہوئی اور اس کے تحت بھی لمبی چوڑی بحثوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ اس خبر کا خلاصہ یہ تھا، پروفیسر ''جیمز ڈانیلی'' ریاست نیویارک کی ''بوفالو'' یونیورسٹی میں سائنس دانوں کی جماعت کے تعاون سے ایک نئی دریافت میں کامیاب ہوئے اور انہوں نے مختلف قسم کے خلیوں کو باہم ترکیب دینے سے ایک نیا خلیہ تخلیق کر لیا ہے۔

ٹائمز اس خبر کو اس طرح نقل کرتا ہے:

یہ نیا خلیہ ہستہ (بیج) سٹیوپلاسم (سفیدہ) اور غشاء (جھلی) سے مرکب ہے، مختلف قسم کے خلیوں سے ان کے جداگانہ اجزاء لے کر ان سے ایک اور خلیہ تشکیل دیا گیا ہے۔ بالفاظ دیگر ''ڈانیلی'' اور اس کے دوستوں نے ایک خلیئے سے ''ہستہ'' لیا۔ دوسرے خلیئے سے ''سفیدہ'' لیا اور تیسرے خلیئے سے (غشاء) کو لیا اور پھر اپنی تجربہ گاہ میں مخصوص فضا قائم کر کے ''ہستہ'' کہ ''سفیدہ'' کے درمیان رکھا۔ پھر ان دونوں کو ''غشاء'' کے اندر پوشیدہ کر دیا اور اس کے نتیجے میں وہ ایک نیا زندہ خلیہ بنانے میں کامیاب ہوگئے۔[1]

اب سوال یہ ہے کہ کیا پروفیسر جیمز ڈانیلی اور اس کے معاونین ہی وہ اولین گروہ ہے جو اس اہم ترین کام کو انجام دینے اور ایک تجربے کے ذریعے چند خلیوں کے اجزاء کو ملا کر ایک جدید خلیہ بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں یا ان سے قبل بھی کوئی گروہ اس راستے میں قدم بڑھاتا رہا ہے؟ اس سوال کا جواب خود اخبار ٹائمز ان الفاظ میں دیتا ہے:

یہ پہلا موقع نہیں کہ چند خلیوں کے مختلف اجزاء حاصل کر کے ایک نئے خلیہ کی صورت میں پیش کیے گئے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ پروفیسر ڈانیلی اس راہ میں وارد ہونے والا اولین فرد نہیں ہے، اس سے پہلے بھی یہ تجربہ ہوتا رہا ہے اور (آکسفورڈ) یونیورسٹی کے

---

[1] روزنامہ کیہان شمارہ ۸۲۰۰

انگریز سائنس دان اس سلسلے میں شاندار تجربے کرتے رہے ہیں۔[۱]

اب اگر یہ کاوش کسی قطعی نتیجے تک پہنچ جائے اور چند مختلف خلیوں کے مواد کی ترکیب سے ایک ایسا نیا زندہ خلیہ وجود میں آ جائے کہ جو غذا بھی حاصل کر سکے اور خلیوں کی تقسیم کی بنیاد پر ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا جائے تو اس کا یہی نتیجہ مرتب ہوگا کہ عالم نباتات یا عالم حیوانات میں ایک نئی قسم کا ایسا زندہ فرد پیدا ہو جائے گا جو اس سے قبل دنیا میں نہیں ہوا کرتا تھا۔

مثلاً اگر ناشپاتی کے خلئے کا بیج (گیلاس) کھٹے کے خلئے کا سفید اور مالٹے کے خلئے کی جھلی یہ تینوں باہم ملا دیئے جائیں اور اس ترکیب سے ایک نیا خلیہ وجود میں آ جائے اور غذا لے کر نشوونما پانے لگے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ایک نئی قسم کا پھل ہمیں مل جائے گا جو نہ ناشپاتی ہے، نہ کھٹا ہے، اور نہ مالٹا بلکہ ایک ایسا جدید پھل ہے جس میں ان تینوں کے اجزا شامل ہیں۔

اسی طرح اگر بھیڑیئے کے خلئے کا بیج، چیتے کے خلئے کا سفیدہ اور شیر کے خلئے کی جھلی کو باہم ملا دیا جائے اور ایک نیا خلیہ وجود میں آ جائے اور زندہ بھی رہ جائے تو وہ اپنی تکثیر و نشوونما کے نتیجے میں ایک چوتھی قسم کے نئے حیوان کی شکل میں ہوگا کہ جو نہ بھیڑیا ہے، نہ چیتا اور نہ شیر، بلکہ ان سب سے مل کر بنا ہوا ایک جداگانہ حیوان ہے۔

پروفیسر ''جیمز ڈانیلی'' کہتے ہیں: ہماری یہ کوشش ایک نئے دور کی راہ کھولنے کے مترادف ہے یعنی تجربہ گاہ کے ذریعے زندہ موجودات کا دور۔ مثلاً ہم اس امر پر قادر ہو جائیں گے کہ ایسے جدید خوردبینی گھاس اور پودے، پھر ایسے نئی قسم کے انسان بنا لیں جو مریخ اور اس قسم کے دیگر آسمانی کرات میں بآسانی زندگی گزار سکیں۔[۲]

ایک ناکام کوشش

سوال: پروفیسر ڈانیلی اور اس کے معاونین اپنی اس علمی اور عملی کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوئے؟ انہوں نے چند ایک خلیوں کے اجزاء کی ترکیب سے جو نیا خلیہ بنایا تھا، کیا وہ زندہ رہا۔ غذا حاصل کی اور نشوونما پانے میں کامیاب ہو گیا؟ مختصر یہ کہ کیا اس گروہ نے اپنی تجربہ گاہ میں متعدد تجربات کے نتیجے میں کرۂ ارض کے موجودات میں کسی نئی قسم کے زندہ موجود کا اضافہ کیا یا نہیں؟

جواب: پروفیسر ڈانیلی کہ جس نے اپنی ان مہنگی تحقیقات کو پانچ سال تک جاری رکھا اور ادارۂ ''ناسا'' یعنی امریکہ کے خلائی اور فضائی تحقیقات کے قومی ادارے کے سرمائے کا ایک بڑا حصہ بھی اس پر صرف کرتا رہا۔ ایک دفعہ نیویارک میں اپنے انٹرویو میں اس نے کہا کہ میں اس سلسلے میں دو ہفتوں تک اپنی گہری تحقیقات عوام کے سامنے پیش کروں گا۔[۳]

لیکن اب دو سال گزر گئے ہیں اور پروفیسر موصوف کا وہ دو ہفتوں والا وعدہ ابھی تک پورا نہیں ہوا۔ ان کی کوئی تازہ اطلاع

---

[۱] روزنامہ کیہان شمارہ ۸۲۰۰

[۲] روزنامہ کیہان شمارہ ۸۱۹۸۔ ۸۲۰۰

[۳] روزنامہ کیہان شمارہ ۸۱۹۸۔ ۸۲۰۰

ابھی تک اخبارات کوموصول نہیں ہوئی اور ایک نئے زندہ موجود کا لم کائنات میں پیش کرنے والی خوشخبری اب آہستہ آہستہ فراموشی کے سرد خانے میں چلی گئی ہے۔ اس سکوت اور طویل خاموشی سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ دراصل ان کی تحقیقات وتجربات شکست کھا گئے اور وہ ایک نئے زندہ خلیئے کو محفوظ رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

اخبار ٹائمز نے انہیں ایام میں جو لکھا حیاتیات کے سارے ماہرین اور سائنس دان جو اس تحقیق وتلاش میں مشغول رہے ہیں۔ وہ سب بیک آواز یہی کہتے ہیں کہ تجربہ گاہ میں ایک زندہ موجود کا خلق کرنا مشکل ہے یا کم از کم دور حاضر کے انسان کے علم کی حدود سے باہر ہے۔ البتہ بوبالو یونیورسٹی کے ماہرین کا نظریہ ہے کہ انسان دس سے بیس سال تک تجربہ گاہ میں ایک زندہ موجود کو خلق کرنے پر قادر ہو جائے گا۔ [۱]

دوخلیوں کو پیوند کرنا

نباتات یا حیوانات کے دوخلیوں کو ایک دوسرے سے پیوند کر کے ایک تیسرے زندہ موجود کو حاصل کرنے کا عمل تو اپنے طبعی طریقے سے باغبانی اور گوسفند پروری کرنے والوں کے ہاں کافی عرصے سے جاری ہے۔ بہت پرانے زمانے سے یہ طریقہ چلا آرہا ہے کہ ایک پھلدار درخت کو دوسرے پھلدار درخت سے پیوند کر کے ایک تیسری قسم کا پھل حاصل کر لیتے ہیں۔ نیز گدھے کو ایک گھوڑی سے ملا کر خچر پیدا کرا لیتے ہیں۔ لیکن اس صورت میں کوئی یوں نہیں کہتا کہ اس پھل کا خالق باغبان یا اس حیوان کا خالق یہ جفتی کرانے والا ہے۔

روز نامہ ''اطلاعات'' میں ایک حیوان کو دو طرح کی تصویروں کے نیچے لکھا گیا:

یہ اس حیوان کی تصویر ہے جو ایک کتے اور بلی کے باہمی ملاپ سے پیدا ہوا ہے۔ اس کا نصف حصہ بلی سے اور دوسرا نصف کتے سے مشابہت رکھتا ہے۔ یہ حیوان چوہا بھی پکڑتا اور گوشت کی ہڈی سے بھی لطف اندوز ہوتا ہے۔ نیز کبھی میاؤں میاؤں کرنے لگتا ہے اور کبھی بھونکنے لگتا ہے۔ اخبار کی دو تصویروں میں سے ایک میں یہ کیفیت دکھائی گئی ہے کہ اس نئی قسم کے حیوان نے اپنے پنجے میں ایک چوہے کو پکڑ رکھا ہے اور وہ چوہا صاف نظر آ رہا ہے۔ [۲]

پس اگر پروفیسر ڈانیلی اور ان کے تحقیقاتی معاونوں کی کوششیں بارآور ہو جائیں اور وہ آئندہ بیس سال تک کسی یقینی نتیجے تک پہنچنے میں کامیاب بھی ہو جائیں۔ یعنی خلیئے کے تین مختلف اجزاء کی باہمی پیوندکاری سے ایک نیا زندہ خلیہ وجود میں آجائے اور وہ اسے غذا دے کر اس کی نشوونما کر لیں اور اس طرح ایک نیا اور تازہ زندہ اور بے نظیر موجود وجود میں آجائے۔ کیا اس وقت یوں کہنا درست ہو گا کہ پروفیسر اور اس کے معاونین نے زندگی کو پیدا کر لیا ہے؟ آیا یہ بات کہنا صحیح ہو گی کہ وہ خالق حیات ہو گئے ہیں؟ جبکہ حقیقت یہ

---

[۱] روز نامہ کیہان شمارہ ۸۲۰۰

[۲] روز نامہ اطلاعات شمارہ ۱۳۳۶۸

ہے کہ اصل خلئے خدائی نظام کے مطابق اس عالم طبیعت کے دامن میں پیدا ہوئے اور وہ زندگی رکھتے تھے۔ اب اگر پروفیسر اتنا کام کر لے کہ ان کے زندہ اجزاء کو ادھر ادھر کرلے، بایں طور کہ ان کی زندگی برقرار رہے۔ تو یوں کہنا چاہئے کہ اس جدید خلئے کی زندگی کی خالق بھی وہی ذات ہے جس نے اصلی خلیوں کو زندگی بخشی ہے،، نہ کہ پروفیسر اس زندگی کا خلق ہے۔ اسی طرح اگر ان خلیوں کے اجزاء کو ادھر ادھر کرتے ہوئے یہ خلئے مر جائیں اور ان کی زندگی ختم ہو جائے تو یہاں یہ نہیں کہا جائے گا کہ پروفیسر ایک زندہ موجود کو خلق نہ کر سکا، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ سائنس دانوں کے اس گروہ نے اپنی تجربہ گاہ میں چند زندہ خلیوں کو قتل کر دیا ہے اور اپنے ہدف تک پہنچنے سے قاصر ہیں۔

فرانسیسی خبر رساں ایجنسی کے سربراہ کہتے ہیں: مصنوعی زندہ خلئے کی ایجادی خبر کے بارے بہت زیادہ احتیاط سے کام لینا چاہئے کہ ایک زندہ خلئے کی ایجاد کے لئے دو راہوں کی پیش گوئی کی جاسکتی ہے۔

۱۔ کیمیائی عناصر کی مختلف اقسام کی مدد سے ایک خاص قسم کے عنصر کو دوسری قسم کے عنصر کے ساتھ پیوند کیا جائے اور اس سے نتیجہ حاصل کیا جائے تو یہ عمل تجربہ گاہوں میں کئی بار انجام دیا جاتا رہا ہے اور پروفیسر ڈانیلی کی کوشش بھی اسی قسم کی ہے۔ جیسا کہ اس انٹرویو سے معلوم ہوتا ہے جو اس نے ریڈ بولندن کے ذریعہ ٹیلیفون دیا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ان کی کوشش سابقہ کی نسبت زیادہ پیچیدہ اور دقیق ہے۔

۲۔ ایک زندہ خلئے کو وجود میں لانے کی دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ سادہ کیمیائی عناصر کی ترکیب سے ایک زندہ خلیہ بنایا جائے۔ لیکن اس بارے میں زندگی اور حیاتیات کے ماہین کی اکثریت کا کہنا ہے کہ کیمیائی عناصر کی ترکیب سے ایک زندہ خلئے کی ایجاد موجودہ حالات میں ناممکن ہے۔ [1]

پروفیسر ''ڈانیلی پٹروچی'' نے نطفہ اور بچہ دانی کو ایک تجرباتی ٹیوب میں پیوند کرنے کی جو تحقیقی کاوش انجام دی اور اس طرح پروفیسر ''جیمز ڈانیلی'' اور ان کے معاونین نے چند خلیوں کے اجزاء کو باہم جوڑ کر ایک چوتھا خلیہ ایجاد کرنے کی جو انتہائی دقیق سعی انجام دی ہے، وہ فرانسیسی خبر رساں ایجنسی کے سائنسی نامہ نگار کے مطابق ایک خلئے کو دوسرے خلئے سے پیوند کرنے کے مترادف ہے۔ بالفرض ان صاحبان کی یہ کوشیش سو فیصد مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں، جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ یہ دور پروفیسر صاحبان زندگی اور حیات خلق کرنے لگ گئے ہیں۔ بلکہ ان کی اس محنت کا نتیجہ یہی ہوگا کہ ان لوگوں نے خدکی ان طبیعی زندہ اشیاء سے ایک نیا استفادہ کرلیا ہے۔

خلیہ سازی

دوسرا طریقہ کہ جس کی نشان دہی فرانسیسی خبر ایجنسی کے سائنسی نامہ نگار نے اس طرح کی ہے کہ اگر دانش ور اور سائنس دان

---

[1] روزنامہ کیہان شمارہ ۸۱۹۸

حضرات قوانین طبیعت کی تقلید کرتے ہوئے ایک مردہ مادے پر اس سائنسی اصول کے تحت عمل کریں جو ان کیمیاوی عناصر میں ایک خلئے کی ایجاد میں کارفرما ہے یعنی وہ اس عمل کے مشابہ عمل بجالا کر یہ چاہیں کہ اس مردہ موجود کے اندر زندگی ایجاد کرلیں۔ اگرچہ نامہ نگار موصوف نے تصریح کردی ہے کہ علم الحیات کے اکثر ماہرین کی رائے یہی ہے کہ موجودہ حالات میں ایسا کرنا ناممکن ہے۔لیکن ایسے عمل کی کامیابی سے بھی قرآنی آیات کو کسی قسم کا تزلزل لاحق نہیں ہوتا اور نہ عقیدۂ توحید کی بنیاد پر کوئی ضرب لگتی ہے۔تاہم اس امر کا یقین دلانے کے لیے ہم اس بارے میں کچھ مزید توضیح بھی پیش کئے دیتے ہیں:

نظم تکوینی

یہ کاخ وجود اس کائنات کا سارا ڈھانچہ اور ہماری یہ زمین جو اس جہان کے اندر ایک انتہائی چھوٹا سا مقام رکھتی ہے، یہ سب کچھ ایک انتہائی مربوط اور سوچے سمجھے نظام کے تحت خلق کیا گیا ہے۔ پھر اس کی بقاء و استواری کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس کی اساس انتہائی محکم اور حکیمانہ قوانین کے مطابق جاری ہوتے ہیں کہ جن کو خود اللہ تعالیٰ نے اپنے حکیمانہ فیصلے سے معین فرمایا ہے۔

قرآن شریف نے اس عظیم حقیقت کو مختلف تعبیرات کے ساتھ بیان فرمایا اور اس جہان خلقت کے نظم و ترتیب میں منظم حکیمانہ قوانین کا ذکر کیا ہے جو پروردگار عالم نے تمام مظاہر ہستی میں ملحوظ رکھے ہیں۔اللہ تعالیٰ اس حکیمانہ نظم و ترتیب کا تذکرہ اپنے کلام پاک میں گوناگوں عبارات کے ساتھ واضح فرماتا ہے، چنانچہ اس سلسلے کی چند آیات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے:

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَٰهُ بِقَدَرٍ ﴿٤٩﴾ [1]

ہم نے ہر شئی (اس جہان کی تمام موجودات) کو ایک نظام کے ساتھ پیدا کیا ہے۔

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ﴿٧﴾ [2]

خداوند تعالیٰ نے آسمانوں (کے عظیم محلات) کو بلند کیا اور ان کے اندر نظم برقرار رکھنے کے لئے موزون اور مناسب قوانین وضع فرمائے۔

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ﴿٥﴾ [3]

اور سورج اور چاند (اس باعظمت آسمان میں) ایک خصوصی حساب کے ساتھ موجود ہیں۔

فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا ۖ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيلًا ﴿٤٣﴾ [4]

---

[1] سورۂ قمر آیت ۴۹

[2] سورۂ رحمن آیت ۷

[3] سورۂ رحمن آیت ۵

[4] سورۂ فاطر آیت ۴۳

الٰہی قوانین ودستورات جو اس جہان ہستی میں اس نے جاری فرمائے ہیں وہ اسقدر ثابت اور لازم ہیں کہ تو ان میں ہرگز تبدیلی نہ دیکھے گا۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝[1]

اور ہم نے آسمان۔ زمین اور ان کے درمیان کے تمام موجودات کو بے جوڑ اور بازیچہ کے طور پر پیدا نہیں کیا۔

خرامیدن لاجور دی سپہر
ہمی گرد گردین ماہ و مہر

''نیلے آسمان کا گردش کرنا اور سورج چاند کا ارد گرد گھومنا''

مپندار ازروی بازی گری است
سراپردہ آنچنین سرسری اسب

یوں نہ سمجھنا کہ یہ سب کچھ فقط بازی گری اور ایک کھیل تماشا ہے اور یہ کوئی معمولی سا محل و منزل ہے۔

دریں پردہ یک رشتہ بیکار نیست
سر رشتہ برما پدیدار نیت

اس پردۂ کائنات کا کوئی بھی شعبہ بیکار نہیں ہے اور اس کی حقیقت دراصل ہمارے سامنے روشن نہیں ہوئی ہے۔

نہ زین رشتہ سر میتوان تافتن
نہ سر رشتہ رامیتوان یافتن

نہ اس راز کے وجود سے انکار کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس راز کی حقیقت کو مکمل طور پر دریافت کیا جاسکتا ہے۔

انسان کی ترقی کا معیار

انسان کی ترقی کا معیار اور اس کی عملی پیشرفت کا ذریعہ اس جہان کے قوانین کو سمجھنا اور اس عالم کے اسباب وعلل کی آگاہی حاصل کرنا ہے۔ چنانچہ انسان طبیعت کائنات کے اسرار پر جتنا زیادہ آگاہ ہوتا جاتا ہے، اسی قدر ترقی کرتا جاتا ہے۔ وہ نظام خلقت میں جاری الٰہی قوانین کی جتنی زیادہ معلومات حاصل کر لیتا ہے، اتنی ہی زیادہ بلندیاں اس کے حصے میں آجاتی ہیں۔ کیونکہ اس کے ذریعے وہ طبیعت کے اندر پنہاں خزانوں سے بیش از بیش استفادہ کرنے پر قادر ہوتا جاتا ہے۔

---

[1] سورۂ انبیاء آیت ١٦

رسل کہتا ہے: زمانہ قدیم میں ایک فرد انسانی کے سالانہ اخراجات کے لئے ایسی دومربع میل زمین کی ضرورت تھی جو ازحد زرخیز اور طبعاً پیداوار دینے والی ہو۔لیکن آجکل ہمارے وطن انگلستان میں ایک مربع میل کا رقبہ ۷۶۰ نفوس کی معاشی ضروریات کو پورا کرنے میں کفایت کرتا ہے۔یعنی صنعتی اختراعات نے بشر کی استعداد میں اس بے سروسامانی کے دور کی نسبت پانچ سوگنا اضافہ کردیا ہے، البتہ واضح ہے کہ یہ کیفیت بہت حد تک صنعت کے ساتھ وابستہ ہے۔[۱]

زرعی زمین سے بہرہ برداری کا یہ تفاوت بنیادی طور پر اس تفاوت کی بنیاد پر ہے جو کل اور آج کے عوام میں قائم ہوا ہے۔ قدیم زمانے کا انسان زراعت کے اسرار و رموز اور کاشتکاری کے علمی ذرائع اور وسائل سے آگاہ نہ تھا، اس لئے وہ زمین سے کچھ زیادہ فائدہ اٹھانے سے قاصر تھا۔لیکن آج کے دور کا انسان علم و دانش میں پیش رفت کر چکا ہے اور اس عالم طبیعت کے رموز سے واقف ہو چکا ہے۔اس نے خود کو مشینی آلات سے مسلح کر لیا ہے، اس لئے وہ گزشتہ ادوار کی نسبت کئی سوگنا زیادہ پیداوار زمین سے حاصل کر لینے پر قادر ہے۔

بشر اور تسخیر کائنات

قرآن مجید میں ایسی متعدد آیات موجود ہیں کہ زمین اور آسمانوں کے خداوند بزرگ نے ان کو اور ان کے درمیان سورج۔ چاند۔دریا۔نہریں اور ان کے علاوہ جو کچھ ہے، سبھی کو بشر کے لئے مسخر کردیا ہے۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ [۲]

کیا تم لوگوں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کے درمیان جو کچھ ہے، یہ سب کچھ تمہارے لئے مطیع و مسخر کردیا ہے۔

تسخیر کا لغوی معنی ہے تابع کرنا اور مغلوب بنا دینا۔یعنی خداوند عالم نے زمین کی تمام موجودات کو بشر کے سامنے تابع اور مغلوب بنا دیا ہے۔

مفردات راغب میں لکھا ہے:

التسخیر سیاقة الی الغرض المختص قهرا

تسخیر کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی ایک مسخر موجود کو اپنے قہر و غلبہ کے ساتھ اپنے مخصوص ہدف اور مقصود کی طرف لے چلے اور اس کو اپنے میلانات کے تابع اور اپنی خواہش کا مطیع بنا لے۔

صرف انسان ہی ایک ایسا لائق اور شائستہ موجود ہے کہ پروردگار عالم نے اس ارض میں تنہا اسی کو اس عظیم افتخار کے لئے منتخب فرمایا ہے۔یعنی اس خالق قدیر نے آسمانوں۔زمین اور ان کے مابین تمام اشیاء کو تمام انسانوں کے لئے مسخر اور مطیع کردیا ہے۔

---

[۱] امید ہای نو، ص ۳۶

[۲] سورۂ لقمان آیت ۲۰

علم وعمل کا ہتھیار

جالب ترین نکتہ یہ ہے کہ بشر اپنی عقلی ساخت اور طبیعی استعداد کے لحاظ سے کچھ اس طرح تخلیق کیا گیا ہے کہ آسمانوں۔ زمین اور ان کے مابین تمام اشیاء کو تسخیر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ البتہ اگر یہ ان ارضی اور سماوی موجودات کو عملاً تسخیر میں لینا چاہتا ہے تو ضروری ہے کہ وہ علم اور عمل کے اسلحہ سے خود کو آراستہ کرے اور اپنی عقل وفکر کو زیادہ بہتر طریقے سے تکمیل کرے۔ اس حکیم مطلق نے بشر کی ذات کے اندر جس قدر استعداد اور صلاحیت پیدا کر رکھی ہے وہ اسے بڑھائے اور کام میں لائے تاکہ وہ عملاً اس عالم طبیعت پر اپنی حکمرانی قائم کر سکے اور آسمانوں اور زمین کی تمام اشیاء کو مسخر اور تابع بنا سکے۔

حق حاکمیت کا استعمال

اس کرہ ارض کے اندر موجود خزائن میں سے ایک خزانہ تیل ہے جو بامر خداوندی بشر کے لئے مسخر دیا گیا ہے۔ دور حاضر کے وہ انسان جنہوں نے خود کو علم اور مشینی وسائل سے مسلح کر دیا، وہ اس کو تسخیر کرنے میں کامیاب ہو گئے اور اب اپنی ہمت اور خداداد حق حاکمیت سے اس کو استعمال کر رہے ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو ابھی تک علمی سرمائے اور عملی وسائل سے محروم رہے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ حق تسخیر کو استعمال میں لانے سے قاصر ہیں اور ان خزائن سے فائدہ نہیں اٹھا سکے۔

طبیعی ذخائر سے استفادہ

اسی طرح برقی توانائی بھی اس زمین میں خداوند عالم کی پیدا کردہ کارآمد اشیاء میں سے ایک ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے مسخر اور تابع قرار دیا ہے۔ لیکن سب جانتے ہیں کہ یہ برقی قوت ایک ماہر برقیات کے ہاتھوں میں تو مسخر ہے، وہ اسے جہاں چاہے لے جا سکتا ہے اور وہ اسے جو حکم دیتا ہے وہ بلا چون و چرا اس کی تعمیل کرتی ہے۔ لیکن ایک ایسا انسان جو قواعد برق سے باخبر اور ان سے شناسا نہیں وہ اس حق تسخیر سے استفادہ نہیں کر سکتا جو اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا فرمایا تھا۔ بلکہ عین ممکن ہے کہ ایسا شخص اپنی معمولی غفلت کے باعث اسی بجلی کے ہاتھوں موت کی آغوش میں چلا جائے اور اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

بشر اس زمین کے ذخائر سے مختلف صورتوں میں فائدہ اٹھاتا ہے، کبھی تو ہوا میں سانس لے کر، پانی کو پی کر اور پھل سبزیاں کھا کر ان سے طبیعی انداز میں فائدہ اٹھاتا ہے اور کبھی ان میں معمولی تبدیلی اور تصرف کر کے مثلاً مچھلی کو شکار کرتا ہے، گوسفند کو ذبح کرتا ہے اور گندم کا آٹا بناتا ہے۔ پھر ان کو پکاتا ہے اور اس طرح ان کو اپنے فائدے کے لئے تیار کرتا اور استعمال کرتا ہے۔

ان زمینی ذخائر سے بعض اشیاء سے استفادہ کرنے کے لئے انسان کو ان میں کچھ بنیادی تبدیلیاں بھی لانا پڑتی ہیں۔ مثلاً فولادی پتھر اور پتھر کے کوئلے ہر دو کو کان سے نکال لاتا ہے۔ اور پھر انتہائی مشکل علمی طریقے سے لوہے کو اس کوئلے میں ڈال کر پگھلاتا اور اس کو لوہے کی ایک چادر یا سلاخ کی شکل میں ڈھال لیتا ہے۔ کبھی اس میں دیگر معدنی دھاتیں یا زمین کی دیگر غیر معدنی چیزیں ملا کر

اس سے کوئی مشین، کشتی، بحری جہاز، ہوائی جہاز یا اس قسم کی دیگر اشیاء تیار کر لیتا ہے۔

زمین کے ان ذخائر سے حاصل ہونے والی ان تمام اشیاء سے انسان جو بہرہ برداریاں کرتا ہے، وہ طبیعی شکل میں ہوں یا مصنوعی انداز میں اور بنیادی تبدیلی کے ساتھ ہوں یا معمولی تبدیلی سے قرآن ان تمام بہرہ برداریوں کو آیات تسخیر میں قرار دیتا اور ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف دی گئی اجازت کے زمرے میں شمار کرتا ہے۔

اس بحث پر مزید روشنی ڈالنے کے لے آیات تسخیر میں سے دو آیات کو زیر غور لانا مناسب رہے گا۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيْهِ بِاَمْرِهٖ [1]

اللہ تعالیٰ کا امر تکوین

اللہ تعالیٰ ہی وہ ہستی ہے جس نے تمہارے لئے سمندر کر مسخر کر دیا ہے تاکہ اس میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ کشتیاں حرکت کر سکیں۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ [2]

اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے کشتیوں کو مسخر کر دیا ہے تاکہ وہ سمندر میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ چل سکیں۔

ان دو آیات میں سے پہلی میں خداوند عالم فرماتا ہے: اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے سمندر کو مسخر کیا جب کہ سمندر ایک طبیعی مخلوق اور اس کرۂ زمین کے اندر موجود اشیاء میں سے ایک شئی ہے۔ سمندر کو اس لئے مسخر کیا ہے کہ اس میں کشتیاں چل سکیں۔ لیکن ان کشتیوں کی حرکت اس خدا کے فرمان کے تحت ہوتی ہے۔

چنانچہ اب یہاں دو سوال سامنے آتے ہیں۔

پہلا سوال: قدیم زمانے کی کشتیاں ہوا۔ بادبان اور ملاح کی طاقت سے چلا کرتی تھیں اور دور حاضر میں یہ کشتیاں یا بحری جہاز موٹر۔ پنکھوں کی حرکت اور کپتانوں کے فرمان سے حرکت کرتی ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان اشیاء کے نتائج کو اپنی طرف کیوں نسبت دی ہے اور اس طرح فرمایا ہے کہ یہ کشتیاں سمندر میں میرے حکم سے حرکت کرتی ہیں؟

جواب: پرانے اور نئے دور ہر دو میں کشتی یا بحری جہا کی حرکت ان طبیعی قوانین اور عمومی مقررات تخلیق کے مطابق ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں معین فرمائے ہیں۔ مثلاً اگر ہوا نہ ہوتی، ہوا کا چلنا نہ ہوتا، کشتی کا پردہ ہوا کو نہ روک سکتا، ہوا کا رکنا دباؤ پیدا کرنے کا باعث نہ بنتا اور ہوا کے دباؤ کی طاقت پانی پر غلبہ حاصل نہ کر سکتی۔ تو پرانے زمانے کی کشتی کبھی بھی پانی میں حرکت نہ کر سکتی۔ اس طرح اگر لوہا ایک طبیعی دھات کی شکل میں خلق نہ کیا گیا ہوتا۔ تیل پیدا نہ ہوا ہوتا، تیل کی گیس دباؤ پیدا نہ کر سکتی، گیس کا

---

[1] سورۂ جاثیہ آیت ۱۲

[2] سورۂ ابراہیم آیت ۳۲

دباؤ سلنڈروں کی گیس کو حرکت نہ دے سکتا، ان اسباب سے کشتی کی چرخیاں اور پنکھے حرکت میں نہ آتے اور پانی کا سینہ چیرنے میں کامیاب نہ ہو سکتے تو واضح ہے کہ دور حاضر کے تمام بحری جہاز اور کشتیاں کبھی بھی حرکت نہ کر سکتیں۔

پس معلوم ہوا کہ ہر کشتی با مر خدا حرکت کرتی ہے۔ یعنی اللہ تعالی نے اس کائنات کا نظام جن قوانین کی بنیاد پر قائم فرمایا اور جو قوانین اس پر حاوی کئے ہیں، یہ کشتیاں انہیں کے مطابق حرکت کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر کشتی کی حرکت کو اپنی طرف منسوب فرمایا اور اسے امر تکوینی سے متعلق کیا ہے۔

پھر یہ بھی فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ [1]

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالی نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے کہ وہ سب کچھ زمین میں ہے اور کشتیوں کو جو سمندر میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے چلتی ہیں۔

دوسرا سوال: پرانے دور کی کشتی کو تر کھان۔ لوہار اور کاریگر اپنے سادہ طریقوں سے بنایا کرتے تھے۔ لیکن آج بحری جہازوں اور کشتیوں کو تعلیم یافتہ انجینئر اور تجربہ کار کاریگر اپنے عظیم کارخانوں میں تیار کرتے ہیں، تو پھر خداوند نے یہ کیوں فرمایا کہ میں نے ان کشتیوں کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔؟

کلید فلاح و بہبود

جواب: چونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات عالم کو چند ایک محکم اور اصل قوانین پر استوار کر رکھا ہے اور ان مضبوط اور حکیمانہ قوانین کی حکومت اس کائنات کے تمام امور پر قائم ہے۔ ان مقررات وقوانین کو سمجھ لینا ہی انسانی فلاح و بہبود اور اس کائنات کے خزائن سے استفادہ کرنے کی کلید ہے۔۔

انسان اپنی صدیوں کی مسلسل کوششوں کے بعد ان آخری چند صدیوں میں بعض قابل توجہ قوانین خلقت پر آگاہی حاصل کرنے میں کامیاب ہوا او کسی حد تک خلقت کے رموز و اسرار سے مطلع ہو گیا ہے۔ علم الاجسام۔ علم العناصر۔ علم الحیات۔ علم طبیعات اور سائنس کی دیگر کتابیں دراصل اس عالم طبیعت کے قوانین کا مجموعہ ہیں۔ وہاں تو انسان اس راہ میں جس قدر زیادہ معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا جائے گا، اسی قدر ان کتابوں کے صفحات میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

قوانین آفرینش کی اطاعت

ایک تعلیم یافتہ انجینئر اگر یہ چاہے کہ ایک کشتی یا بحری جہاز بنائے تو سب سے پہلے علم الاجسام کے قوانین کا مطالعہ کرتا ہے جو

---

[1] سورۂ حج آیت ٦٥

کشتی سازی کے لئے ضروری ہیں۔ جب وہ اس کا نقشہ بناتا ہے تو اس میں قوانین آفرنیش کی غیر مشروط پابندی کو مدنظر رکھتا ہے۔ پھر اپنے نقشے کے مطابق لوہا۔فولاد۔قلعی۔لکڑی۔موٹر اور دیگر ضروری اشیاء کی ترکیب کرنے لگتا ہے اور پوری احتیاط کے ساتھ اس کام کو سر انجام دیتا ہے۔ نیز اس انجینئر کو معلوم ہوتا ہے کہ اگر کشتی سازی میں قوانین خلقت میں سے پچانوے فیصد قوانین کو ملحوظ رکھے اور فقط پانچ فیصد کی خلاف ورزی کرے تو اسی نسبت کے مطابق اپنے کام میں ناکامی اور شکست کا شکار ہو جائے گا۔

پس عالم خلقت میں جاری کردہ خدائی قوانین کے پرتو میں ان کشتیوں کو ہمارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ نہ وہ انجینئر کہ جس نے یہ کشتی بنائی ہے۔ ہاں اس انجینئر کا یہ شاہکار اس لحاظ سے بڑا اہم اور قابل قدر ہے کہ اس نے کشتی سازی میں قوانین الٰہی کی سو فیصد پیروی کی ہے۔ یعنی اس نے اپنے نقشے میں اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ تمام قوانین خلقت کو پوری طرح مدنظر رکھا اور ان کے مطابق یہ کام انجام دیا ہے۔

تو کیا اس منظم جہان کے اسباب وعلل اور ان کے مسببات ومعلومات کا علم حاصل کرنا کہ جو بذات خود اس ذات حکیم کے وجود کی دلیل ہے، اس ذات کی توحید پر کوئی ضرب لگا سکتا ہے؟ آیا الٰہی سنن اور خلقت کے قوانین سے آگاہی حاصل کرنا خدا پرستی کے ساتھ سازگار نہیں؟ آیا طبیعت کی تسخیر اور اس سے استفادہ کرنا کہ جو دراصل خود اللہ تعالیٰ کی اجازت کے ساتھ ہے، ہمارے مکتب الٰہی سے منافات رکھتا ہے؟ کیا ضروری ہے کہ جو شخص ان قوانین خلقت کی بنیاد پر ایک نئی ایجاد کرے وہ حتماً مادہ پرست اور منکر خدا ہو؟ واضح ہے کہ کتب الٰہی میں ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے۔

زندہ خلئے کی ایجاد

ان مطالب وحقائق کی توضیح پیش کرنے کے بعد دوبارہ ہم گفتگو کا رخ فرانسیسی خبر رساں ایجنسی کے سائنسی نامہ نگار کے بیانات کی طرف موڑتے ہیں۔ اس نے کہا تھا: ''ایک زندہ خلئے کی ایجاد کا دوسرا راستہ یہ ہے کہ سادہ کیمیائی عناصر کی ترکیب سے ایسا خلیہ بنایا جائے، لیکن اس بارے میں علم الحیات کے ماہرین کی اکثریت یہی کہتی ہے کہ موجودہ حالات میں بعض کیمیائی عناصر کی ترکیب سے ایک زندہ خلئے کی ساخت ناممکن ہے۔

یہاں جن امور پر روشنی ڈالنا ضروری ہے ان میں اولین امر یہ ہے کہ عناصر طبیعی سے خلیہ سازی کے عمل کے لئے دو مرحلے ہیں۔ مرحلہ اول یہ ہے کہ سائنس دان اپنی تجربہ گاہ میں مصنوعی طور ایسا کیمیائی مالیکیول بنانے میں کامیاب ہو جائیں جو زندہ موجودات کے طبیعی مالیکیولوں کی مثل ہو۔ دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ وہ مصنوعی زندگی بھی حاصل کر لے، غذا کو کام میں لائے اور نشوونما پائے۔ بالفاظ دیگر ایک کیمیاوی مالیکیول کا بنانا اور پھر اس کو زندگی دینا یہ دونوں جداگانہ موضوعات اور باہم فرق رکھنے والے امور ہیں۔

''جنیوا یونیورسٹی کا پروفیسر امیل گونیو کہتا ہے: میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ایک مالیکیول کی ترکیب اصلاً اس کو زندہ کرنا نہیں ہے، کیونکہ زندگی کی خاص علامت غذا حاصل کرنے کی قدرت ہے۔ یہ قدرت شاید اس خاص ترکیب کی علامات کے مجموعے

سے پیدا ہوتی ہے۔ کہ جس کے اجزاء ان علامات کے ظاہر ہونے کا وسیلہ ہیں۔ [1]

علم الحیات اور زندگی شناسی کے ماہرین کی علمی محافل میں جو نکتہ آج کل مورد بحث رہتا ہے اور اس کے متعلق ان کو کچھ امید بھی ہے کہ وہ کم یا زیادہ عرصے کے بعد اس کی دریافت میں کامیاب ہو جائیں گے۔ وہ مرحلہ اول یعنی مالیکیول کی ایجاد ہے اور اس میں کامیابی کا حصول دراصل علم حیاتیات میں ترقی کی کیفیت کے تابع ہے۔ ہاں ممکن ہے کہ یہ علم بہت جلد وسعت پا لے اور سائنس دان حضرات انتہائی قلیل مدت میں ایک زندہ مالیکیول کو ایجاد کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

طبعی عناصر کی ترکیب

سوال: اگر بالفرض سائنس دان اپنی تجربہ گاہ میں ایک زندہ مالیکیول بنانے میں کامیاب ہو جائیں اور اپنی اس دیرینہ آرزو کو عملی جامعہ بھی پہنا لیں۔ تو کیا یہ کامیابی ہمارے عقیدہ توحید، خدا پرستی اور عبادت الٰہی سے منافات پیدا نہ کرے گی۔؟

جواب: اگر علم الحیات اس قدر ترقی کر جائے کہ ایک سائنس دان اپنی تجربہ گاہ میں کسی بے جان عنصر کو مخصوص اور متناسب ترکیب کے ساتھ ایسے زندہ مالیکیول میں تبدیل کر دے جو عام زندہ مالیکیولوں سے مشابہت رکھتا ہو۔ اس وقت ہمیں یہ اعتراف کر لینا چاہئے کہ اس نظام آفرینش کی کتاب مقدس جو قضاء الٰہی کے قلم سے تحریر کی گئی ہے، ان لوگوں نے بڑی دقت کے ساتھ اس کا مطالعہ کیا ہے اور اس نظام خلقت کے بعض ایسے پیچیدہ اسرار و رموز کو دریافت کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جن کے وسیلے سے انہوں نے انتہائی قابل قدر کامیابیاں حاصل کی ہیں۔

لہٰذا یہ علمی کامیابی اساس توحید سے کوئی مغایرت نہیں رکھتی، بلکہ حکیمانہ خلقت کے نظم کی ہر دلیل درحقیقت خدا پرستی اور خدا پرستوں کے لئے خصوصی مئوید کی حیثیت رکھتی ہے، کیونکہ یہی وہ مقدس تفکر ہے جو قرآن مجید کی طرف سے حوصلہ افزائی اور تشویق کا مورد قرار پاتا ہے اور اسلامی روایات اس کو اہم ترین عبادات میں شمار کرتی ہیں۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿١٩٠﴾
الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰي جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا [2]

تحقیق آسمانوں اور زمین کی حکیمانہ خلقت میں اور شب و روز کی آمد و رفت میں صاحبان عقل و خرد کے لئے آیات اور دلائل موجود ہیں۔ وہ عقل مند لوگ وہی ہیں جو قیام و قعود اور پہلو کے بل لیٹے ہوئے ہر حالت میں ذکر خدا میں مصروف رہتے ہیں (اور اس نظام حیرت انگیز کو دیکھ کر کہ یہ کس قدر منظم اور مرتب کر کے بنایا گیا ہے۔ اپنے خالق کی مقدس درگاہ میں یہی کچھ کہتے ہیں) اے

---

[1] چہ میدانم؟ بنیاد انواع ص ۱۶

[2] سورۂ آل عمران آیت ۱۹۱

پروردگار! تونے اس کاخ عظمت کو فضول اور بے مقصد پیدا نہیں فرمایا۔

عن ابی محمد العسکری علیه السلام قال: لیست العبادة کثرة الصیام والصلوة وانما العبادة کثرة التفکر فی أمر الله۔[1]

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام نے فرمایا! بندگی اور عبادت کا معیار نماز اور روزے کی کثرت نہیں، بلکہ عبادت در حقیقت مخلوق خدا میں زیادہ تفکر کرنے اور اس جہان میں پروردگار کی حکیمانہ نشانیوں میں بکثرت غور وخوض کرنے میں متحقق ہوتی ہے۔

ایک تجربہ گاہ میں خلیہ وجود میں لانے کے نظریئے میں سب سے اہم ترین مسئلہ اس کا دوسرا مرحلہ ہے، یعنی اس کیمیاوی مالیکیول کا زندہ رہنا۔ اس کا غذا لینا اور پھر اپنے جیسے بکثرت افراد میں تقسیم ہونا۔ جیسا کہ قبلاً اس کی تشریح کی گئی ہے۔ اس کا پہلا مرحلہ تو ایک علمی طور پر اہمیت رکھنے والا مسئلہ ہے اور اس کا نتیجہ طبعی عناصر کے ایک خصوصی شعبے میں کامیابی کا حصول ہے۔ لیکن دوسرا مرحلہ یعنی مالیکیول کی زندگی اور تجربہ گاہ میں ایک زندہ خلئے کا وجود پاجانا یہ اس کی نسبت بہت زیادہ اہم ترین مرتبہ رکھتا ہے۔

(۱) کیا انسان تجربہ گاہ میں ایک مالیکیول کی ترکیب پر قادر ہوجائے گا؟

(۲) کیا مالیکیول کی زندگی ایک مستقل اور جدا مرحلہ ہے یا مالیکیول کے ترکیبی مادوں کے مجموعے سے زندگی خود بخود وجود میں آجاتی ہے؟

(۳) کیا بالآخر انسان تجربہ گاہ میں ایک زندہ خلیہ ایجاد کرلے گا؟

(۴) اگر انسان کبھی اس بات پر قادر ہوگیا اور کامیاب ہوگیا تو قرآن مجید کے معتقدین اس سے کیا سمجھیں گے؟

(۵) کیا اصولی طور پر ایک خلئے کی ساخت میں علم الاجزاء کے طبیعی قوانین پر اسی طرح بنیاد قائم ہوتی ہے، جس طرح علم الاجسام کے قوانین کے مطابق ایک بحری جہاز بنایا جاتا ہے یا دونوں میں فرق ہے؟

(۶) کیا ایسا نہیں کہ علم طبیعات اور علم الاعضاء کے قوانین اسی طرح خداوند کائنات کی تخلیق ہیں جس طرح وہ سارے قوانین طبیعت اس کی تخلیق ہیں جو اس جہان پر حکومت کررہے ہیں۔

(۷) ایک بحری جہاز بنانے والا انجینئر جس طرح لوہا۔ فولاد۔ لکڑی اور دیگر طبیعی مواد کو باہم مرکب کرکے جہاز بنالیتا ہے۔ اسی طرح علم الحیات کے ماہر بھی یہ آرزو رکھتے ہیں کہ ان طبیعی مواد کو باہم مرکب کرکے ایک زندہ مالیکیول ایجاد کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

پس جس طرح ایک انجینئر الٰہی قوانین کی بنیاد پر ایک کشتی تیار کرلیتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی تسخیر کو اپنی طرف نسبت دیتا ہے۔ اسی طرح علم الحیات کے ماہر بھی یہ آرزو رکھتے ہیں کہ ان طبیعی مواد کو باہم مرکب کرکے ایک زندہ مالیکیول ایجاد کرنے میں کامیاب ہوجائیں۔ اسی طرح کشتی کا دریا میں حرکت کرنا کہ جو درحقیقت اس کی طبیعی توانائی کا نتیجہ ہے، اللہ تعالیٰ اس کو اپنے حکم کی

---

[1] بحار الانوار ج ۷۱ ص ۳۲۱

طرف منسوب کرتا ہے۔ بنابرین اگر ایک روز ماہرین علم الحیات الٰہی قوانین سے استفادہ کرتے ہوئے تجربہ گاہ میں ایک زندہ مالیکیول کو وجود میں لانے میں کامیاب ہوجائیں تو ہمارے لئے کیا مانع ہے کہ اس کو بھی اسی طرح اللہ تعالیٰ کی تسخیر قرار دے دیں، جس طرح ہم کشتی کو خدا کی تسخیر قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ اس زندہ خلیئے کی حرکت کو بھی اللہ تعالیٰ کے امر تکوینی کی طرف منسوب کردیں، جس طرح ہم کشتی کو خدا کی تسخیر قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ اس زندہ خلیئے کی حرکت کو بھی اللہ تعالیٰ کے امر تکوینی کی طرف منسوب کردیں، جس طرح پانی میں کشتی کی خرکت کو حکم خدا کی طرف نسبت دیتے ہیں۔

تجربہ گاہ اور زندگی

زندگی کے بارے میں تجربہ گاہ کے تجربات اور تحقیقات کے متعلق ماہرین کی گفتگو سے جو مجموعی تاثر سامنے آتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ علم الحیات کے محققین اس کے پہلے مرحلہ کے بارے میں تو پر امید ہیں یعنی رمز زندگی کی پہچان اور زندگی کے کیمیاوی مالیکیول کی ایجاد کے بارے میں وہ خاصی امید رکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ یہ نظریہ قائم کئے ہوئے ہیں کہ سائنس دان اپنی مسلسل اور دائمی مساعی کو جاری رکھتے ہوئے بالآخر ایک زندہ مالیکیول کی ایجاد میں کامیاب ہوجائیں گے۔ لیکن جہاں تک اس کے دوسرے مرحلے کا تعلق ہے یعنی زندگی کی ایجاد اور تجربہ گاہ میں ایک زندہ موجود کی تخلیق تو اس بارے میں علم الحیات کے ماہرین یا تو مکمل طور پر ناامید ہیں یا کم از کم ان کی امید کے پلڑے کے مقابل ناامیدی کا پلڑا بہت جھکا ہوا ہے۔

آئندہ ہزار سال انسان زندگی کا راز جاننے میں کامیاب ہوجائے گا، لیکن یہ اس کی دلیل نہیں کہ انسان ایک مکھی یا کوئی دوسرا کیڑا یا ایک زندہ خلیہ ایجاد کرنے میں کامیاب ہوجائے گا۔

یہ موضوع ایک کانفرنس میں زیر بحث آیا جو ڈارون کی یاد میں منعقد ہوئی تھی۔ کانفرنس کے آخر میں ایک سائنس دان (پروفیسر ہانز) نے اعلان کیا کہ اس ہزار سال کے عرصے میں سائنس دان زندگی کے راز کے متعلق اپنا مطالعہ اور تلاش و جستجو کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔[1]

قوائے غریزی کا سرمایہ

اسلامی مآخذ مصادر سے یہ استفادہ ہوتا ہے کسی بھی زندہ مخلوق کو وجود میں لانا، حتیٰ کہ ایک چھوٹے سے کیڑے مثلاً مچھر یا مکھی وغیرہ کا پیدا کرنا بھی ناممکن ہے۔ یاد رہنا چاہئے کہ یہ ننھی ننھی مخلوقات زندگی کے علاوہ دیگر غریزی اور طبیعی قویٰ کی بھی حامل ہیں، اس زندہ مخلوق کے خالق نے ان میں سے ہر ایک قوت مناسب مقدار اور صحیح قواعد کے تحت ان کو عطا کر رکھی ہے۔

چنانچہ یہ مخلوق انہیں قوتوں اور صلاحیتوں کے سایہ میں زندگی بسر کرنے کا اختیار رکھتی اور انہیں حالات میں اپنی زندگی کا سفر

---

[1] روزنامہ اطلاعات شمارہ ۱۰۱۶۰

جاری رکھ سکتی ہے۔

مثلاً اسی مچھر کو دیکھئے کہ یہ زندگی کے علاوہ حب ذات بھی رکھتا ہے اور اپنی زندگی سے پیار کرتا ہے۔ چنانچہ اس میں جتنی قوت ہے، اسی کے مطابق اپنی زندگی کی حفاظت میں کوشاں رہتا ہے۔ یہ ایک باہوش مخلوق ہے اور کسی خطرناک ماحول میں جانے سے گریز کرتا ہے۔ پھر یہ ذاتی ارادہ تصمیم کا بھی مالک ہے، اس لئے اپنے فیصلے کے مطابق پرواز کرتا ہے۔ یہ اپنا راستہ بدل لیتا ہے یا جب چاہتا ہے اڑان ختم کر دیتا ہے اور کہیں بیٹھ جاتا ہے۔ یہ دوستی، دشمنی شہوت اور غضب کا بھی مالک ہے اور اس میں نر اور مادہ بھی ہوتے ہیں۔ یہ انڈے دیتے ہیں اور انڈے دینے کے لئے مناسب مقام تلاش کرنے کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں تا کہ وہاں اپنے بچوں کی پرورش کر سکیں۔ اس میں قوت ہاضمہ جاذبہ اور دافعہ موجود ہیں اور یہ اپنی غذا کو خوب پہچانتا ہے۔ یہ اپنی غذا کے حصول اور اس کی تلاش کے لئے پرواز کرتا ہے اور جہاں بھی غذا پاتا ہے وہاں اتر جاتا ہے۔ غرض یہ کہ وہ تمام اعضاء جو اسے خداوند کریم نے عطا فرمائے ہیں، یہ ان سے نہایت موزوں طریقے سے استفادہ کرتا ہے۔

حکیمانہ امانتیں

خلاصہ یہ کہ خداوند تعالی نے زندگی کے علاوہ اس کی فطرت میں بہت سی حکیمانہ امانتیں رکھی ہوئی ہیں ان فطری امانتوں میں سے چند ایک تو آج کے انسان کے علم میں آ چکی ہیں لیکن چند ایک ابھی تک ناشناختہ ہیں۔ ایک ایسے عجیب و غریب موجود کو اس کے ان تمام صلاحیات و کمالات کے ساتھ انسان نے خلق نہیں کیا اور نہ ہی مستقبل میں کر سکتا ہے۔

قال علی علیہ السلام۔ لو اجتمع جمیع حیوانہا من طیرھا و بہائمہا و متبلدۃ اممہا و اکیاسہا علی احداث بعوضۃ ما قدرت علی احداثہا ولا عرفت کیف السبیل ایجادھا والتحیرت عقولہا فی علم ذالك وتاھت و عجزت قواھا وتناھت ورجعت خاسئۃ حسیرۃ عارفۃ بانہا مقھورۃ مقرۃ بالعجز عن انشاءھا [1]

انسان کی عاجزی

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: اگر اس جہان کی تمام زندہ مخلوقات پرند، چرند، دیگر تمام حیوانات اور تمام عاقل و غیر عاقل اقوام و ملل اس امر پر باہم متحد اور مجتمع ہو جائیں کہ ایک مچھر کو خلق کریں تو ہرگز اس کی قدرت نہ پا سکیں گے۔ اگر یہ لوگ کبھی اس کام کو انجام دینے کے لئے اقدام کرنے لگیں تو ان کے دماغ حیرت زدہ اور پریشان ہو کر رہ جائیں گے۔ ان لوگوں کے اندر موجود تمام قویٰ رفتہ رفتہ کمزور پڑ جائیں گے اور وہ غم زدہ ہو کر واپس پلٹ آئیں گے۔ جبکہ خود اپنی شکست۔ عاجزی اور ناتوانی پر

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۲۲۸

آ گاہ ہوں گے اور اعتراف کریں گے کہ ہم ایک حقیر سا مچھر پیدا کرنے سے عاجز ہیں۔

ہماری گزشتہ بحث حیات کے بارے میں اہم ترین علمی مباحث میں سے تھی، کیونکہ دور حاضر نے اپنے صنعتی مرکزوں اور تجربہ گاہوں میں عجیب اور دقیق ترین آلات مہیا کر لینے کے سبب اس بحث کی اہمیت اور اس کی قیمت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ آلات وابزار کی اس ترقی کے نتیجے میں محققین اور ماہرین نے زندگی کی حقیقت اور اس کے راز کی شناخت کرنے میں پہلے سے بھی زیادہ توجہ دینا شروع کر دی ہے۔

ہم نے زندگی کی حقیقت شناسی کے موضوع پر اس قدر مفصل بحث بھی اس غرض سے کی ہے کہ اگر تعلیم یافتہ اور باایمان نوجوانان ملت کسی موقع پر دیکھیں کہ کسی زندہ مخلوق کی ایجاد یا تجربہ گاہ کے اندر زندہ خلیئے وجود میں لانے یا اس قسم کے دیگر مضامین اخبارات ومجلّات میں شائع ہوئے ہیں تو مذہبی نقطہ نگاہ سے کسی قلبی تشویش کا شکار نہ ہو جائیں۔ یعنی وہ یہ خیال نہ کریں کہ علم الحیات یا علم النبات کی ترقی اسلامی اور قرآنی تعلیمات کے مخالف ہے اور یہ دونوں باہم موافق نہیں ہیں۔

اب دوبارہ عنان قلم کو اصل بحث کی طرف موڑتے ہیں: آیت الکرسی نے اپنے آغاز میں اللہ تعالیٰ کو معبود برحق ہونے اور لائق پرستش ہونے میں تنہا اور واحد بنایا ہے، بایں معنی کی اس ذات اقدس کے علاوہ کوئی بھی بندگی اور عبادت کے لائق نہیں ہے۔ اس کے بعد اس معبود واقعی کے صفات کمال یکے بعد دیگرے بیان کرنے شروع کئے ہیں کہ جن میں سے اولین حیثیت حیات کو حاصل ہے (کہ وہ ذات حی ہے)۔

حیات یا نامعلوم حقیقت

حیات کی مثال وجود کی سی ہے کہ جس کا مفہوم واضح ہے لیکن اس کی حقیقت نامعلوم۔ ناشناختہ اور نادانستہ ہے۔ وجود کی طرح حیات بھی مختلف مراتب اور درجات رکھنے والی چیز ہے۔ یعنی وہ غنی بالذاب اور فقیر بالذات، اور ممکن بالذات اور حیات ازلی وابدی اور حیات حادث وفانی کے مدارج رکھتی ہے۔ حی ایک ایسا کلمہ ہے جس کا اطلاق باری تعالیٰ کی حیات پر بھی ہوتا ہے جب کہ اس کی حیات اس کی عین ذات اور اس کی ذات سے قائم ہے۔ اگر چہ خود ذات حق تعالیٰ ہی حیات وزندگی کی اصل و بنیاد اور حقیقت حیات ہے، تاہم اسی کلمہ حی کا اطلاق ممکنات ومخلوقات کی حیات پر بھی ہوتا ہے۔ حالانکہ ان کی حیات ان کی ذات سے زائد۔ جداگانہ اور اس کو عارض ہونے والی حقیقت ہے اور ان کی حیات کا قیام باری تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہے، گویا حی کا اطلاق خالق ومخلوق ہر دو کی حیات پر ہوتا ہے۔

حیات وزندگی ایک حقیقی کمال ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات پاک جو معبود حقیقی اور جمیع کمالات کی جامع ہے، اس کے لئے اس کمال حیات کا مالک ہونا از حد ضروری ہے۔ اگر بالفرض خداوند عالم کے لئے حیات ثابت اور متحقق نہ ہو تو اس کا لازمہ یہ ہوگا کہ ایسے ممکنات جو صفت حیات سے متصف ہیں، وہ ہمارے خالق اور معبود برحق سے زیادہ کامل تر اور برتر ہو جائیں گے۔

زندگی ایک ایسی عجیب حقیقت ہے جو مادہ پرست مکتب کے لئے ایک سنگین مشکل اور نا قابل توجہ شیٔ بن کے رہ گئی ہے۔ کیونکہ جب کسی بھی مادہ پرست فرد سوال کیا جائے کہ ایک مردہ اور بے شعور مادہ جو زندگی کے جوہر سے یکسر محروم تھا۔ اس کیلئے یہ کیسے ممکن ہوگیا کہ اس کے اندر زندگی پیدا ہوگی۔ ہاں اس نے یہ عظیم نعمت کہاں سے اور کیسے حاصل کی ہے؟ تب وہ جواب میں چند ڈانوں ڈول نظریئے اور نا پختہ باتیں پیش کر کے رہ جاتا ہے۔ وہ اس سوال کا کوئی قطعی اور معقول جواب نہیں دے سکتا اور نہ ہی اسے یہ قدرت حاصل ہوتی ہے کہ ظہور زندگی کے واقعہ کو کسی علمی اور منطقی انداز میں واضح اور روشن کر سکے۔

لیکن مکتب الٰہی کا پیروکار اور خالق لم یزل ولا یزال کو اس عالم کائنات کی بنیاد ماننے والا اس سوال کے جواب میں بول اٹھتا ہے کہ ہر موجود کو وجود عطا کرنے والا خدا ہی ہے جو خود زندہ اور حی ہے اور ہر زندہ کو زندگی بخشنے والا ہے۔

جس طرح اس نے تمام موجودات کو خلعت وجود سے آراستہ فرمایا ہے، اسی طرح ان کے لئے حیات کا فیض بھی جاری فرمایا ہے۔ اس شخص کا قول یہ ہوتا ہے کہ یہ زندہ کائنات ایک زندہ خدا ہی سے وجود میں آئی ہے۔ لیکن ہم لوگ اتنے عاجز ہیں کہ اس حیات و زندگی کی حقیقت سے نا آگاہ ہیں اور ہمیں کچھ پتہ نہیں کہ خداوند عالم نے اشیاء پر زندگی کا فیضان کیسے جاری فرمایا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک الٰہی فرد اس منطق سے آفرینش کی وضاحت کرتے ہوئے زندگی کے بارے میں کئے گئے سوال کا جواب دے سکتا ہے۔

اس سے پیشتر اشارہ ہوا کہ آیت الکرسی مشرکین کے خوابیدہ عقول کو بیدار کرنے اور انہیں شرک در عبادت سے نجات دلانے کے لئے نازل ہوئی ہے۔ اولین کلمہ جو عقل کے لئے غور کرنے کی بنیاد ہے، انہیں تفکر و تعقل پر مجبور کر دیتا ہے اور انہیں بت پرستی کی ذلت آمیز بندگی و اسارت سے نجات بخشتا ہے وہ یہ کلمہ ''حیّ'' ہے۔ آیت الکرسی اس کلمہ ''حیّ'' کے ذریعے لوگوں کو یہ بات سمجھاتی ہے کہ وہ معبود حقیقی جو عبادت و پرستش کے لائق ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ صاحب حیات ہو۔ لہٰذا اے انسان تو! وہ ہے کہ جو اپنا راستہ گم کر بیٹھا ہے۔ بت، آگ سورج اور چاند جیسی بے جان اشیاء کی عبادت کرنے لگا ہے۔ اے اپنی بیش بہا شخصیت کو تباہ کرنے والے! آ بیدار ہو کچھ سوچ کہ اس جہان میں تنہا تو ہی ایسا زندہ موجود ہے کہ جس کو خداوند عالم نے آزادی کی نعمت سے مالا مال کیا اور آزاد خلق فرمایا ہے۔ آیا عقل یہ اجازت دیتی ہے کہ ایک زندہ اور صاحب ادراک انسان جو اس جہان طبیعت میں تکامل کی منازل طے کر چکا ہے اور اس کرہ ارض کی اشرف ترین مخلوق ہے وہ پستی اور انحطاط کی راہ اپنائے۔ وہ اپنی عقل کو پیچھے چھوڑ دے، اس کی صدا پر کان نہ دھرے اور اپنی اس آزادی سے سواء استفادہ کرنے لگے۔ جبکہ اس کے مقابل ایک جماداتی موجود جو عقل و حیات کی نعمت سے محروم ہے، بندگی کے لئے اللہ تعالیٰ کے سامنے سر جھکائے اور اس ذات کی عبودیت کا طوق اپنے ہاتھوں سے اپنی گردن میں ڈال لے؟

قَالَ هَلْ يَسْمَعُونَكُمْ إِذْ تَدْعُونَ ﴿٧٢﴾ أَوْ يَنْفَعُونَكُمْ أَوْ يَضُرُّونَ ﴿٧٣﴾ [1]

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے شعور کو نئی زندگی بخشنے کے لئے اسی منطق سے استفادہ کیا اور ان بت پرست لوگوں سے فرمایا: لوگو! جب تم ان بے جان بتوں کو پکارتے ہو تو کیا یہ تمہاری آواز سن لیتے ہیں؟ کیا یہ جماداتی موجودات اس امر پر قادر

[1] سورۂ شعراء آیت ۷۲۔۷۳

رہیں کہ زندگی کے قوانین پر اثر ڈالیں اور تمہیں کوئی فائدہ یا نقصان پہنچا سکیں۔

بے شک اگر ایک بت پرست انسان اپنا اعمال نامہ عقل کی عدالت میں لے آئے اور اس قاضی خرد سے فیصلہ چاہے تو وہ قطعی طور پر اس کے اعمال نامے کو قابل مذمت قرار دے گا۔ مصنف عقل اس کے احمقانہ عمل کو قبیح قرار دے گا اور اسے اس شرم ناک بندگی اور بت پرستی کے نتیجے میں اس کی ذلت آمیز اسارت سے نجات دلانے کا حکم فرمائے گا اور حریت و آزادی کی طرف اس کی راہنمائی کرے گا۔ پس آیت الکرسی نے اپنے (حی) کے ساتھ کہ جو معبود برحق کی ان صفات میں اولین صفت ہے جو اس آیت میں بیان کی گئی ہیں۔ یہ صفت بیان کر کے اس نے دیگر جمادی معبودوں کو الٰہیت کی کرسی سے نیچے اتار پھینکا ہے اور ہر عاقل اور زندہ بشر کو ان بناوٹی خداؤں کی پرستش سے آزاد فرما دیا ہے۔

تیسری تقریر

قیوم کی وضاحت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال اللہ العظیم فی کتابہ

اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۥ [1]

قیوم کا معنی

آیت الکرسی میں معبود یعنی ذات اقدس الٰہی کے ذکر شدہ صفات میں دوسری صفت اس کا قیوم ہونا ہے۔

قیوم۔ عربی لغت میں متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے، اپنی اس بحث میں ہم ان میں سے بعض معانی پر گفتگو کریں گے۔

راغب اپنی کتاب ''مفردات'' میں لکھتا ہے:

القیوم القائم الحافظ لکل شیئی والمعطی لہ ما بہ قوامہ و ذالك ھو المعنی المذکور فی قولہ تعالیٰ (الذی اعطی کل شیئی خلقہ ثم ھدی)

قیوم تمام اشیاء کا قائم رکھنے والا اور ان کی حفاظت کرنے والا ہے۔

قیوم وہ ہے جس نے ہر موجود کو اس کا ذریعہ قوام اور اس کی بقاء کے لئے کام آنے والا سرمایہ عطا فرمایا ہے، یہ وہی ہستی ہے جس کا تذکرہ قرآن مجید کی اس آیت کریمہ میں کیا گیا ہے۔

''وہ اللہ جس نے ہر شئی کو وہ سب کچھ دیا جو اس کی خلقت کے لئے لازم ہے اور پھر اس کو ہدایت کی''

ماحول سے مطابقت

قابل غور اور لائق توجہ مباحث میں سے ایک خوب تر بحث یہ ہے کہ تمام زندہ اشیاء اپنے اندر ایسی شرائط وصفات لئے ہوئے ہیں کہ جن کے ذریعے وہ خود کو بآسانی اپنی زندگی کے ماحول سے سازگار لیتی ہیں۔ اس طرح وہ اپنی زندگی کو دوام بخشنے اور برقرار رکھنے پر قادر ہو جاتی ہیں۔ یہی وہ مفہوم ہے جو راغب اصفہانی نے ''قیوم'' کے معنی سے اخذ کیا ہے کہ ''المعطی لہ ما بہ قوامہ'' چونکہ یہ

---

[1] سورہ بقرہ آیت:255

موضوع دین اسلام کے اساسی اور علمی مسائل میں سے ہے، اس لئے مناسب ہے کہ اس کے بارے میں مختصر سی بحث ہو جائے تا کہ اصل مطلب کے روشن ہونے کے ساتھ ساتھ قیوم کا ایک معنی بھی واضح ہو جائے۔

جب اس جہان کے تمام زندہ موجودات پر نگاہ ڈالی جائے تو وہ اپنی طبیعی قوتوں، فطری طاقتوں، اعضاء بدن اور دیگر لوازم کے لحاظ سے اپنی زندگی کے ماحول سے پوری طرح مطابق اور ہم آہنگ دکھائی دیتے ہیں۔ وہ جہاں بسر اوقات کر رہے ہوتے ہیں، ان کے پاس اس ماحول کے عین مطابق ضروری وسائل موجود ہوتے ہیں، وہ غذا۔ رہائش۔ اولاد کی تربیت اور دشمن سے دفاع وغیرہ کے لئے تمام وسائل و آلات سے خوب آراستہ دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس کو تمام الٰہی پیشوا اور علوم اجتماعی کے تمام ماہرین تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن ان میں فرق یہ ہے کہ تمام الٰہی نمائندے اور علم حیات و اجتماع کے ماہرین کی ایک جماعت کہتی ہے کہ اس مطابقت و ہم آہنگی کی وجہ حق تعالیٰ کا قیوم ہونا ہے اور یہ اس امر کی دلیل ہے کہ خداوند حکیم نے ہی اس حکیمانہ نظام کو خلق فرمایا ہے۔ جب کہ ماہرین علوم اجتماعیات کی ایک جماعت جو مادیت پسند طبقے سے تعلق رکھتی ہے، ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اس منظم اور مرتب انطباق و ہم آہنگی کو طبیعی اسباب کی طرف منسوب کر دیں اور اسے محض ایک اتفاقی حادثہ اور اچانک رونما ہونے والا ایک واقعہ قرار دے دیں۔

جب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام فرعون کے دربار میں آئے اور اسے خدائے واحد و یکتا کی طرف دعوت دی تو فرعون نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا:۔

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ۝ قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۝ [1]۔

اس نے کہا:۔ اے موسیٰ! تم دونوں کا خدا کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا:۔ ہمارا خدا وہ پروردگار حکیم ہے جس نے اپنے اس حکمت اور اندازے کے مطابق قائم کیے ہوئے نظام میں ہر زندہ موجود کو وہ سب کچھ دے دیا ہے جو اس کے لئے ضروری تھا اور اسے وہ سب کچھ عطا کر دیا ہے جو اس کے اپنی زندگی گزارنے کے لئے لازمی تھا۔ اس کے علاوہ اس کو اپنی زندگی کی راہ بتائی، اسے اس کی زندگی کی ضروریات کی شناخت کرائی اور اپنے اعضاء جوارح سے صحیح طور پر استفادہ کرنے کے لئے اس کی راہنمائی کر دی ہے۔

شیخ طوسیؒ تفسیر التبیان مے اسی آیت کے ذیل میں رقمطراز ہیں

والذی اعطی کل شیئی حی صورتھا التی قدرلہ ثم ھداہ الی مطعمہ و مشربہ ومنکحہ ومسکنہ

(وہی ذات وہ ہے جس نے ہر شئی کو اس کی وہ صورت بخشی جو اس کے لئے معین تھی پھر اسے اپنے کھانے۔ پینے۔ اپنے جنسی جوڑے اور رہن سہن کے تمام وسائل کی طرف راہنمائی فرمائی ہے)

---

[1] سورۂ طٰہٰ آیت ۴۹۔۵۰

عالم حشرات

پانی میں رہنے والا ایک معمولی سا کیڑا بھی اس پانی کے اندر زندگی گزارنے کے لئے تمام لوازم سے آراستہ دکھائی دیتا ہے۔ اس کے جسم میں اس قدر لچک اور نرمی ہوتی ہے کہ بآسانی پانی میں تیر سکتا ہے اور اس کے بدن کی ساخت اس طرح ہوتی ہے کہ دائمی طور پر پانی میں رہنے کی وجہ سے کمزوری اور بوسیدگی کا شکار نہیں ہوتا۔ وہ اپنی خوراک کو اچھی طرح پہچان لیتا ہے اور خود کو اس تک پہچانے کے تمام طریقوں سے شناسا ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ کس طرح جلدی کر کے اس تک پہنچوں، اسے شکار کروں اور اپنی بھوک مٹاؤں۔

خشکی پر زندگی بسر کرنے والا ایک ضعیف سا مچھر جو انسان یا حیوان کے خون سے غذا پاتا ہے وہ بھی پروں کا مالک ہوتا ہے اور پرواز کر کے اپنی غذا کے مقام کو ڈھونڈ لیتا ہے۔ اس کے پاس ایک نازک سی نوک دار سونڈ ہوتی ہے، وہ اس کے بارے میں اچھی طرح علم رکھتا ہے کہ اسے اس سونڈ کو انسان یا حیوان کی رگ میں اتار دینا چاہئے۔ تا کہ ان کا خون چوس کر اپنی غذا حاصل کرے۔

مختصر یہ کہ اس خداوند قیوم نے تمام حشرات اور سارے حیوانات کو کچھ اس طرح پیدا فرمایا اور ان کو ایسے اعضاء بدن اور ایسی قویٰ سے مسلح کر دیا ہے جو اس ماحول کے عین مطابق اور سازگار ہوتی ہے جن میں انہوں نے زندگی گزارنا ہوتی ہے۔ پھر وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اپنے ان اعضاء سے کہاں اور کس طرح کام لینا ہے تا کہ اپنی زندگی کو برقرار رکھ سکیں۔

قال الصادق علیه السلام: فجعل کل شیئ من خلقه مشاکلا للأمر الذی قدر ان یکون علیه [۱]

امام جعفر صادق علیہ السلام نے توحید مفضل میں پرندوں کی خلقت کی باریکیوں کی تشریح کے ضمن میں اس قاعدۂ انطباق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: خدائے بزرگ و برتر نے ان زندہ موجودات میں سے ہر ایک کو اس کے ماحول کے مطابق اور اس کی زندگی کے طور طریقے کے لئے مناسب اور موزوں صورت میں خلق فرمایا ہے کہ جسے اس نے معین فرمایا تھا۔

هل رأیت مفضل هذا الطائر الطویل الساقین و عرفت ماله من المنفعة فی طول ساقیه فانه اکثر ذالك فی ضحضاح من الماء فتراه بساقین طویلین کانه ربیئة فوق مرقب وهویتأ مل فی الماء فاذا رأی شیئا مما یتقوت به خطا خطوات رقیقاً حتی یتنا وله ولو کان قصیر الساقین و کان یخطو نحو الصید لیأ خذه یصیب بطنه الماء فیثور و یذ عر منه فیتفرق عنه فخلق له ذالك العمودان لیدرك بها حاجته ولا یفسد علیه مطلبه [۲]

---

[۱] بحار الانوار ج ۲ ص ۳۲۔ ۳۳

[۲] بحار الانوار ج ۲ ص ۳۲۔ ۳۳

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: کیا تو نے اس لمبی ٹانگوں والے پرندے کو دیکھا ہے؟ کیا تم کو معلوم ہے کہ ان لمبی ٹانگوں سے اسے کیا فائدہ ہے؟ چونکہ اس کی زندگی کا اکثر وقت کم گہرائی والے پانی میں گزرتا ہے۔اس لئے یہ اپنی لمبی ٹانگوں کے ساتھ اس چوکیدار کی مثل پانی پر گہری نگاہ رکھے ہوئے ہوتا ہے جو کسی اونچی مچان پر جاسوسی کے لئے بیٹھا ہو پھر جونہی کسی کیڑے یا کسی متحرک جاندار پر اس کی نگاہ پڑتی ہے کہ جسے وہ اپنی غذا کے لئے مناسب خیال کرتا ہے تو بڑی آہستگی کے ساتھ اس کی طرف چل دیتا ہے تا آنکہ بڑے آرام سے اسے پکڑتا اور ہڑپ کر لیتا ہے۔اب اگر اس کی ٹانگیں چھوٹی ہوتیں تو جب یہ اپنے شکار کی طرف چلتا تو اس کا پیٹ پانی سے ٹکراتا اور اس میں تلاطم پیدا ہو جاتا۔اس سے کیڑے گھبرا کر بھاگ جاتے اور یہ پرندہ شکار نہ ملنے کے باعث بھوکا رہ جاتا اسی لئے خداوند عظیم نے اس پرندے کو دو لمبی ٹانگیں عطا کر دی ہیں تاکہ وہ ان کے ذریعے اپنی غذائی ضروریات کو پورا کر سکے اور اپنے شکار کو پکڑنے میں ناکام نہ ہو جائے۔

تأمل ضروب التدبير فى خلق الطائر فانك تجد كل طائر طويل الساقين طويل العنق و ذالك ليتمكن من نتاول طعمه من الأرض ولو كان طويل الساقين قيصير العتق لما استطاع ان يتناول شياء من الأرض ور بما اعين مع طول العنق بطول المناقير ليزدادا لأ مر عليه سهولة و امكاناً[1]

اے مفضل! اس پرندے میں خداوند حکیم کی دیگر حکیمانہ تدابیر پر بھی غور کرو جو اس خالق نے اس کی خلقت میں ودیعت فرمائی ہیں۔تم دیکھتے ہو کہ اس نے ہر لمبی ٹانگوں والے پرندے کو لمبی گردن بھی عطا کی ہے۔ٹانگوں اور گردن میں لمبائی یہ ہم آہنگی رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ پرندہ اپنا لقمہ آسانی سے زمین سے اٹھا سکے۔کیونکہ اگر ٹانگیں لمبی ہوتیں اور گردن چھوٹی ہوتی تو یہ زمین پر سے اپنی غذا اٹھانے پر قادر نہ رہتا۔پھر اکثر ایسا بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ اس قادر نے ایسے پرندوں کو چونچ بھی عنایت فرما دی ہے تاکہ ان کے لئے زندگی گزارنا مزید آسان ہو جائے، وہ اپنے ماحول کے مطابق زندگی گزارنے پر زیادہ قادر ہو جائیں اور آسان ترین طریقے سے گزر اوقات کر سکیں۔

لامارک کا نظریہ

جب لامارک اور ڈارون کے نظریئے کے پیروکار اور تحول کے مفروضے کے حامی دیکھتے ہیں کہ یہ زندہ موجودات اپنی زندگی کے ماحول سے خوب مطابقت رکھتے ہیں تو اسے طبیعی اسباب وعلل کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔وہ خیال کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ ان موجودات کے اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لئے انجام دی جانے والی جدوجہد اور کوشش کا نتیجہ ہے۔

لامارک اور اس کے پیروکاروں کا کہنا ہے کہ جب کسی پرندے کی زندگی کا ماحول تبدیل ہوتا ہے اور اس کی گزران کا علاقہ

---

[1] بحار الانوار ج ۲ ص ۳۳

کسی دلدلی یا دریائی علاقے کی طرف منتقل ہوجاتا ہے، اس کو زندگی گزارنے اور اپنی غذائی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے یہ احتیاج لاحق ہوجاتی ہے کہ اب خود کو پانی میں ڈالے اور اپنی غذا پانی یا کیچڑ وغیرہ میں تلاش کرے۔ تب اس مقصد کے تحت وہ تیراکی وغیرہ سیکھنے کا محتاج ہوجاتا ہے اور ناچار اپنے پاؤں کی انگلیوں کو کھول دیتا ہے۔ یوں ان کی انگلیوں کے اندرونی حصوں کا چمڑا تنے رہنے کی عادت اپنالیتا ہے۔

پس رفتہ رفتہ چمڑا اس کی آئندہ نسلوں میں کچھ کچھ بڑھنے لگتا ہے اور بالآخر ان کی انگلیوں کے درمیان یہ پردہ پیدا ہوجاتا ہے اور ان کو تیراکی کے لائق بنا دیتا ہے۔ اسی طرح وہ پرندے اپنی غذا تک پہنچنے کے لئے اپنی گردن کو لمبا کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، تاکہ کیڑوں کو پکڑ سکیں۔ پس وہ ایسا کرنے لگتے ہیں تو آہستہ آہستہ یہ ان کی عادت بن جاتی ہے، رفتہ رفتہ گردن بڑھنے لگتی ہے اور یہ چیز آئندہ نسلوں میں منتقل ہوتی رہتی ہے تا آنکہ وہ لمبی گردن والے پرندے بن جاتے ہیں۔

تقابلی جائزہ

رئیس مذہب تشیع حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام جو خدا پرست الٰہیین کے بزرگ ترین رہبر ہیں، آپ نے ہر زندہ شئی کے اپنے ماحول کے ساتھ مطابقت لے کر آنے کے لئے زرافہ کی مثال پیش فرمائی ہے۔ دوسری طرف لامارک ہے جو ماحول کے مطابق اشیاء کے تحول وتبدل کا نظریہ رکھنے والوں کا پیشرو ہے اور وہ بھی اپنے مفروضے کے انطباق کے لحاظ سے ثبوت پیش کرنے میں زرافہ ہی کا نام لیتا ہے۔

چنانچہ اس بارے میں ہم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا کلام توحید مفضل سے نقل کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی جینوا یونیورسٹی کے پروفیسر ''امیل گونیو'' کی تصنیف ''بنیاد انواع از مجموعہ چہ میدانم؟'' سے لامارک کی گفتگو بھی نقل کئے دیتے ہیں۔ پھر لامارک اور ڈارون کے مفروضے پر دور حاضر کے ماہرین کی طرف سے کئے گئے ان علمی اعتراضات واشکالات کی کچھ تشریح کریں گے کہ جوانہوں نے ان کے نظریئے پر وارد کئے ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام مفضل سے گفتگو کرتے ہوئے زرافہ کی خلقت اور اسکی جسمانی ساخت کے بارے میں تشریح فرماتے ہیں۔ آپ اسے خداوند تعالیٰ کی ایک عجیب وغریب مخلوق قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

فأما طول عنقها والمنفعة لها فی ذالك فان منشأها ومرعاها ی غیاطل ذوات أشجار شاهقه ذاهبة طولا فی الهواء فهي تحتاج الی طول العنق لیتناول بفیها أطراف تلك الاشجار فتقوت من ثمارها۔ [1]

---

[1] بحار الانوار ج ۲ ص ۳۱

زرافہ کی لمبی گردن

زرافہ کی گردن کی لمبائی اوراس کا وہ فائدہ جواس جانور کو پہنچتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس کی پیدائش کا ماحول اوراس کی چراگاہ گھنے جنگل اورایسی زمینیں ہیں جو بلند وبالا درختوں سے ڈھپنی ہوتی ہیں۔اس لئے زرافہ کو یہ ضرورت لاحق ہے کہ اس کی گردن لمبی ہوتا کہ وہ بآسانی درختوں کے پتے کھاسکے اوراس جنگل کے پھلوں سے اپنی غذا حاصل کر سکے۔

ماحول کی تبدیلی سے حیوانات کی شکل بدل جاتی ہے اوران کے اعضاء نئے ماحول کی ضرورت کے مطابق نشوونما کرتے اور جدید حالات کے ساتھ مطابقت کر لیتے ہیں۔لامارک اپنے اس نظریئے کے بارے میں کہتا ہے:

جب حالات بدلتے ہیں تو حیوانات کی نئی ضرورتیں پیدا ہوتی ہیں اور اگر وہ ضرورتیں پوری نہ ہوں تو یہ حیوان ہلاکت سے دوچار ہو جائیں گے۔پس یہ حیوانات اپنی ان احتیاجات کو پورا کرنے کے لئے نئی عادات کے خوگر ہونے لگتے ہیں اور اپنی ضروریات اپنے اعضاء سے پہلے سے زیادہ کام لینے لگتے ہیں۔اس دوران میں یہ اعضاءنمو پانے لگتے ہیں اور دوسرے اعضاء جو نئی ضروریات میں بے فائدہ ہو جاتے ہیں، وہ کمزوری ونابودی کا شکار ہونے لگ جاتے ہیں۔پھرایک لمبے عرصے کے بعد نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حیوانات میں یہ تبدیلیاں موروثی بن جاتی ہیں، یہاں تک کہ اگر کبھی ان کی تولید کے اسباب و حالات ختم بھی ہو جائیں تو بھی یہ اپنے حال پر باقی رہتے ہیں۔مثلاً زرافہ کے اجداد چونکہ ایسی صحرائی زمین میں رہتے تھے، جہاں گھاس کی کمی ہوتی تھی،اس لئے وہ مجبور ہوئے کہ اپنی غذا درختوں کے پتوں سے حاصل کریں۔چنانچہ وہ ان پتوں اور شاخوں تک پہنچنے کے لئے کوشش کرنے لگے۔ان کوششوں اوراس سخت جدوجہد کا نتیجہ یہ نکلا کہ رفتہ رفتہ ان کی گردنیں لمبی ہونے لگیں اور بالآخراس قدر لمبی ہوگئیں کہ اب یہی زرافہ اس بات پر قادر ہے کہ لمبی گردن کے توسط سے اپنے سر چھ میٹر بلندی تک پہنچا سکتا ہے۔پس اب زرافہ اپنی ان کوششوں اور حالات وشرائط کی تاثیرات کے نتیجے میں نئی ضرورتوں کے مطابق اپنے بدن میں اس قسم کی تبدیلی لانے میں کامیاب ہوگیا ہے۔[1]

مکتب الٰہی ومکتب تحول

ملاحظہ فرمایئے! مکتب الٰہی اورمکتب تحول ہر دو کا کہنا یہی ہے کہ زرافہ کی گردن کی لمبائی درختوں سے غذا حاصل کرنے اور زندگی گزارنے کے ماحول کے عین مطابق ہے۔ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ امام جعفرصادق علیہ السلام فرماتے ہیں، چونکہ اس حیوان کی زندگی گھنے جنگلوں میں گزرتی ہے اوراس کے بارے میں الٰہی فیصلہ یہی تھا کہ یہ درختوں کے پتوں سے اپنی غذا حاصل کرے۔اس لئے اس قیوم خدا نے ابتداء سے ہی اسے لمبی گردن والا پیدا فرمایا اوراسے ایسے بدن اورایسے عضو کے ساتھ آراستہ کرکے روانہ فرمایا جو

---

[1] چہ میدانم؟ بنیاد انواع ص ۵۴۔۵۵

اس کی زندگی کی بقاء کے لئے لازمی تھا۔ تاکہ اس طرح یہ جانور اپنا منہ بآسانی بلند و بالا درختوں تک پہنچا سکے اوران کے برگ و بار کے ذریعے اپنے پیٹ بھرے اور سیر ہو سکے۔

لیکن لامارک کہتا ہے: زرافہ زندگی گزرانے کا علاقہ کم گھاس والا تھا اور اسے اپنی غذا پوری کرنے کے لئے درختوں کے پتوں سے استفادہ کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی تھی۔ تب وہ اپنا منہ ان پتوں تک پہنچانے کے لئے مجبور تھا کہ اپنی گردن کو جس قدر ہو سکے اونچا کرے اور اس کوشش کو جاری رکھے۔ چنانچہ وہ اس عمل کا تکرار کرتا اور یہ عمل بار بار انجام دینے سے رفتہ رفتہ اس کی گردن زیادہ بڑھنے اور نمو پانے لگتی۔ پھر کئی صدیوں کی اس مسلسل کوشش کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس حیوان کو نسلوں میں گردن کی لمبائی ایک موروثی صفت کی شکل اختیار کر گئی اور بعد کی نسلوں میں یہ صفت ان کے آباء واجداد سے میراث میں منتقل ہونے لگی۔

پس لامارک کا یہ مفروضہ دو بنیادوں پر قائم ہے

پہلی بنیاد یہ ہے کہ زندہ موجودات اپنی زندگی کے ساتھ فطری محبت رکھتے ہیں اور اس بقاء و دوام کے لئے وہ بہت زیادہ جدوجہد کرتے ہیں۔ جب کبھی ایسا موقع آجائے کہ طبیعی تغیرات اور غیر اختیاری انقلابات کی وجہ سے ان کی زندگی کا ماحول بدل جائے اور وہ نئی ضروریات سے دوچار ہو جائیں۔ تب وہ اپنی زندگی کی بقاء کے لئے ایک نئی جدوجہد کرنے لگتے ہیں اور نئے طریقوں سے آگے بڑھنے لگتے ہیں۔ تاکہ خود کو نئے ماحول کے ساتھ منطبق کر سکیں اور اپنے آپ کو موت کے منہ میں جانے سے بچا سکیں۔

لامارک مزید کہتا ہے، ان حیوانات کی یہ نئی اور مسلسل کوشش ان کے اعضاء اور ان کے جسم کی ساخت پر اثر انداز ہونے لگتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں بلند و بالا درختوں کے برگ و بار سے غذا لینے کی ضرورت زرافہ کی گردن کو لمبا کر دیتی ہے اور گردن کی ہڈیوں کے مہروں کو بڑا موٹا بنا دیتی ہے۔

دوسری بنیاد یہ ہے کہ یہ سطحی تبدیلیاں جو مسلسل اور دائمی جدوجہد سے کسی حیوان میں پیدا ہوتی ہیں، وہ رفتہ رفتہ اس نوع میں وروثی صفات کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور پھر قانون وراثت کی اساس پر سابقہ نسل سے آئندہ نسل میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ دور حاضر کے دانشمند اور ماہر محققین ان دو بنیادوں کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

بچگانہ مفروضہ

جنیوا یونیورسٹی کا ایک پروفیسر لکھتا ہے: لامارک کا یہ مفروضہ آج ہماری نگاہ میں واقعتا ایک بچوں والی بات دکھائی دیتی ہے۔ کیونکہ یہ بات تو ممکن ہے کہ کئی عضو استعمال یا عدم استعمال کے اثر سے نمو کرنے لگے یا اس کی نمو رک جائے۔ یا اس کے جوڑ نرم ہو جائیں یا سخت ہو جائیں یا بے حس و حامد ہو جائیں۔ یا اس کی حرکات میں سے کچھ پر اس کا مکمل انعکاس مرتب ہو یا وہ عضو کسی کام کا نہ رہے اور بالکل ناکارہ ہو جائے۔ لیکن اس امر کو کس طرح یقینی قرار دیا جا سکتا ہے کہ ورزش یا کسرت کے باعث ہڈیاں بھی لمبی یا چھوٹی اور موٹی یا پتلی ہو جائیں۔ پھر یہ بات کیسے تسلیم کی جا سکتی ہے کہ زیادہ تیرنے کی وجہ سے ایک لمبے عرصے کے بعد میرے بازو تیرا کی

والے پیروں میں تبدیل ہو جائیں یا ہوا میں بکثرت باز و ہلانے یا بازؤں کو بکثرت کھول کر رکھنے سے وہ پر و بال میں بدل جائیں۔

وہ پروفیسر مزید کہتا ہے کہ یہ تبدیلی بڑی آہستگی سے واقع ہوتی ہے اور اس کا آخری نتیجہ دیکھنے کے لئے کئی ایک نسلوں کو عمر گزر جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان پرندوں کے اجداد کہ جو اپنی ضرورت کے تحت مجبور ہو گئے تھے کہ ہوا میں اپنی غذا تلاش کرنے کے لئے نکلیں تو وہ بال و پر آنے سے پہلے کئی نسلوں کے دوران ہوا میں باز و ہلاتے رہے ہوں گے۔ اب وہ کون سی ضرورت تھی کہ جس نے انہیں اس بے ہودہ جدوجہد اور بے سود کششوں کی انجام دہی پر آمادہ کئے رکھا؟ کیونکہ اولین پرواز بھی تو بہت آگے کے زمانے میں میسر آنا تھی اور اس کا جلدی سے آنا ممکن نہیں تھا۔ اس مفروضے کے حامیوں کو یہ بات بھول جاتی ہے کہ زرافہ کے اجداد خود تو بڑی سخت کوششوں کے بعد چھوٹی چھوٹی شاخوں تک پہنچ جاتے تھے۔ لیکن ان کے چھوٹے بچوں کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ خود کو اس حد تک بلند کر سکیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ مفروضے ہر طرف سے ناپختہ دلائل اور ابہامات سے بھرا پڑا ہے۔[1]

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ لامارک کی گفتگو کی اولین بنیاد آج کے محققین کی نگاہ میں بالکل بچوں والی بات ہے اور ہر طرح کے ناپختہ دلائل سے بھری ہوئی ہے۔ پھر اس مفروضے کی دوسری بنیاد کے متعلق بھی جنیوا یونیورسٹی کا پروفیسر اسی قسم کی گفتگو کرتا ہے۔ یعنی اکتسابی صفات کے موروثی صفات بن جانے کے بارے میں بھی وہ اسی خیال کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے:

وراثت بذریعہ جرم نسل

ہمیں یاد رہنا چاہئے کہ لامارک کی فکر (۱۸۲۹-۱۷۴۴) کے دور میں پیش کی گئی تھی۔ جب کہ اس وقت کے سائنس دان زندہ اشیاء کی ساخت سے پوری طرح باخبر نہ تھے اور توالد و تناسل اور وراثت میں منتقل ہونے والی صفات سے بھی آگاہ نہ تھے۔[2]

لامارک کے دور میں ممکن تھا کہ وہ لوگ اکتسابی صفات کی وارثت کے بارے میں اس کے مفروضے کو قبول کرتے ہوں لیکن آج علمی تحقیق ترقی کر چکی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ موروثی صفات کیمیائی مالیکیولوں یا (جرثومات نسل) کے ذریعے منتقل ہتے ہیں جو (مرکزے کے کروموز) میں موجود ہوتے ہیں۔ ہر مرکزے میں کئی ہزار کیمیاوی مالیکیولز پائے جاتے ہیں کہ جن میں سے کچھ تو چہرے کی رنگت کے، کچھ آنکھ کی شکل یا رنگ کے اور چند ایک بالوں کی شکل یا رنگت کے ہوتے ہیں۔ اب اگر کوئی اکتسابی تبدیلی موروثی بننا چاہے، مثلاً جلد کی رنگت جو روشنی کے اثرات سے سیاہ ہوگئی ہو اور وہ موروثی صفت بن کر اگلی نسل میں منتقل ہونا چاہے تو اس کے لئے ضروری ہے جسم کی یہ تبدیلی کسی ایسے ذریعے سے ہو جو ابھی تک دریافت نہیں ہو سکا اور ہر جانب سے تناسلی غدود میں پہنچ جائے یا اس سے واضح الفاظ میں مرکزے میں نفوذ کر جائے اور ان کیمیاوی مالیکیولوں تک جا پہنچے جن کا تعلق جلد کی رنگت پیدا کرنے سے ہوتا ہے۔ وہ تناسلی غدود میں نفوذ کر کے ان کی جہت میں اس عمدگی کے ساتھ تبدیلی لے آئے کہ اس کے بچوں کی جلد کا رنگ آغاز تولد ہی سے بدل

---

[1] چہ میدانم؟ بنیاد انواع ص ۵۴-۵۶

[2] چہ میدانم؟ بنیاد انواع ص ۵۴-۵۶

جائے۔لیکن اس قسم کا نفوذ بالکل نا قابل فہم ہے اور کسی عصبی یا رشی رابطے کی رو سے ہم اس کو سمجھنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے کہ ماں باپ کے بدن کا کوئی مقام تبدیل ہو کر ان کے کیمیاوی مالیکیولوں کا تولیدی رنگ پیدا ہونے والے افراد کے جسم کے اس حصے کو موازی جہت پر لگا دے کہ آئندہ نسل کا رنگ وروپ تبدیل ہو جائے۔[۱]

صفات غیر موروثی

ایسی تمام تبدیلیاں جو کسی بدن پر بیرونی ماحول کے زیر اثر مرتب ہوتی ہیں اور کسی ایک رد کے اندر اس تبدیلی کی قابلیت پیدا کر دیتی ہیں۔وہ کبھی موروثی نہیں بن سکتیں۔بلکہ انواع کے تمام خصائص (جرثومۂ نسل میں پائے جاتے ہیں) یا نسل ونژاد کے تمام خصائص موروثی ہوا کرتے ہیں اور اپنے مقام پر پختہ ہوتے ہیں۔لہٰذا یہ خیال کہ اکتسابی صفات رفتہ رفتہ موروثی صفات بن جاتے ہیں،اس سے صرف نظر کر لینا بہتر رہے گا کیونکہ یہ ایک انہونی بات ہے۔[۲]

طبیعات کا کوئی ماہر جو بے تعصب ہو اور مفروضوں کے مقابلے میں تجرباتی نتائج اور تحقیقی قضایا کی قدر و قیمت کا قائل ہو، وہ کبھی بھی اس امر کو تسلیم نہیں کر سکتا کہ اکتسابی صفات بھی وارثت میں منتقل ہو جاتے ہیں۔وہ کبھی ایسی غلطی نہیں کرے گا کہ نادرست بنیاد پر کسی ایسے مفروضے کو تسلیم کرے جس کا تعلق تکامل اشیاء کے ساتھ ہو۔[۳]

بے بنیاد بات

لامارک کی گفتگو کی دوسری بنیاد یہ نکتہ تھا کہ ایک حیوان کے اعضاء پر مسلسل جدوجہد کے باعث جو تبدیلیاں مرتب ہوتی ہیں وہ موروثی بن جاتی ہیں اور اس کی آئندہ نسل وارثت کے طور پر ان صفات کی مالک بنتی رہتی ہے۔لیکن آج معلوم ہو چکا ہے کہ لامارک یہ باتیں اس دور میں کہتا رہا جب انسان اس قدر فکری ترقی نہ پا سکا تھا کہ آئندہ نسل کی طرف انتقال صفات میں جو کردار ''کرموزم'' اور نسلی خلیہ جات ''ژن'' انجام دیتے ہیں ان کے اسرار و رموز سے آگاہی حاصل کر سکتا۔لیکن اب وارثت کے کیمیاوی مالیکیول (ژن) کی شناخت ہو چکی ہے اور ان کے کردار کے رموز سے آشنائی حاصل کی جا چکی ہے۔لہٰذا اگر کوئی شخص لامارک کے پیش کردہ نظریے کی بنیاد پر تکامل کا مفروضہ گھڑنے کی کوشش کرے تو اس کی یہ کوشش بالکل بے اساس اور غلط قرار دے دی جائے گی۔

ہم نے ان معروضات میں مختصر طور پر لامارک کے نظریئے کا جائزہ لیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ دور حاضر کے محققین و ماہرین کے نزدیک لامارک کا نظریہ متعدد جہات سے نا قابل یقین اور نا قابل تسلیم ہے اور یہ لوگ اس کو علمی نقطۂ نگاہ

---

[۱] چہ میدانم؟ بنیاد انواع ص ۵۸۔ ۷۴۔ ۵۹

[۲] چہ میدانم؟ بنیاد انواع ص ۵۸۔ ۷۴۔ ۵۹

[۳] چہ میدانم؟ بنیاد انواع ص ۵۸۔ ۷۴۔ ۵۹

سے نا قابل اعتناء سمجھتے ہیں۔

ڈارون کا مفروضہ

اس کے بعد ہم چاہتے ہیں کہ ڈارون کے مفروضے کی بنیاد پر تکامل اور انواع حیوان کی تکوینی توجیہ کی وضاحت کریں اور پھر اس پر وارد ہونے والے علمی اشکالات کی طرف اشارہ کریں۔

انواع خلقت کی بنیاد کے سلسلے میں ڈارون کا مفروضہ تنازع بقاء اور انتخاب انسب کے قانون پر قائم ہے۔ ڈارون کی نظر میں حیوان کا جسم قابل تغییر ہے، لیکن وہ اس کے اعضاء کی تبدیلی کو اس کی اختیاری جدوجہد اور سعی پیہم کا نتیجہ تسلیم نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے خیال میں یہ تبدیلیاں کچھ ناشناختہ علل واسباب اور نامعلوم عوامل سے وجود میں آتی ہیں۔ چنانچہ ڈارون کے پیروکار ان اسباب کو ایک اچانک اور اتفاقی حادثے سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ ناگہانی تغیرات بعض مقامات پر اس امر کا موجب بھی بن جاتے ہیں کہ ایک زندہ موجود اپنے ماحول کے ساتھ بہتر مطابقت پیدا کرے اور طبیعت کے سب سے بہتر اور مناسب ترین موجود کی شکل اختیار کرے۔ پھر اس کے نتیجے میں وہ میدان تنازع بقاء میں اپنے آپ کو نابودی و ہلاکت کے خطرے سے نکالنے میں کامیاب ہو جائے۔

تغیر و انتخاب انسب

ڈارون کے مفروضے کا موضوع بنیادی طور پر دو باتوں سے مربوط ہے۔ قابلیت انسب وہ تبدیل ہونے کی صلاحیت پہلے سے زیادہ مناسب شکل کا انتخاب ہے۔[1]

ڈارون کی نظر میں یہ بات مشکل ہے کہ قابلیت تغییر کو بیرونی حالات کی تاثیر سے مربوط کر دیا جائے۔ کیونکہ بعض مقامات میں دیکھا گیا ہے کہ کچھ ایسے زندہ موجودات جو باہمی طور پر بہت زیادہ مختلف حالات میں زندگی کر رہے تھے۔ ان میں ایسی تبدیلیاں وقوع پذیر ہو جاتی ہیں کہ جنمیں بہت زیادہ مشابہت پائی جاتی ہے۔ اس کے برعکس بعض مقامات میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچھ زندہ اشیاء باہم مساوی اور موافق حالات میں زندگی بسر کر رہی ہوتی ہیں۔ لیکن ان میں ظاہر ہونے والی تبدیلیاں باہم بہت زیادہ مختلف ہوتی ہیں چنانچہ ڈارون کہتا ہے: یہ مشاہدات مجھے مجبور کرتے ہیں کہ میں قابلیت تغییر کے لیے ماحول کی تاثیر کا قائل ہونے کے بجائے یہ کہوں کہ قابلیت تغییر چند ایسے علل واسباب کا نتیجہ ہے کہ جن کی ہمیں کوئی خبر نہیں کہ وہ کیا ہیں؟ پس اسی وجہ سے ڈارون کے شاگردوں نے یہ نظریہ اختیار کیا کہ یہ تبدیلیاں کسی اتفاقی حادثے کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں۔[2]

ڈارون کے نظریے میں یہ تغیرات اور تبدیلیاں اتفاقی طور پیدا ہو جاتی ہیں، ان کا اس نوع کی زندگی سے کوئی رابطہ نہیں ہوتا

---

[1] چہ میدانم؟ بنیاد انواع ص ۵۹

[2] چہ میدانم؟ بنیاد انواع ص ۶۰

اوران میں جبری مطابقت والی کوئی صفت موجودنہیں ہوتی ۔ہاں ایسا ہوتا ہے کہ وہ ایسے مفید اعضاء کا انتخاب کرتی ہیں جو زیادہ مناسب ہوتے ہیں اور ایسی تبدیلیوں کو چھوڑ دیتی ہیں جو مضر یا خطرناک ہوتی ہیں ۔ پھر رفتہ رفتہ اس قسم کی صفات ماحول سے مطابقت والی کوئی صفت موجودنہیں ہوتی ۔ہاں ایسا ہوتا ہے کہ وہ ایسے مفید اعضاء کا انتخاب کرتی ہیں جو زیادہ مناسب ہوتے ہیں اور ایسی تبدیلیوں کو چھوڑ دیتی ہیں جو مضر یا خطرناک ہوتی ہیں ۔ پھر رفتہ رفتہ اس قسم کی صفات ماحول سے مطابق ہو جاتی ہیں جو یہاں ایک فرعی مظاہرے کی حیثیت رکھتا ہے۔[۱]

ڈراون کے مفروضے پر تنقید

جنیوا یونیورسٹی کا پروفیسر کہتا ہے: ڈارون کے مفروضے پر بہت زیادہ گرفت کی گئی اور ماہرین نے اس پر بہت سے اعتراضات کئے ہیں ۔اس کے بعد وہ خود اس نظریئے کے اہم حصوں کی تشریح پیش کرتا ہے، چنانچہ ہم اس کی گفتگو میں سے کچھ اہم مقامات کو آپ کے سامنے نقل کئے دیتے ہیں ۔"

تنازع بقاء میں ہمیشہ اس قدر بے رحمی نہیں ہوئی کہ جس قدر ڈارون نے خیال کر رکھی ہے۔اس میں شک نہیں کہ حیوانات کے اجسام میں عادلانہ توازن بکثرت قربانیوں سے پیدا ہوا ہے۔لیکن بہت سی تباہیوں اور ہلاکتوں کا افراد حیوانی کے اعضاء وجوارح میں پیدا ہونے والی مفید یا مضر تبدیلیوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔اگر مینڈکوں کا ایک جوڑا ہزاروں انڈے اور بچے دیتا ہے تو اوسطاً ان میں دو تہائی زندہ رہتے ہیں اور باقی کو یا تو دیگر افراد کھا جاتے ہیں یا وہ مہلت جراثیم کے سبب لقمہ اجل بن جاتے ہیں لیکن یہ چیز اس بات پر قطعاً مربوط نہیں کہ فلاح فرد حیوانی کی دم چھوٹی ہے یا بڑی اس کی جلد سفید ہے یا سیاہ، اس کا نظام نفس کامل ہے یا ناقص اور وہ اپنے اندر کافی مقدار میں ہاضم مائع رکھتا ہے یا نہیں؟ بلکہ افراد حیوانی کی یہ اجتماعی ہلاکت انتخاب انسب کے بغیر ہی وقوع پذیر ہو جاتی ہے۔کوئی عقل منداس بات کو قبول نہیں کرے گا کہ کسی حیوان کے چند ملی میٹر لمبے سینگ یا کسی کے دو تین ملی میٹر سے زیادہ موٹے سم اس کو بعض حادثات کے ضرر سے سے بچا لیتے ہیں ۔کیونکہ تنازع بقاء کوئی اولمپک مقابلوں کا میدان نہیں اور نہ ہی اسے گھوڑ دوڑ کے میدان سے تشبیہ دی جاسکتی ہے کہ اگر وہاں کسی گھوڑے کی گردن کی لمبائی اسے کامیاب بنانے دخیل مانی جا سکتی ہے تو یہاں بھی ایسی چیزوں کو سبب مان لیا جائے۔[۲]

جنیوا کا ایک محقق سائنس دان ڈارون کے مفروضے کو چند وجوہات کے تحت مورد تنقید قرار دیتا ہے۔اس کے بعد وہ جدید لامارک ازم اور جدید ڈارون ازم کو بھی زیر بحث لاتا اور ہدف تنقید بناتا ہے۔پھر اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ لامارک اور ڈارون دونوں کے پرانے نظریئے اس امر کی وضاحت کرنے سے قاصر ہیں کہ حیوانات کے نئے اعضاء کس طرح وجود میں آجاتے ہیں ۔

---

[۱] چہ میدانم؟ بنیاد انواع ص ۱۲۵۔۶۱

[۲] چہ میدانم؟ بنیاد انواع ص ۱۲۵۔۶۱

چنانچہ وہ کتاب (تکامل عمقی) کی فصل دہم میں لکھتا ہے:

اگر ہم اس امر پر غور کرنا چاہیں کہ وہ سطحی تکامل جو مختلف نسلوں اور انواع کے پیدا ہونے کا موجب بن جاتا ہے، اس کا آغاز کیسے ہوا۔؟ تو ہمارے تجرباتی معلومات میں سے کوئی ایک بھی ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم کسی گروہ، کسی جنس، کسی خاندان یا بالخصوص کسی صنف اور طبقے یا کسی شعبے کی پیدائش کے بارے میں کوئی معقول یا صحیح نظریہ اختیار کرسکیں۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ آثار قدیمہ کے ماہرین اور ماضی کے مدارک پر تحقیق کرنے والے فضلاء اس بارے میں اپنے ہونٹوں پر مہر سکوت لگائے بیٹھے ہیں۔[1]

پھر گیارہویں فصل (جست اور انطباق) میں لکھتا ہے:

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ زندہ موجودات ہمیشہ اپنے رہائشی ماحول سے بہت زیادہ انطباق پیدا کرلیتے ہیں۔ یعنی ان میں اپنی جائے سکونت کے حالات کے اندر زندگی گزارنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ لیکن بہت پہلے سے ماہرین طبیعیات کی توجہ مجموعی مطابقت کے علاوہ چند ایک جزئی انطباقات کی طرف بھی مبذول ہوئی ہے کہ جن پر غور کئے بغیر چارہ نہیں ہے۔ یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ اس موضوع کے متعلق افکار کا ایک عظیم حصہ ابھی تک (اصول آفرنیش) سے فیض حاصل کرنے پر مجبور ہے۔ چونکہ ہر ایک نوع ایک خاص عمل اور ایک خصوصی ذمہ داری لے کر آتی ہے اس لئے خالق نے اسے وہ سب کچھ عطا فرمایا دیا ہے جو اس کے لیے مفید اور ضروری تھا۔

برنارڈن ڈوسن پییرَ کہتا ہے: کوئی حیوان کسی مفید عضو سے محروم نہیں۔ اور نہ کوئی حیوان کسی غیر مفید عضو کا حامل ہے۔ چنانچہ ماہرین طبیعیات کی ایک بڑی جماعت اس نظریئے کی قائل ہوگئی ہے اور اس کا دفاع کرتی ہے۔[2]

خالق کا احسان

مختصر یہ کہ کافی عرصے سے ماہرین علم الحیات واجتماعیات اس بارے میں تحقیق کرتے رہے ہیں کہ ہر زندہ شئ اپنی زندگی کے ماحول سے کس طرح انطباق رکھتی ہے اور اس کے علل واسباب کیا ہیں؟ اس سے پہلے آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ لامارک اور ڈارون ہر دو کے نظریات اس مسئلے کا حل پیش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ وہ اس نکتے کی صحیح توجیہ وتشریح پیش نہیں کرسکے کہ ہر جاندار کے اعضاء کے اپنے ماحول کے ساتھ بہتر طور پر انطباق رکھنے کی بنیاد کیا ہے؟ نہ وہ کسی صحیح اور قابل قبول اساس پر اس کا کوئی علمی جواب دے سکے ہیں: بالآخر جنیوا یونیورسٹی کے پروفیسر نے الٰہیون اور خدا پرستوں کی منطق کی طرف اشارہ کیا اور بڑی صراحت کے ساتھ کہا کہ موجودہ دور میں مفکرین کی ایک کثیر تعداد قانون آفرنیش کی طرف توجہ کررہی ہے اور اب وہ یہ کہہ رہے ہیں

---

[1] چہ میدانم؟ بنیاد انواع ص ۱۱۴۔ ۱۲۳

[2] چہ میدانم؟ بنیاد انواع ص ۱۱۴۔ ۱۲۳

کہ حیوانات میں سے ہر نوع ایک خاص قسم کے عمل کی حامل ہے۔ اس لئے اس قادر وتوانا خالق اور عظیم خدا نے ان حیوانات کی تمام انواع کو ایسے اعضاء کے ساتھ پیدا فرمایا کہ جو ان کی زندگی میں ان کے لیے ضروری اور لازم تھے۔

مفردات راغب میں لفظ ''قیوم'' کا یہ معنی کہ ''المعطی لہ مابہ قوامہ'' (وہ ہر شئی کو وہ سب کچھ عطا کرنے والا ہے جس سے اس کا قوام اور اس کی بقاء ہے) یہ اسی بنیادی اصول کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی اس کائنات کا آفریدگار (قیوم) ہے اور اس نے ہر موجود کو وہ تمام وسائل عنایت فرمادئے ہیں جو زندگی کی راہ میں اس کی بقاء اور قائم رہنے کے لیے ضروری ہوسکتے تھے۔ یہ وہی بات ہے جو ماہرین حیاتیات واجتماعیات نے بحث انطباق میں کہی ہے۔ انہوں نے واضح کیا ہے کہ ہر وہ زندہ موجود اپنے اختیار میں دئے گئے اعضاء و قویٰ اس کی زندگی کے ماحول سے بہت زیادہ سازگاری اور موافقت رکھتے ہیں۔

ہماری سابقہ تشریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ کلمہ ''حی'' سے دو مطلب حاصل ہوتے ہیں:

اول: اس جہان کا خالق جو معبود واقعی ہے وہ خود بخود زندہ ہے۔

دوم: وہ زندہ خالق ان تمام زندہ اشیاء کا پیدا کرنے والا ہے۔

اب اگر کوئی سوال کرے کہ یہ تو قطعی بات ہے کو اس کرۂ زمین پر ایک وقت ایسا گزرا ہے جب اس کے تمام طبیعی عناصر اور معدنی مادے بے جان اور مردہ تھے اور ان میں سے کوئی بھی زندہ نہ تھا۔ پھر ان میں زندگی جس طرح آئی اور کس راستے سے اسے وجود حاصل ہوا؟ اس سوال کا جواب خدا اور اس کی طرف سے آفرنیش پر ایمان رکھنے والے یہ دیں گے کہ یہ کائنات اور اس خداوند زندہ کے حکم سے زندہ ہوئی ہے۔ چونکہ فقط زندگی عطا کردینا ہی زندگی کی بقاء ودوام کے لیے کافی نہیں جب تک اسے وسائل زندگی سے آراستہ نہ کیا جائے اور ضروری آلات سے مسلح نہ کیا جائے وہ اپنے ماحول کے مطابق زندگی گزرانے اور زندہ رہنے پر قادر نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے آیت الکرسی میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ''حی'' ہونے کی صفت کے تذکرے کے بعد فوراً ''قیوم'' ہونے کی صفت کا تذکرہ فرمایا ہے۔ تاکہ اس نکتے کو سمجھا جاسکے کہ ان خداوند قیوم نے جہاں موجودات کائنات کو نعمت زندگی سے مالا مال فرمایا، وہاں ان کے زندگی گزارنے اور باقی رہنے کے لیے بڑے حکیمانہ انداز میں ضروری منصوبہ بندی بھی فرمادی ہے۔ چنانچہ تمام موجودات کو ایسے مناسب اعضاء اور بہترین قویٰ عنایت فرمادئے ہیں جو ان کے زیستی ماحول سے بڑی مناسبت اور موافقت رکھتے ہیں اور وہ ان سے مکمل فائدہ اٹھانے پر قدرت واختیار بھی رکھتے ہیں۔ پس ان زندہ اشیاء کا ضروری اعضاء وقویٰ سے آراستہ ہوتا بیک وقت اس خالق عظیم کی دوصفات ''حی'' و قیوم'' سے متصف ہونے کا مظہر بن رہا ہے۔

قیوم یا ایک ازلی حقیقت

لغت کی کتابوں میں قیوم کا ایک دوسرا معنی یہ ملتا ہے ''الذی بدء لہ'' وہ کہ جس کا کوئی آغاز اور ابتداء نہ ہو۔ پس اس معنی کے لحاظ سے قیوم اس ہستی کے لئے بولا جاتا ہے کہ جو ازلی وجود کی مالک ہو۔ یعنی اس کے وجود کے لئے نقطہ آغاز اور ابتداء یا کسی معین وقت

یا زمانے کی ضرورت نہ ہو۔ گویا وہ ہمیشہ سے ہو ایسی ہستی سوائے ذات اقدس الٰہی کے اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

چونکہ باری تعالیٰ کی حیات اس کی ذات مقدس عین حیات ہے۔ بنا بریں مکتب توحید کے نزدیک کوئی فرق نہیں، چاہے ہم یوں کہہ دیں کہ ذات اقدس الٰہی ازلی اور قیوم ہے یا یوں کہہ دیں کہ اس پروردگار عالم کی ذات ازلی ہے اور اس کے لئے کوئی آغاز نہیں ہے۔ لیکن جب اس نظر سے دیکھا جائے کہ ذات حق تعالیٰ کی قیومیت اور حیات دنیوی زندگی کے ظہور میں زیر بحث آتی ہے، اور اس کی صفت قیوم پر گفتگو علمی اور دینی اعتبار سے مورد استفادہ قرار پا سکتی ہے، اس لئے ضروری ہے کہ ہم صفت قیوم کو اپنی بحث و گفتگو کا موضوع قرار دیں۔ بہت عرصہ سے دیکھا جا رہا ہے کہ بعض افراد گاہ بگاہ یہ سوال کرتے ہیں کہ یہ جہان تو رب العزت کی طرف سے ہے۔ لیکن خود رب العزت کا وجود کہاں سے آیا۔؟ یا اس طرح سوال کرتے ہیں کہ کائنات کو تو خداوند تعالیٰ نے پیدا کیا ہے، لیکن خداوند تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا ہے؟

اس سوال کے جواب میں فلسفے کی ایک بحث سے استفادہ کیا جا سکتا ہے، کہ محقق علماء فلسفہ کہتے ہیں: ''الذاتی لا یعلل'' یعنی وہ چیز جو کسی موجود کی ذات ہو، یعنی وہ چیز جو کسی موجود کی ذات کا مستقل لازمہ ہو۔ اس کے تحقق کے لئے کسی علت کی احتیاج نہیں ہوتی۔ کیونکہ ذاتی کبھی ذات سے جدا نہیں ہوتی ذات کے وجود میں آتے ہی اس کی ذات بغیر کسی علت کے وجود میں آ جاتی ہے، اس بحث کو واضح کرنے کے لئے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

ذات وذاتی

زوجیت یعنی جوڑا ہونا۔ دو کے عدد کی ذات کو لازم ہے اور یہ لازمہ اس عدد کی ذات سے کبھی جدا نہیں ہو سکتا۔ جہاں کہیں دو ہونا صادق آئے گا، وہاں اس کا یہ لازمہ یعنی ان کا جفت ہونا ایک ضروری چیز ہے، لیکن اس جفت ہونے کے تحقق کے لئے دو ہونے کا تحقق کافی ہے او جب دو ہوئے تو جفت بھی ہو گئے۔ پس ثابت ہوا، زوجیت یعنی جفت ہونا۔ دو ہونے کی ذاتی ہے۔ اور اس کا لازمہ ہے اس لئے یہ ذاتی کبھی بھی اپنی ذات سے جدا نہیں ہو سکتی

چونکہ وجود بھی وجاب الوجود کی ذات کا لازمہ ہے، اس لئے نہ تو وجود ذات کا لازمہ ہے، اس لئے نہ تو وجود ذات خدا سے جدا ہو سکتا ہے اور نہ ہی ذات خدا وجود سے جدا ہو سکتی ہے۔ وہ ممکن الوجود ہے کو جواز خود وجود نہیں رکھتا اور اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کا خدا اس کو وجود بخشے تو وہ وجود میں آئے۔ پس اس وضاحت کے بعد اب اگر یہ سوال کیا جائے کہ ''یہ جہان ہستی تو خداوند عالم کی طرف سے ہے، لیکن خداوند عالم کی ہستی کہاں سے آئی؟'' اس کے جواب میں یہی کہا جائے گا کہ وجود تو اس ذات واجب کا لازمہ ہے اور ایک ذاتی کی علت اور سبب وجود کے متعلق سوال کرنا ہی غلط ہوتا ہے، کیونکہ ذاتی علیحدہ علت کی طرف احتیاج ہی نہیں رکھتی۔

اس سے زیادہ واضح مثال یہ ہے: ان دو سوالوں کا پہلو بہ پہلو رکھ کر دیکھیں اور ان پر ایک دوسرے کے ساتھ غور کریں تو جب آپ پہلے سوال کا جواب دیں گے تو گویا اسی سے آپ نے دوسرے سوال کا بھی جواب دے دیا ہے۔ دو سوال یہ ہیں۔ کائنات کی

روشنی تو نور سے ہے لیکن خود نور کی روشنی کس چیز سے ہے؟ اسی طرح کائنات کا وجود تو خدائے تعالیٰ سے ہے لیکن خدا کا وجود کہاں سے ہوا؟ یا یوں کہئے کہ تاریک اور اندھیرے جہان میں روشنی تو نور کے صدقے آتی ہے، لیکن نور کس چیز سے روشن ہوتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نور کسی دوسری شئی سے روشن نہیں ہوتا، بلکہ نور کی روشنی نور کی ذاتی ہے اور یہ ذات نور کا لازمہ ہے۔

اور ذاتی ذات سے کبھی بھی جدا نہیں ہوسکتی اور الگ سے کسی علت کی احتیاج نہیں رکھتی پس یہ جہان تو خالق اکبر سے وجود میں آیا اور خدائے عظیم کے نور نے آسمان وزمین کو وجود بخشا ہے۔ لیکن خود خدوندتعالیٰ کا وجود کہیں اور سے نہیں آیا، کیونکہ وجود تو اس ذات حق کا عین ذات ہے اور وہ ذات حق عین وجود ہے، جب کہ کسی وجود کی ذاتی کسی دوسری علت کی محتاج نہیں ہوتی۔

ذاتی اور ذات کے لازمہ کے عنوان سے جو بحث پیش کی گئی ہے یہ اس سوال کا جواب حلی یعنی وضاحتی جواب ہے کہ خدا کہاں سے ہوا؟ یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ اس جواب کا سمجھنا عوام الناس کے بعض طبقات کے لئے خاصہ مشکل ہے۔ مگر ہم اس سوال کا نقضی جواب دے سکتے ہیں۔ چنانچہ جن لوگوں نے اپنے ذہن میں اس سوال کا تصور کیا اور پھر خود ہی اس کا نقضی جواب دیا ہے ان میں سے ایک مشہور ماہر طبیعات ''چارلس ڈارون'' نامی سائنس دان ہے۔ ڈارون کی سوانح حیات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے والا ایک خدا پرست شخص تھا۔ اس نے ۱۸۷۳ء میں جرمنی کے ایک سائنس دان کے نام جو خط لکھا، اس کی ابتداء میں پروردگار عالم کے وجود پر استدلال کیا ہے۔ پھر اس خد کے آخر میں اس نے اسی مذکرہ بالا سوال کی طرف اشارہ کیا اور پھر اس کا نقضی جواب دیا ہے:

چونکہ اس کا یہ خط علمی اور ایمانی نقطۂ نگاہ سے موجب نصیحت اور مفید ہے، نیز یہ کہ حلی جواب جی نسبت نقضی جواب کا سمجھنا آسان ہے۔ اس لئے ہم عمومی فائدے کے مدنظر اس خط کو مکمل طور پر نقل کئے دیتے ہیں۔

ڈارون کا خط:

عقل رشید اور فکر سلیم کو اس امر میں معمولی سا شبہ بھی نہیں کہ محال ہے یہ بات کہ یہ وسیع کائنات جو روشن نشانیوں اور محکم شواہد سے بھری پڑی ہے اور نفوس ناطقہ اور عقول مفکرہ جیسے موجودات اس میں موجود ہیں، یہ اتفاقی طور پر ایک بے شعور حادثے کے ساتھ وجود میں آ گئی ہے۔ کیونکہ ایک اندھا اور بے شعور حادثہ اس چیز پر کبھی قادر نہیں ہوسکتا کہ اس قدر منظم اور حکیمانہ نظام کو وجود میں لے آئے۔ میری نگاہ میں یہ کائنات ذات اقدس الٰہی کے وجود پر ایک بہت بڑی دلیل ہے اور جب علم ومنطق کی تائید سے مالا مال اس قدر بیش قیمت دلیل موجود ہے تو ہمیں ایسے دیگر براہین پر بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں جو خداوند کائنات کے وجود کو ثابت کرتے ہیں، کیونکہ ممکن ہے کہ یہی برہان بہت سارے اہل علم ودانش کو مطمئن کر دے۔ البتہ جب میں اولین بار وجود خدا کے اثبات کی تحقیق کی بحث میں وارد ہوا تھا تو میرے دل میں شک وشبہ کے طوفان اٹھتے تھے۔ اس دور میں ایک سوال جو میں اپنے آپ سے کیا کرتا وہ یہ تھا (کہ اولین علت کہاں سے آئی؟) کیا خداوند عظیم کے لئے بھی آغاز وانجام ہے؟ پھر زیادہ دیر نہ گزری کہ مجھے یہ معلوم ہوگیا کہ مادہ

پرست مکتب کے پیروکار افرا بھی اس قسم کے شک وشبہ میں گرفتار ہیں، پس انہیں بھی خود سے یہ سوال کرنا چاہیئے کہ (مادہ کہاں سے آیا؟) کیامادے کے لئے بھی ابتداء وآغاز ہے؟ یامادہ ازلی ہےاوراس کا کوئی آغاز نہیں؟ اگر مادہ ازلی ہے جیسا کہ مادیون نے گمان کر رکھا ہے تو پھر دوسرا سوال یہ ہوتا ہے (کہ یہ منظم سلسلہ کہاں سے آیا ہے؟ اور حکیمانہ ترتیب کہ جس کے مقابلے میں عقل انسانی حیران اور درماندہ ہوکر اپنے عجز و ناتوانی کا اعتراف کرنے لگتی ہے یہ کس طرح وجود میں آ گئی ہے؟[1]

اس سوال کا نقضی جواب سب لوگوں پر واضح کرنے کے لئے ضروری ہوگا کہ ہم ڈارون کے اس خط کی کچھ توضیح پیش کر دیں۔ ڈارون جوخود مکتب الٰہی کے معتقدین میں تھا۔ وہ کہتا ہے: عقل سلیم کے نزدیک یہ ایک امر محال ہے کہ عظیم نظم وحساب جو اس جہان خلقت میں موجود ہے، یہ محض کسی اتفاقی حادثے اور بے شعور ٹکراؤ کے سبب وجود میں آ گیا ہے، پس وہ اس سے استدلال کرتا ہے کہ عالم کائنات ایک حکیم وعلیم خدا کی تخلیق ہے۔

ڈارون مزید کہتا ہے: پہلے پہل تو میں اندرونی طور پر کشمکش کا شکار ہوا اور اپنے آپ سے پوچھتا تھا کہ اس کائنات کو تو خدائے تعالیٰ نے وجود بخشا، لیکن خدائے تعالیٰ کو کس نے وجود دیا۔؟ بڑی سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے تک پہنچا کہ بالفرض میں خدائے خالق کے عقیدے سے دست بردار ہو جاؤں اور مادی مکتب کے مطابق یہ عقیدہ رکھ لوں کہ یہ جہان مادے کے سبب موجود ہوا ہے، تو بھی اندرونی کشمکش سے نجات نہیں پاسکوں گا۔ تب مادے کے بارے میں یہی سوال سامنے آئے گا کہ اگر یہ عالم مادے سے پیدا ہوا ہے۔ تو پھر مادہ کہاں سے وجود میں آیا؟ مادی مکتب کے پیروکار جواب میں کہیں گے کہ مادہ ازلی اور قدیم ہے وہ ہمیشہ سے ہے اور اس کے لئے کوئی آغاز نہیں ہے۔ اس وقت میں ان کے سوال کے اس جواب سے خداوند تعالیٰ کے وجود کے بارے میں استفادہ کرتا ہوں اور خدا کے بارے میں کئے گئے اس سوال (خدا کہاں سے آیا؟) یہی جواب دیتا ہوں کہ خداوند تعالیٰ ازلی اور قدیم ہے، وہ ہمیشہ سے ہے اور اس کی کوئی ابتداء نہیں ہے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ میں چاہے الٰہی بنوں یا مادی ناچار مجھے ایسے کسی ایک وجود کا قائل ہونا پڑتا ہے جس کی کوئی ابتداء نہ ہو اور وہ ازلی اور قدیم ہو۔ پھر خواہ وہ ازلی حقیقت خداوند عالم ودانا ہو یا ایک بے شعور اور نادان مادہ ہو البتہ یہ فرق ضرور ہوگا کہ اگر مادی مکتب کی پیروی کروں تو یہ کہنا ہوگا کہ یہ حیرت انگیز نظام اور حکیمانہ قوانین ایک بے شعور مادہ کے طفیل محض اتفاقی حادثے کے ساتھ وجود میں آ گئے، جب کہ عقل سلیم اس بات کو کسی طرح قبول نہیں کرتی اور وہ اس قسم کی بات کی تائید کے لئے آمادہ نہیں ہوتی۔ لیکن اگر الٰہی مکتب کا معتقد بن جاؤں تو میرا وجدان بڑے آرام اور اطمینان کے ساتھ اعتراف کرتا ہے کہ یہ باقاعدہ قوانین اور منظم سلسلے پر مشتمل کائنات اس خدائے تعالیٰ کی مخلوق ہے جو ازلی اور قدیم ہے۔ اس نے اپنے حکیمانہ علم وارادہ کے ساتھ اس کو خلق فرمایا۔ اور یہ بات عقل کے نزدیک مورد قبول اور علم ومنطق کے عین مطابق ہے۔

قال علی علیہ السلام: الحمد للہ الدال علی وجودہ بخلقہ و بمحدث خلقہ علی

---

[1] اصل الانواع، ص ۲۶

ازلیته[1]

حضرت امام علی علیہ السلام اس عالمانہ منطق کو دو مختصر اور جامع جملوں میں بیان کر رہے ہیں۔ایک طرف آپ سے اس جہان خلقت کے نظم کو اس کے خالق قادر کے علم وحکمت کا گواہ قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔''قابل حمد وستائش ہے وہ اللہ جس نے اپنی حکیمانہ مخلوق کو اپنے وجود مقدس کی دلیل قرار دیا ہے'' تو دوسری طرف سے آپ نے اس جہان حادث کو ایک قدیم مبداء تک منتہی کیا ہے تاکہ اس سوال کی ضرورت ہی نہ رہے کہ (خدا کہاں سے آیا؟) چنانچہ فرماتے ہیں: یہ حادث اور مخلوق جہان اپنے خالق خداوند تعالیٰ کی ازلیت کی دلیل ہے۔

حقیقت ازلی

قیوم کا معنی ہے ایک ازلی حقیقت اور ایک ایسی ہستی جس کی کوئی ابتداء نہ ہو۔قیوم کے اس معنی میں اس سوال کا جواب ہے کہ (خدا کہاں سے آیا ہے؟) ایک قائل خدا یہ کہتا ہے:۔ یہ عالم کائنات حادث ہے اور ایک قادر خدا کی قدرت سے موجود ہوا ہے۔ لیکن اگر ایسے خدا پرست مومن سے کوئی یہ پوچھے کہ خود ذات خدا کہاں سے وجود میں آئی؟ تو وہ یہ جواب دے گا کہ وہ خدا قیوم یعنی ازلی اور قدیم ہے۔خداوند تعالیٰ حادث نہیں ہے کہ اسے کسی محدث یعنی بنانے والے کی ضرورت ہو۔پروردگار کا وجود کسی نقطہ آغاز سے شروع نہیں ہوا۔اور نہ ہی کسی آغاز کا محتاج ہے کہ اس کو کسی آغاز کرنے والے کی ضرورت ہو۔کائنات کا آفرینش کی طرح زندگی کا ظہور بھی ممکن الوجود ہے،یعنی ایک خالق کا محتاج ہے۔اس لئے اس کے بارے بھی وہی سوال کیا جاسکتا ہے اور ایک مادہ پرست ایک مؤمن خدا پرست سے یہ سوال کرسکتا ہے:۔زندہ اشیاء کی زندگی تو خداوند کریم کی طرف سے ہوئی،لیکن خود خداوند تعالیٰ کی زندگی کہاں سے آئی؟ تو وہ مومن جواب میں کہے گا۔خداوند تعالیٰ کی حیات اس کی عین ذات ہے،جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات قدیم اور ازلی ہے اسی طرح اس کی حیات بھی قدیم اور ازلی ہے اور اس کی حیات حادث نہیں کہ کسی خالق وموجد کی محتاج ہو۔

جاء رجل الی أبي جعفر علیه السلام فقال اخبرني عن ربك متی کان فقال: ویلك انما یقال لشیئی لم یکن متی کان۔ ان ربي تبارك و تعالیٰ کان ولم یزك حیا بلا کیف[2]

بے آغاز زندگی

ایک شخص حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا:۔ مجھے بتائیے کہ خدا کب سے ہے؟ اور وہ

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۵۲

[2] الکافی ج ا ص ۸۸

کیسے موجود ہوا؟ تو حضرت نے فرمایا:۔ افسوس ہے تجھ پر یہ سوال اس چیز کے متعلق کیا جاتا ہے جو ایک وقت میں موجود نہ ہو اور پھر کبھی موجود ہوگئی ہو، اس کے متعلق سوال کیا جاسکتا ہے کہ وہ کب موجود ہوئی؟ لیکن میرا خدا ایسا نہیں ہے، وہ ہمیشہ سے ہے اور اس کی حیات کیف وکیفیت سے منزہ ومبریٰ ہے۔

جب مادہ پرستوں سے یہ سوال کیا جائے کہ زندہ موجودات کی حیات کہاں سے آئی؟ تو وہ اس کا صحیح جواب نہیں دے سکتے اور وہ دور حاضر کی منطق ودانش کے مطابق کوئی علمی اور قطعی جواب دینے پر قدرت نہیں رکھتے، فقط یہی کہتے ہیں کہ اس کرۂ زمین کی ابتدائی کیفیت کچھ اس طرح تھی کہ اس میں خودبخود زندگی ظاہر ہوگئی۔ حالانکہ ہم گزشتہ تقریر میں حیات کی توضیحی بحث کے ضمن میں بیان کرچکے ہیں کہ یہ سوائے ایک دعویٰ بلا دلیل کے کچھ بھی نہیں ہے، نیز ماہرین اور محققین کی ایک بہت بڑی جماعت اس نظریئے کو بالکل غلط قرار دیتی ہے۔

کتاب تاج العروس اور لسان العرب میں قیوم کا ایک اور معنی بیان ہوا ہے **القیوم هو الاقائم بنفسه مطلاقا لا بغیره وهو مع ذالك یقوم به کل موجود** قیوم وہ ذات اقدس الٰہی ہے کہ اپنے تمام صفات کمال کے ساتھ خودبخود قائم ہے، وہ کسی غیر کی طرف معمولی سا احتیاج بھی نہیں رکھتی اور تمام موجودات عالم اور پورا جہان ہستی اس ذات مقدس کے سہارے قائم ہے۔

ممکن محتاج واجب ہے

کتب کا فلسفہ میں ایک بحث آتی ہے کہ ممکن الوجود جو واجب الوجود کا محتاج ہوتا ہے، اس کی احتیاج کی وجہ اس کا حدوث ہے یا اس کا امکان؟ بالفاظ دیگر آیا ممکن فقط اپنے وجود میں آنے کے لئے واجب کا محتاج ہوتا ہے یا وہ اپنے ممکن الوجود ہونے کی وجہ سے ہمیشہ واجب کا محتاج رہتا ہے۔؟

بعض کا خیال ہے کہ ممکنات کا خداوند تعالیٰ کی طرف محتاج ہونا فقط اس لئے ہے کہ ہر ممکن لباس وجود کے ساتھ آراستہ ہونے اور جہان ہستی میں قدم رکھنے میں پروردگار کا محتاج ہوتا ہے۔ جب تک خدا اس کو وجود نہ بخشے وہ موجود نہیں ہوسکتا، لیکن اس کے بعد وہ واجب الوجود خدائے تعالیٰ کا محتاج نہیں رہتا۔ چنانچہ وہ اس کی یہ مثال دیتے ہیں۔ کہ جیسے ایک عمارت اپنے تحقق اور وجود میں آنے کے لئے ایک معمار کی محتاج ہوتی ہے، لیکن جب وہ بن جاتی ہے تو پھر اپنی بقاء میں اس معمار کی محتاج نہیں اور معمار نہ رہے تو بھی عمارت موجود رہ سکتی ہے۔

لیک معروف فلسفی حکیم سبزواری اس نظریئے کو غیر صحیح قرار دیتے اور فرماتے ہیں کہ ممکن کی واجب کی طرف احتیاج کا سبب امکان ہے نہ کہ حدوث۔ یعنی ممکن الوجود چونکہ ممکن ہے اس لئے واجب کا محتاج ہے، لہٰذا وہ ہر جگہ اور ہر حال میں ہمیشہ واجب الوجود کی عظیم درگاہ میں نیازمند، محتاج اور فقیر ہے۔ اس کی اس امکانی احتیاج سے اس کے حدوث اور پھر بقاء میں کوئی فرق نہیں، یعنی وجود میں آنے، موجود رہنے اور پھر باقی رہنے میں وہ مسلسل واجب کا محتاج ہے۔

لا یفرق الحدوث والقاء اذلم یکن للممکن اقتضاء

(ممکن کے لئے اپنے حدوث اور بقاء میں کوئی فرق نہیں کیونکہ ممکن کے ہاں اقتضاء ہی نہیں ہے)

پھر آپ عمارت اور معمار والی مشہور مثال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں اس عمارت کو خود ان کہنے والے صاحبان کے سر پر گرائے دیتا ہوں۔ چنانچہ اس کی توضیح یوں کرتے ہیں کہ یہ مثال ممثل یعنی مورد مثال سے تطابق نہیں رکھتی معمار کی عمارت سے وہ نسبت نہیں جو واجب الوجود کی نسبت ممکن سے ہے۔ کیونکہ معمار عمار کی ہستی کو وجود میں نہیں لاتا، بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ وہ مواد جو پہلے سے دنیا میں موجود ہوتا ہے، اسے اپنے فن اور ہاتھوں کی محنت کے ساتھ جمع کرتا ہے۔ یعنی وہ اینٹیں۔ لکڑی۔ پتھر اور لوہے وغیرہ کو اکٹھا کرتا ہے اور بالآخر اسے ایک عمارت کی شکل میں ڈھال دیتا ہے۔ پس وہ معمار اس عمار کی علت معدہ ہے۔ اب اس کے بعد اس عمارت کی بقاء کا اس معمار سے تعلق نہیں، بلکہ اس کی بقاء اس مصالحے۔ مٹی۔ گارا۔ چونا۔ سیمنٹ وغیرہ کی باہمی گرفت کی قوت اور عمارت کے خشک رہنے کی کیفیت پر منحصر ہے، یعنی اس عمارت کی بقاء ان طبیعی علل واسباب کا نتیجہ ہے۔ لیکن یاد رہے کہ اس معمار۔ اس عمارتی مصالحے اور اس کے اندر باہمی گرفت کی ساری خاصیت کا خلق اور مؤثر حقیقی اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی اور نہیں ہے۔

حکیم سبزواری ممکن کی واجب سے نسبت کی وضاحت کے لئے سایہ اور صاحب سایہ کی مثال پیش کرتے اور فرماتے ہیں:۔

ہر سایہ صاحب سایہ کا بلا قید وشرط تابع محض ہے۔ وہ سایہ دار شئی کے پیدا ہونے سے پیدا ہوتا اور اس کے باقی رہنے تک باقی رہتا ہے۔ اس کی حرکت کے ساتھ حرکت کرتا ہے اور اس کے ٹھہرنے سے ٹھہر جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ سایہ از خود کچھ بھی نہیں جو کچھ ہے وہ دراصل سایہ دار شئی ہے۔[1]

کائنات کو قائم رکھنے والا

فلسفے کا یہ مسئلہ دینی منطق میں ''کلمہ قیوم'' کے زیر بحث معانی کے ذریعے سے داخل ہوا ہے۔ جیسا کہ کتاب تاج العروس اور لسان العرب میں ہے کہ ''کلمہ قیوم'' خداوند تعالیٰ ہے جو بذات خود قائم ہے اور کسی غیر کا معمولی حد تک بھی محتاج نہیں، لیکن تمام موجودات کائنات اس کی ذات مقدس کے باعث قائم اور اپنی جگہ پر برقرار رہیں۔

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ جہان ہستی نہ فقط اپنے موجود ہونے میں خداوند قیوم کا محتاج تھا، بلکہ اس جہان کا قیام اور اس کائنات کا نظام بھی اس کی ذات اقدس سے وابستہ ہے۔ ہاں اس باری تعالیٰ کا فیض لحظہ بہ لحظہ اور دائمی طور پر اس پورے جہان تک پہنچ رہا ہے اور وہ اس کی قدرت سے برقرار ہے۔

اگر نازی کند از هم فرو ریزند قالبها

(اگر ناز کریں تو یہ سارے قالب اور سانچے گر کر تباہ ہو جائیں)

---

[1] شرح منظومہ سبزواری ص ٦٦

اس دائمی فیض اور مسلسل ربط کو قارئین کے سامنے روشن کرنے کے لئے ایک مثال یوں پیش کی جاسکتی ہے:۔ دیکھئے یہ بجلی اپنے مرکز یعنی بجلی گھر سے پولوں۔ تاروں اور دیگر آلات کے ذریعے ہر طرف روانہ ہوتی ہے اور آپ دیکھتے ہیں کہ ایک لمحے میں کئی لاکھ بلب اور ٹیوبیں روشن ہوجاتی ہیں۔ ہزاروں لاؤڈ سپیکر بولنے لگتے ہیں، کارخانوں میں سینکڑوں مشینیں متحرک ہوجاتی ہیں اور لا تعداد کارکنان اسی بجلی کے سہار اپنے اپنے شعبوں میں کام شروع کر دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ بجلی کے رواں ہونے سے گویا پورے معاشرے کے وجود میں ایک زندگی دکھائی دینے لگتی ہے اور متمدن دنیا میں ایک ہماہمی پیدا ہوجاتی ہے۔

بجلی سے مسلسل رابطہ

تاہم واضح ہے کہ صرف بلبوں اور ٹیوبوں کے روشن ہوجانے، لاؤڈ سپیکروں کے آواز دینے اور مشینوں کے حرکت میں آ جانے سے ہماری وہ احتیاج ختم نہیں ہوتی کہ جو ہم بجلی گھر سے رکھتے ہیں۔ بلکہ ضروری ہوتا ہے کہ بجلی کے لئے ہمارا یہ رابطہ بجلی گھر سے مسلسل اور دائمی طور پر قائم رہے۔ تا کہ ہماری یہ روشنی اور حرکت وفعالیت کی کیفیت برقرار رہ سکے۔ اگر بجلی گھر سے ہمارا یہ رابطہ ایک لمحے کے لئے بھی ٹوٹ گیا اور بجلی نہ پہنچی تو ہماری ساری مشینیں رک جائے گی، بلب بجھ جائیں گے اور لاؤڈ سپیکر بے آواز ہوجائیں گے۔ یوں معلوم ہوا کہ بلب۔ مشینیں اور دیگر ساری چیزیں جہاں اپنی روشنی اور حرکت کے لئے بجلی گھر کی محتاج ہیں، وہاں اپنی اس روشنی کی بقاء واستمرار میں بھی اس مرکز سے دائمی فیض پانے اور اس سے رابطہ برقرار رکھنے کی محتاج ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا دائمی فیض

یہ سارا جہان ہستی اپنے طبیعی نظام اور حیرت انگیز ترتیب کے ساتھ اسی خداوند کے نور سے وجود میں آیا اور اسی کے نور سے منور ہوا ہے اور اسی ذات احدیت کے فیض لامحدود سے انہیں خلعت وجود نصیب ہوئی ہے۔ لیکن ان ممکنات کی اللہ تعالیٰ کی طرف یہ احتیاج یہیں ختم نہیں ہوجاتی بلکہ انہیں ہمیشہ ضرورت لاحق رہتی ہے کہ یہ فیض متواتر اور مسلسل طور پر برقرار رہے۔ تا کہ یہ عظیم کائنات قائم رہ سکے اور اس کی یہ تکوینی حرکت تسلسل واستمرار کے ساتھ باقی رہے اور ''قیوم'' کا معنی بھی یہی ہے۔ یعنی رب العزت نے اس جہان اور اس کے باسیوں کو یہ نعمت عطا فرمائی اور پھر وہ اس پر اپنی نظر عنایت رکھے ہوئے ہے۔ پس یہ عالم اس ذات حق تعالیٰ کے زیر سایہ اور اس کی متواتر دائمی عنایات کے ذریعے قائم ہوا اور قائم ہے۔

قال علی علیہ السلام: کل شیئی خاضع لہ و کل شیئی قائم بہ[1]

امام علی علیہ السلام نے فرمایا:۔ تمام موجودات عالم اپنے خالق اللہ تعالیٰ کی باعظمت درگاہ میں سر تعظیم جھکائے ہوئے ہیں اور اس جہان کی ہر شئی اس کے دائمی فیض اور مسلسل نظر کرم کے صدقے قائم اور زندہ ہے۔

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۰۸

دعااور مردان خدا

اگرچہ اللہ تعالیٰ پر یقین رکھنے والے مردان خدا ہر مقام پر اس کی طرف متوجہ رہتے اور اس کی قدرت لایزال سے استعانت کرتے رہتے ہیں۔لیکن ہر ایسے وقت میں جب وہ سنگین حالات سے دوچار ہوں تو وہ اللہ تعالیٰ سے اس کی مقدس نام ''حی قیوم'' کے ذریعہ مدد طلب کرتے ہیں۔ یوں وہ اس کے نام کے وسیلے سے اس کی مخصوص عنایات کو اپنی طرف منعطف کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں اور باری تعالیٰ کے فیض سے اپنی ان سخت ترین مشکلات کو دور کرلیتے ہیں۔

قال علی علیه السلام: لما کان یوم بدر جئت انظر ما یصنع النبی (ص) فاذا هوا ساجد یقول (یاحی یا قیوم) فترددت مرات وهوا علی حاله لا یزید علی ذالك الی ان فتح الله له [۱]

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:۔ جنگ بدر کے روز میں یہ دیکھنے آیا۔کہ حضرت رسول اکرمؐ اس وحشت انگیز کیفیت اوران طاقتور دشمنوں کے مقابل کیا تدبیر کررہے ہیں۔تب میں نے دیکھا کہ آپؐ نے سر سجدے میں رکھا ہوا ہے اور مسلسل ''یاحی یا قیوم پکار رہے ہیں'' میں کئی بار گیا اور واپس آیا لیکن آپ نے اسی طرح سر سجدے میں رکھا ہوا تھا اور ''یاحی یا قیوم'' کے علاوہ کچھ نہ کہتے تھے۔ آپ اس ذکر مقدس کو بار بار دہراتے رہے اور بالآخر خداوند تعالیٰ نے آپ کو اس جنگ میں فتح و کامیابی عطا فرمادی۔

جبر وتفویض کے بین بین

''قیوم'' کی صفت جس معنی کے لحاظ سے اب زیر بحث ہے اس سے مسئلہ جبر و اختیار میں ''امر بین امرین'' کی حقیقت بھی روشن ہوجاتی ہے۔ چنانچہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے مروی احادیث کی اساس پر ''قیوم'' سے جو معنی مستفاد ہوتا ہے، اس سے یہ اہم ترین مسئلہ بھی واضح ہوجاتا ہے۔

عن ابی عبدالله علیه السلام قال: لا جبرو لا تفویض ولکن أمر بین أمر بین [۲]

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:۔لوگ نہ تو اپنے افعال میں مجبور و بے اختیار ہیں اور نہ ہی مکمل طور پر مختار ہیں کہ سب کچھ ان کے سپرد کردیا گیا ہو، اپنے اپنے تمام امور میں وہ جبر و اختیار کے بین بین ایک حد وسط پر ہیں۔

عن بعض أصحابه عن أبي عبدالله علیه السلام قال: سئل عن الجبرو القدر فقال: لا جبر ولا قدر ولکن منزلة بینهما فیها الحق التی بینهما لا یعلمها الا

---

[۱] تفسیر روح البیان ج۱ ص ۲۷۱

[۲] الکافی ج۱ ص ۱۶۰۔۱۵۹

العالم أو من علمها اياه العالم [1]

امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال ہوا:۔لوگ اپنے افعال و اعمال میں مجبور ہیں یا مختار ہیں؟ آپ نے فرمایا:۔ نہ جبر ہے اور نہ ہی مکمل اختیار بلکہ ان دونوں کے بین بین ایک منزل ہے کہ حق اسی منزل میں ہے اور اس درمیانی مرحلے کا ادراک کرنا ایک عالم کا کام ہے یا ایسے شخص کا جسے کسی عالم نے تعلیم دی ہو۔

آزادی عمل اور مطلق اختیار اپنے واقعی اور حقیقی معنی میں فقط اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس سے مخصوص ہے۔ خداوند تعالیٰ ہی وہ ذات مقدس ہے کہ اس کا ارادہ و اختیار اس کی ذات سے قائم ہے اور وہ کسی شئی یا کسی شخص کا محتاج نہیں ہے۔ وہی ایسی ہستی ہے کہ جو کچھ چاہے اسے پوری آزادی اور اختیار کے ساتھ عمل میں لاسکتا ہے اور جس چیز کے بارے میں جو ارادہ کرے اسے عملی جامہ پہنا سکتا ہے، کیونکہ وہ بلا قید و شرط اور مرید ہے۔ اس پورے عالم ہستی میں کوئی بھی اس طرح کی آزادی اور اختیار کا مالک نہیں ہے اور ''قیوم'' کے معنی کا پہلا حصہ یہی ہے۔ یعنی ''قیوم'' وہ خدائے تعالیٰ ہے جو اپنے تمام صفات کمال میں بذات خود قائم ہے اور کسی غیر کی طرف معمولی سی احتیاج بھی نہیں رکھتا۔

اس مرید و مختار پروردگار نے اپنی حکیمانہ مشیت اور عالمانہ قضاء کے ساتھ ارادہ فرمایا تو اس جہان ہستی کو خلق فرمادیا۔ یوں اس کے اندر مختلف موجودات کو وجود بخش دیا اور گوناگوں ذمہ داریاں ان کے سپرد کردیں۔ ہماری یہ زمین اس خداوند قدوس کے پیدا کئے ہوئے اس جہان مخلوقات میں سے ایک چھوٹی سی شئی ہے اور اس کے وہ موجودات بھی جو اس خالق نے اس میں خلق فرمادئے ہیں۔

تکوینی جبر

یہ کرۂ ارض اور اس کے احاطے میں بیشتر موجودات ایسے ہیں جو اپنے سپرد کئے گئے کاموں میں مجبور ہیں اور از خود معمولی سا ارادہ و اختیار بھی نہیں رکھتے۔ اللہ تعالیٰ کے قطعی ارادے اور آفرنیش میں اس کے جبر تکوینی نے ان کے کام معین فرمادئے۔ اور ہر کرۂ زمین بالجبر چکر لگا رہا ہے، زمین کی کشش جاذبہ پتھر یا لکڑی وغیرہ کو بالجبر اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور پتھر لکڑی بالجبر زمین کی کشش میں آکر نیچے گرتے ہیں۔ سمندروں اور دریاؤں کا پانی بالجبر آفتاب کی شعاعوں سے بخارات میں بدل جاتا ہے اسی طرح درخت بالجبر نشوونما پا رہے ہیں، پھول پھل دے رہے ہیں اور بالجبر کمزور ہوتے اور مرجاتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ تمام تکوینی قوانین وضوابط بالجبر جاری ہو رہے ہیں اور کوئی موجود ان تکوینی فرائض کی انجام دہی سے انحراف اور سرکشی کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ انسانی بدن بھی اپنے طبیعی افعال تکوینی دستور و قواعد کے مطابق بالجبر انجام دیتا ہے معدہ بالجبر ہضم کرتا ہے اور جگر بالجبر جذب کرتا ہے۔ گردہ بالجبر بدن سے زہریلا مواد خارج کرتا ہے، دل بالجبر دھڑکتا ہے اور خون بالجبر رگوں میں دوڑتا ہے۔ رحم مادر بالجبر بچہ بناتا ہے، جنین بالجبر مقررہ وقت پر متولد

[1] الکافی ج ۱ ص ۱۶۰ ۔ ۱۵۹

ہوتا ہے اور نومولود بالجبر بڑا ہوتا ہے۔ جوان بالجبر ادھیڑ عمر بنتا ہے پھر بوڑھا ہو جاتا ہے اور بالآخر بالجبر مر جاتا ہے۔ ان اعضاء میں سے کوئی ایک بھی اپنے تکوینی فرائض کی انجام دہی سے انکار نہیں کر سکتا۔

یہ تمام موجودات اور ان کے تمام اعمال جو یہ بالجبر انجام دیتے ہیں، یہ سب خداوند تعالیٰ کی عنایات کا پرتو ہیں ہاں لطف خدا سے ان کا وجود باقی ہے اور اسی کے کرم کے صدقے یہ اپنے جبری اعمال کو انجام دے رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ یہ سب موجودات اور ان کے سارے افعال اس ذات لایزال الٰہی کے ساتھ قائم اور وابستہ ہیں اور یہی ''قیوم'' کا معنی ہے کہ تمام موجودات عالم اور پورا جہان ہستی اس ذات مقدس کے ساتھ قائم اور برپا ہے۔

بشر کے اختیاری اعمال

ہاں: آدمی اپنے بدن کے طبیعی اور جبری افعال کے ساتھ ساتھ کچھ دیگر اعمال کا بھی مالک ہے کہ جن کی انجام دہی میں وہ مجبور نہیں ہے بلکہ وہ ان کو اپنے ارادہ واختیار کے ساتھ کر بھی سکتا ہے اور اپنے ارادہ واختیار کے ساتھ ہی چھوڑ بھی سکتا ہے۔

مثلاً ہاتھ کا طبیعی اور جبری عمل یہ ہے کہ خون اس کی رگوں میں خود بخود دوڑتا ہے اور اسی کے ذریعے ہاتھ کی زندگی محفوظ ہے۔ لیکن اس کا اختیاری عمل یہ ہے کہ کسی گری ہوئی چیز کو اٹھا کر جیب میں ڈال لے یا کسی دوسرے انسان کی کمک کرے اور اس کو موت سے بچا لے۔ نیز ہاتھ اس پر قادر ہے کہ اپنی انگلیوں کو بند کرے، ان سے ایک مکا بنائے پھر کسی کمزور کے کے سر پر مارے اور اس کی زندگی کا خاتمہ کر دے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ پہلے کام یعنی دوران خون میں ہمارے ارادے واختیار کا معمولی سا دخل بھی نہیں اور یہ طبیعی عمل قضاء الٰہی کی بنیاد پر بالجبر انجام پاتا ہے، لیکن دوسرے کام میں ہمارے عزم وارادہ کا دخل ہے۔ یہ ہم ہیں جو اپنے ارادہ واختیار سے گرے ہوئے کو پناہ میں لیتے اور اس کو مرنے سے بچا لیتے ہیں۔ یہ ہم ہی ہیں کہ اپنے ارادہ واختیار کے ساتھ کسی بچے کے سر پر گھونسہ دے مارتے اور اس کو قتل کر دیتے ہیں۔

ہمارے یہ دوسرے قسم کے اعمال ہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے قوانین شریعت میں ہماری شرعی تکلیف کا مورد قرار پاتے اور ثواب وعقاب کا باعث بنتے ہیں، اسی طرح بشری قوانین اور عقلائی موازین میں ان پر روا و ناروا کا عنوان آتا ہے اور ان کے فاعلین جزا وسزا کے مستحق قرار پاتے ہیں۔

پس انسان کے طبیعی اعمال کا ارادی واختیاری اعمال سے فرق واضح ہو گیا، یعنی طبیعی اعمال مثلاً جسموں میں خون کا دوران یہ سب قوانین خلقت کی بنیاد پر بالجبر متحقق ہوتے ہیں۔ لیکن ارادی واختیاری اعمال مثلاً بے گناہ کے منہ پر تھپڑ مارنا یہ جبری نہیں، بلکہ افعال آدمی کے اپنے ارادہ واختیار کے ساتھ انجام پاتے ہیں۔

یہ فرق واضح ہونے کے بعد اب امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمان برحق ثابت ہوتا ہے کہ انسان کے تمام اعمال جبری نہیں

بلکہ ان میں اپنے ارادہ واختیار کے تحت بھی ہیں ہاں تو آپ نے کیوں فرمایا کہ نہ جبر ہے نہ اختیار بلکہ ان دونوں کے بین بین حد وسط ہے اوراس کی وجہ واضح ہے:

خدااور بشر کے اختیار کا فرق

اس تشریح کے ساتھ ثابت ہوا کہ اختیار اپنے واقعی اور حقیقی معنی میں ذات اقدس الٰہی کے ساتھ مخصوص ہے اور یہ خداوند قدیر ہے جو بذات خود قائم ہے اوراس کا اختیار بھی خوداس کی ذات سے قائم ہے۔ وہ کسی بھی شئی یا کسی بھی شخص کے ساتھ وابستہ اور اس کا محتاج نہیں ہے۔لیکن انسان بذات خود قائم ہے اوراس کا اختیار بھی خوداس کی ذات سے قائم ہے۔ وہ کسی بھی شئی یا کسی بھی شخص کے ساتھ وابستہ اوراس کا محتاج نہیں ہے۔لیکن انسان بذات خود قائم نہیں بلکہ اس کا وجوداوراس کا اختیار وارادہ ہر دو ذات حق تعالیٰ کے ذریعے قائم ہیں اور یہ ہرگز مختار مطلق نہیں ہوسکتا۔

انسان بھی کرۂ زمین کے دیگر موجودات کی مانند مشیت الٰہی کے ساتھ پیدا ہوا ہے، البتہ اس فرق کے ساتھ کہ دیگر تمام طبیعی موجودات کے بارے میں پہلے خداوندتعالیٰ نے یہ چاہا کہ وہ وجود میں آئیں اوردوسرے مرحلے میں یہ چاہا کہ ان کے اعمال بالجبر بلا اختیار ان سے انجام پذیر ہوں۔لیکن انسان اس طرح نہیں ہے اوراس کے بارے میں اولاً یہ چاہا کہ وہ وجود میں آئے اور ثانیاً یہ چاہا کہ اس کے تمام ارادی اعمال خوداس کے اپنے ارادہ واختیار سے صادر ہوں۔

اسی لئے حدیث کے پہلے حصے میں امام علیہ السلام نے فرمایا:''لا جبر'' یني بشر اپنے اعمال میں دیگر طبیعی موجودات کی طرح مجبور نہیں ہے انسان کے ارادی کام اس کے طبیعی اعمال کی مثل تکوین کے جبر کے نتیجے میں واقع نہیں ہوتے۔ بلکہ اس کے تمام اختیاری افعال خوداس کے اپنے ارادہ واختیار اوراس کی اپنی خواہش ومرضی کے مطابق صادر ہوتے ہیں۔

حدیث کے دوسرے حصے میں فرمایا:''ولا تفویض''یعنی بشر اپنے ارادی کاموں میں بھی علی الاطلاق ہر طرح کی آزادی و اختیار کا مالک نہیں، کیونکہ انسان سرتاپا محتاج اور ذات خدا سے وابستہ ہے۔ وہ خوداس کی عقل وارادہ، اس کا عزم وتصمیم اوراس کے قوائے ظاہریہ باطنیہ مختصر یہ کہ وہ اپنے پورے مادی ومعنوی سرمائے میں خداوندتعالیٰ کا مملوک اوراس کی ذات لایزال کے ساتھ قائم ہے، پس جواس طرح کا موجود ہو وہ آزادی مطلق کا مالک کیسے کہلاتا ہے؟۔

امام علیہ السلام نے اس حدیث کے تیسرے حصے میں فرمایا: والکن أمر بین أمرین یعنی بشر نہ مجبور مطلق ہے اور نہ مختار مطلق، بلکہ وہ نسبتی آزادی واختیار کا مالک ہے کہ جو جبر واختیار کے درمیان ایک حد وسط ہے۔تمام اچھے یا برے کام جو وہ خود انجام دیتا ہے۔اپنے ارادہ اختیار سے انجام دیتا ہے۔لیکن وہ قدرت وتوانائی جوان اعمال کے تحقق پذیر ہونے کی بنیاداوراصلی موجب بنتی ہے وہ اس خالق حقیقی کی طرف سے ہے۔

عن احمد بن محمد بن ابی نصر قال قلت لأبی الحسن الرضا علیه السلام ان بعض

اصحابنا يقول بالجبر و بعضهم يقول بالا ستطاعة قال فقال لی اکتب بسم الله الرحمن الرحيم قال علی بن الحسين عليه السلام قال الله عزوجل يا بن آدم بمشيی کنت انت الذی تشاء و بقوتی اديت الی فرائضی و بنعمت قويت علی معصيتی [1]

ابن ابی نصر کہتا ہے:۔ میں نے حضرت امام رضا علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ ہمارے بعض دوست جبر کے اور بعض اختیار کے قائل ہیں۔ پھر ان سے درخواست کی کہ آپ اس بارے میں حق مطلب کو بیان فرمائیں۔ تب حضرت نے حکم دیا کہ لکھو: بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ حضرت امام سجاد علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔ تو میری مشیت کے ساتھ ارادہ و خواہش کا مالک ہوا ہے۔ تو میری عطا کردہ قوت کے ساتھ میرے واجبات کو ادا کرتا ہے اور میری ہی دی ہوئی نعمت کے صدقے میری نافرمانی پر قادر ہوا ہے۔

دو بنیادی مطالب

اس حدیث میں جبر و اختیار کی بحث کے متعلق دو بنیادی مطالب کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

اول: بشر کے آزاد بدن کے متعلق اشارہ ہے۔

دوم: اس طاقت کے متعلق جسے انسان اپنی آزادی کو استعمال کرنے کے لئے کام لاتا ہے۔

پہلے حصے میں خداوند تعالیٰ نے بشر کی مشیت و آزادی کو اپنی مشیت سے وابستہ کیا ہے۔ وہ درحقیقت یہ فرمار ہا کہ اے فرزند آدم! میں نے ارادہ کیا کہ ایک ارادہ اختیار رکھنے والے موجود کو خلق کروں اور تجھے پیدا کیا۔ پس تیرا ارادہ و مشیت پر قدرت رکھنا میری اس مشیت کی وجہ سے ہے جو میں نے تیری خلقت کے بارے میں کی ہے۔ دوسرے حصے میں فرمایا کہ اے فرزند آدم! تو جو اپنے اختیار اور آزادی کے ساتھ کام لیتا ہے اور اپنے ارادے کے ساتھ نیکی و بدی کو انجام دیتا ہے۔ توجہ رکھ کہ تیری کام کرنے کی یہ قدرت میری طرف سے ہے، تو میری دی ہوئی قدرت کو اپنے ارادہ و مشیت کے ساتھ میری اطاعت میں استعمال کرتا ہے یا میری مخالفت میں صرف کرتا ہے۔

اس وضاحت کے ساتھ ''امر بین امرین'' کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ایک طرف سے اللہ تعالیٰ نے بشر کو آزاد و مختار خلق فرمایا ہے۔ لہٰذا آدمی آفرینش کی بنیادی نگاہ کے لحاظ سے مجبور موجودات کی فہرست میں شامل نہیں ہے۔ دوسری طرف سے بشر کی آزادی و مشیت خداوند تعالیٰ کی معیشت سے وابستہ ہے اور وہ اپنی آزادی کو استعمال میں لانے کے لئے جو طاقت صرف کرتا ہے وہ بھی خداوند تعالیٰ کی طرف سے ہے اور یہ از خود مستقل طور پر کچھ بھی نہیں رکھتا۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بشر اپنی خلقت کی بنیاد میں مجبور موجودات

[1] الکافی ج ۱ ص ۱۵۹

سے جدا ہے، کیونکہ یہ جبر مطلق کی منزل سے پار ہو چکا ہے۔ لیکن یہ مستقل آزادی اور اختیار مطلق تک بھی نہیں پہنچا اور نہ ہی پہنچ سکے گا۔ بشر مسلسل ایسی منزل میں ہے اور رہے گا جو جبر و اختیار کے درمیان میں ہے۔ ''**بحول اللہ و قوۃ اقوم و اقعد**'' اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قدرت و طاقت کے ساتھ کھڑا ہوتا ہوں اور بیٹھتا ہوں۔

نہ مجبور نہ مختار

یہ ہے ''امر بین امرین'' کی مکمل تصویر۔ کہ اٹھنا اور بیٹھنا دو ایسے کام ہیں جنہیں انسان اپنے ارادے و اختیار سے بجالاتا ہے اور وہ ان میں مجبور نہیں ہے۔ لیکن یہی اختیاری عمل وہ ایک ایسی طاقت کے ذریعے انجام دیتا ہے جو خداوند تعالیٰ سے مربوط اور اس کی عطا کردہ ہے۔ پس انسان اپنے اٹھنے بیٹھنے میں بھی نہ مجبور مطلق ہے اور نہ ہی مختار مطلق بلکہ حد وسط میں ہے کہ عمل انسان کا اور طاقت خدا کی عطا کردہ ہے۔

خلاصہ یہ کہ ''قیوم'' کے اس تیرے معنی کے پیش نظر کہ یہ سارا جہان ہستی اور اس کے موجودات اللہ تعالیٰ کی ذات مقدس سے موجود اور قائم ہیں۔ اس مسئلہ جبر و اختیار کی بحث میں ''امر بین امرین'' کے مفہوم کی تفسر و توضیح ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس تشریح کے مطابق اللہ تعالیٰ نے بشر کو آزاد پیدا فرمایا اور وہ اپنے اچھے یا برے کاموں میں مجبور نہیں ہے، بلکہ انہیں اپنے ارادہ و اختیار کے ساتھ انجام دیتا ہے۔ لیکن انسان کا اصل وجود اور اس کی ساری طاقتیں اس ذات قیوم کے ساتھ قائم ہیں اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بشر اپنے عمل میں آزادئ مطلق کا مالک نہیں، بلکہ نسبتی آزادی رکھتا ہے اور ایک ایسی منزل میں ہے کہ جو جبر مطلق اور اختیار مطلق کے بین بین ہے۔

یہاں قیوم کے معانی سے تین معانی بحث و گفتگو کا مورد قرار پا چکے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے متعلق توضیح بھی کی گئی ہے۔ لیکن لغت اور تفاسیر کی کتب میں اس لفظ کے کئی اور معانی بھی آئے ہیں۔ چونکہ ہم ان کا ذکر اور ان کی تشریح کرنا ضروری نہیں سمجھتے، اس لئے انہیں چھوڑ رہے ہیں۔ اب ہم اس نتیجے کو بیان کرتے ہیں جو توحید عبادتی پر مرتب ہوتا ہے۔

شرک سے رہائی

سابقہ مباحث سے واضح ہو گیا ہے کہ آیت الکرسی کا اصلی مقصد لوگوں کو حقیقی معبود کی عبادت کی طرف ہدایت کرنا اور شرک یعنی ناجائز بندگیوں سے نجات دلانا ہے۔ یہ مقدس مقصد تبھی حاصل ہوسکتا ہے کہ لوگوں کی سوئی ہوئی عقلیں بیدار ہو جائیں اور وہ جعلی اور خود ساختہ معبودوں کے بارے میں فکر کریں۔ تاکہ وہ اپنی گردنوں میں ہاتھوں ڈالے ہوئے عبودیت کے طوقوں کو دور کر دیں اور اس ذلت و رسوائی سے رہائی پالیں۔

آیت الکرسی میں حقیقی معبود کے لئے جو صفات بیان کی گئی ہیں، ان میں سب سے پہلی صفت حیات ہے کلمہ ''الحی''، عقول کو

متوجہ کرتا اور لوگوں کو بتاتا ہے کہ بشر کا معبود زندہ اور حی ہونا چاہئے۔ اب بت پرستو! جب تم خود اس خاکی کرے کی زندہ اور کمال یافتہ مخلوق ہو تو کچھ سوچو تو سہی کہ کیا یہ عقلی بات ہے کہ ایک زندہ انسان ایک بے جان شئی کی پرستش کرنے لگے اور اس کا بندہ بن بیٹھے؟ کیا عقل و خرد تمہیں اجازت دیتی ہے کہ ایک بے شعور۔ نابینا۔ نادان۔ بہرے اور جامد جسم کے سامنے اپنا سر بندگی اور عبودیت کے لئے جھکا دو اور اس کی پرستش کرنے لگو۔؟

آیت الکرسی ''الحی'' کے ذریعے انسان کو درس دے رہی ہے کہ بت۔ سورج۔ چاند اور ان کی مانند دیگر تمام بے جان معبودوں کو خدائی کی کرسی سے نیچے کھینچ لو۔ انہیں عبادت و بندگی کے کے دائرے سے باہر پھینک دو اور بشریت کو ان بے جان خداؤں اور خود ساختہ معبودوں کی قید عبودیت سے آزاد کردو۔

آیت الکرسی میں معبود حقیقی کو دوسری صفت ''قیوم'' بیان کی گئی ہے، گویا توحید عبادت کے مقام پر آیت الکرسی کا درس یہ ہے کہ اسلام کا مقدس آئین کے انسانوں کو ایک ایسے معبود کی پرستش کی دعوت دیتا ہے جو فقط صفت حیات کا مالک نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ قیوم بھی ہے۔

لائق عبادت معبود

اس صفت میں غور وفکر کرنے سے خفتہ عقول بیدار ہوتے ہیں اور لوگوں کے افکار حقیقی اور واقعی معبود کی شناخت کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ افراد جو درخت، گائے، سانپ یا کسی انسان کی پرستش میں لگے ہوئے ہیں یا کسی بھی شئی کی پوجا کرتے ہیں۔ یہ صفت قیوم ان سب کو متوجہ کرتی ہے کہ عبودیت کے لائق فقط وہی ہستی ہوسکتی ہے جو زندہ اور قیوم ہے اور وہ فقط اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس ہے۔

آیت الکرسی انسانوں کو سمجھاتی ہے کہ وہی خدا بندگی اور پرستش کے لائق ہے جو ''قیوم'' ہے کہ جس کی حیات اس کی عین ذات اور اس کی ذات سے قائم ہے۔ لہٰذا ایسے زندہ موجودات بھی معبود نہیں بن سکتے کہ جن کی اپنی زندگی و حیات ایک اور خلق کرنے والے پروردگار کے ساتھ قائم ہو۔

آیت الکرسی لوگوں کو آگاہ کرتی ہے کہ عبادت و پرستش کا قابل وہی خداوند تعالیٰ ہے جس نے سارے جہان کو پیدا کیا اور تمام زندہ اشیاء کو خلق کیا ہے۔ ان کو زندگی کے تمام وسائل کے ساتھ آراستہ فرمایا اور ہر ایک کو ایسے اعضاء و جوارح اور دیگر سرمائے سے مزین کیا ہے کہ وہ اپنی زندگانی کو اپنے ماحول کے ساتھ بآسانی منطبق کر لیتے ہیں اور اپنی طبیعی زندگی گزارنے اور زندہ رہنے پر قادر ہوتے ہیں۔

آیت الکرسی انسانوں کو یہ تعلیم بھی دیتی ہے کہ لائق عبادت و عبودیت وہ خداوند عظیم ہے جو ''قیوم'' اور ازلی ہے کہ جس کا اپنا وجود اور جس کی اپنی حیات کسی نقطہ آغاز سے شروع نہیں ہوئی۔ ایسے موجودات کہ جن کی طبیعی زندگی اور جن کا وجود اپنا نقطہ آغاز رکھتا ہے

اور پھر ایک نقطے پر جا کر اختتام ہو جائے گا، وہ ہرگز معبودیت کے لائق نہیں ہیں۔

آیت الکرسی انسانوں کو متوجہ کرتی ہے کہ وہی خداوند پرستش کے لئے موزوں ہے جو ''قیوم'' ہے۔ یہ جہان ہستی اس کے متواتر اور دائمی فیض کے ذریعہ قائم ہے۔ ایسے موجودات جو خود فقیر اور اس خدا کی عنایت و کرم کے محتاج اور نیاز مند ہیں، وہ ہرگز معبود نہیں ہو سکتے۔ مختصر یہ کہ آیت الکرسی نے ''الحی القیوم'' کی دو صفات کے تذکرے کے ساتھ لائق عبادت معبود برحق کا تعارف کروایا ہے۔ انسان کو خدائے یکتا و یگانہ کی طرف متوجہ کر دیا اور تمام بے جان یا زندہ خداؤں کو مقام الوہیت سے دور ہٹا کر انہیں پرست کے دائرے سے نکال باہر کیا ہے۔ تا کہ تمام انسان جعلی اور خود ساختہ معبودوں کی بندگی کی ذلت سے آزاد ہو جائیں اور غیر خدا کی غلامی اور عبودیت کی قید سے نجات پالیں۔

چوتھی تقریر

نیند کے اسباب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ تعالیٰ کا اپنی کتاب پاک میں ارشاد ہے:۔

لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۭ [۱]

خداوند عالم یعنی حقیقی معبود وہ ہستی ہے کہ تھکن اونگھ اور گہری نیند کا اس پر غلبہ نہیں ہوسکتا، یہ دونوں حالتیں (اونگھ اور نیند) اس کی مقدس ذات پر غالب نہیں آتیں۔

اگر کوئی پوچھے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ پروردگار عالم کے تو بہت سارے صفات سلبیہ ہیں اور یہاں آیت الکرسی میں ان میں سے فقط ان دو صفات کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ اس کو اونگھ اور نیند نہیں آتی، صرف ان دو کے تذکرے کی وجہ کیا ہے؟ اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جن لوگوں کے سامنے آیت الکرسی کی تلاوت کی جاتی ہے وہ زندہ اور زندگی کا مفہوم اس کائنات کی زندہ اشیاء کے مشاہدے سے حاصل کرتے ہیں اور زندگی کے قوانین کا اندازہ اسی کرۂ زمین کی زندہ چیزوں کے پیمانے سے کرتے ہیں۔ وہ یہی دیکھتے ہیں کہ تمام زندہ موجودات نباتات ہوں یا حیوانات وانسان اپنی زندگی اور افعال زندگانی کے تحفظ کے ئے نیند اور استراحت کرنے کے محتاج ہوتے ہیں۔ اگر انہیں نیند نہ آئے تو اس زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔

نیند کی ضرورت

اس کرۂ ارض کے زندہ موجودات نباتات یا حیوانات یا انسان ان سب کے لئے نیند ایک لازمی ضرورت ہے۔ آج کی ترقی یافتہ دنیا دقیق تحقیقات کے بعد اسی نتیجے پر پہنچی اور اس پر کتابیں بھی لکھی جا چکی ہیں جب کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام آج سے چودہ صدیاں قبل ہی یہ بات اپنے پیروکاروں کو بتلا چکے ہیں اور بڑی صراحت سے فرمایا۔

ما من حی الا وھو ینام خلا اللہ وحدہ عزوجل [۲]

اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس کے علاوہ کوئی زندہ شئی ایسی نہیں جسے نیند کی ضرورت نہ ہو۔

---

[۱] سورۂ بقرہ آیت ۲۵۵

[۲] سفینۃ البحار ج ۲ ''ملک'' ص ۵۴۷

زندگی کی نیند سے وابستگی

ممکن ہے لوگ اپنے اس ذہنی تعلق کی وجہ سے جو انہیں نیند کی ضرورت کے بارے میں ہے، یوں کہیں کہ ایک زندہ خدا دائمی طور پر قیوم نہیں ہو سکتا۔ قیوم تو وہ ہوتا ہے کو جس کی ذات اور اس کے تمام کمالات ہمیشہ اور ہر مقام میں اس ذات سے قائم اور بر پا ہوں۔ پھر ایک ایسا زندہ کہ جس کی زندگی نیند سے مربوط ہے وہ تو نیند کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ جونہی اسے نیند آتی ہے وہ اپنے آپ سے منقطع اور بے خبر ہو جاتا ہے، اپنے فائدے اور نقصان کی تشخیص نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس وقت تو وہ خود کو بھی نہیں پہچانتا اور اپنے آپ کی آگاہی سے بھی محروم ہوتا ہے۔ پس یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ زندہ جو سو چکا ہے اور خود سے بھی غافل ہو چکا ہے، اس کے باوجود اس کے تمام صفات کمال اور اس کا ارادہ خود اس کی ذات سے قائم ہے۔؟

نیز یہ کے قیوم کا معنی ہے دوسروں کی حفاظت کرنا یعنی قیوم وہ ہوتا ہے جو ایک طرف سے خود بھی بذات خود قائم ہوتا ہے اور دوسری طرف سے تمام موجودات جہان اس کی ذات سے قائم ہوتے ہیں۔ اب جبکہ ایک زندہ نیند میں چلا جاتا ہے اور وہ اپنی ذات سے بھی غافل اور ناآگاہ ہو جاتا ہے تو کیسے ممکن ہے کہ اس حال میں دیگر سارے موجودات جہان اس کے ارادے کے ساتھ قائم اور بر پا ہیں؟۔

اب سوال یہ ہے کہ آیت الکرسی میں اس معبود حقیقی کی یہ دونوں صفتیں ''حی اور قیوم'' یکجا کیسے آ گئی ہیں اور ان میں یہ ہم آہنگی کیسے مانی جا سکتی ہے؟ (اس لئے کہ کوئی زندہ نہیں ہو سکتا کیونکہ ہر زندہ کو تو نیند غافل کر دیتی ہے) لیکن عوام الناس کی طرف سے اس سوال کے پیش کئے جانے سے قبل ہی خداوند تعالیٰ نے اس کا جواب دے دیا اور ''حی قیوم'' کی صفات کا ذکر کرنے کے فوراً بعد یہ کہہ دیا ''لا تاخذہ سنۃ ولا نوم'' یعنی اونگھنا یا سونا یہ سب کچھ اس عالم طبیعت کے زندہ موجودات کے لئے لازمی ہے اور خداوند عالم کے لئے نہیں ہے۔ پس وہ اپنی ذات سے اونگھ اور نیند کی ضرورت کو سلب کرنے کے ذریعے یہ بات سمجھانا چاہتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کی زندگی اس کرۂ ارض میں بسنے والے زندہ موجودات کی طرح نہیں ہے۔ اسی لئے تو اس کی ذات مقدس انگھ۔ نیند۔ اور دیگر تمام ایسے عوارض سے منزہ اور مبراء ہے جو ایک ممکن الوجود کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔

نینداور تجدید قوی

اس عالم طبیعت سے نباتات حیوانات اور انسانوں کی زندگی مادے ار زندگی کے مالیکیول کے ساتھ قائم ہے۔ اسے کچھ وقت تک محنت اور فعالیت کے بعد نیند کی ضرورت اور اپنی قوتوں کی تجدید کرنے کی احتیاج لاحق ہوتی ہے۔ چونکہ پروردگار عالم تمام مادی نقائص سے منزہ و مبریٰ ہے، اس لئے وہ نہ تو تھکتا اور کمزور ہوتا ہے اور نہ ہی اسے تجدید قویٰ کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ ایسا حی و قیوم ہے کہ اونگھ اور نیند کے غلبے میں نہیں آتا، اس کی ذات کے حریم مقدس میں سستی کا دخل ہو سکتا ہے۔ البتہ بڑے بڑے علماء کی عقل اور

بزرگ ترین دانش وروں کا علم وفکر اس عظیم ذات کی زندگی کو سمجھنے اور اس کی عظمت کا اندازہ لگانے سے عاجز اور ناتواں ہے۔

فلسنا نعلم عظمتك الا انا نعلم انك حى قيوم لا تأخذك سنة ولا نوم [۱]

امام علی علیہ السلام اپنے ایک خطبہ میں ذات حق تعالیٰ کی خدمت میں عرض پرواز ہیں:

خدایا! ہم تیری عظمت و بزرگی کی حقیقت وکنہ پر آگاہ نہیں ہیں۔ ہم تو فقط یہی جانتے ہیں کہ تو زندہ ہے، خود بخود قائم ہے اور سارا جہان تیری ذات کے ساتھ قائم ہے، نہ تو تجھے اونگھ آتی ہے اور نہ ہی تجھ پر نیند غالب آتی ہے۔

نیند اور اس کے اسباب کی معرفت ماضی وحال ہر دور میں ماہرین کی تحقیق کا موضوع رہی ہے اور اس بارے میں ان کے نظریات میں اختلاف بھی سامنے آتا رہا ہے، نیند کی حقیقت کو روشن کرنے۔ خداوند کے نیند سے بے نیاز ہونے والے عالم طبیعت کے ہر زندہ موجود کے نیند کا محتاج ہونے کو اچھی طرح واضح کرنے کے لئے ہم اس موضوع پر مختصر گفتگو پیش کرتے ہیں، امید ہے کے یہ مفید اور سودمند رہے گی۔

ہر زندہ میں نیند اور بیداری

تمام زندہ موجودات حیوان ہوں یا نباتات، ان کی زندگی کے معمولات میں مختلف مراحل دیکھنے میں آتے ہیں۔ بعض اعلیٰ قسم کے حیوانات کے جن کا سلسلہ اعصاب تکامل یافتہ ہوتا ہے، ان میں اختلاف نینداور بیداری کے مرحلے کی مانند خصوصیات رکھتا ہے۔

بعض پودوں میں یہ اختلاف تنفس کے عمل کی شکل میں تبدیلی آنے اور غذائی شیرے کے اوپر کو چڑھنے کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً تمام پودے دن کو ہوا سے کاربن گیس لیتے ہیں اور آکسیجن خارج کرتے ہیں، اس کے برعکس شب کو آکسیجن لیتے اور کاربن گیس خارج کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے غذائی شیرہ رات کو زیادہ مقدار میں اوپر کو چڑھتا اور بلندی کی طرف جاتا ہے۔ یہ عجیب نکتہ ہے کہ بعض پودوں مثلاً گل ابریشم اور گل اقاقیا کے پتے رات کو اکٹھے ہو کر نیند کی کیفیت اختیار کر لیتے ہیں۔ [۲]

پودوں کے مشاہدے سے معلوم کیا گیا ہے کہ بعض پودے طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کی اطلاع دیتے ہیں۔ بعض پودے صبح کی سفیدی سے قبل اور کچھ اندھیرا ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے پھولوں کو کھول دیتے ہیں۔

”سویڈن کا ماہر طبیعات (کارل لینہ) اپنی تحقیقات کے دوران متوجہ ہوا کہ پودوں میں پھول نکالنے کا عمل معین مواقع میں انجام پذیر ہوتا ہے۔ یعنی یہ وقت صبح کے چار پانچ بجے کے درمیان شروع ہوتا اور آدھی رات کو ختم ہوتا ہے“

”اس موضوع کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے کہ جب ایک پھول بند ہو جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے داخلی

---

[۱] نہج البلاغہ خطبہ ۱۵۹

[۲] خواب ورؤیا ص ۱۵

اعضاء کو رات کی سردی اور زیادہ رطوبت سے محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ اسی طرح دن کے وقت جب وہ پھول کھل جاتا ہے تو یہ وقت اس کے پیچ کو بکھیرنے کے لئے زیادہ مناسب ہوتا ہے''

پودوں کی نیند

پودوں کے لئے نیند ان کے اعضاء میں ایک تدریجی تبدیلی کا موجب ہوتی ہے۔ پھولوں کی پتیوں کی شب و روز کی حرکات ان کے داخلی اور خارجی شعبوں میں پیش آنے والی نشوونما کی نابرابری کا نتیجہ ہے۔ دن کے وقت اندر کی طرف نشوونما کی رفتار تیز ہوتی ہے تو اس کے نتیجے میں پھول کی پتیاں باہر کی طرف خم ہو جاتی ہیں اور پھول کھل جاتے ہیں۔ جب بیرونی شعبے میں رشد اور نشوونما کے عمل میں تیزی آجاتی ہے تو پھولوں کی پتیاں اندر کو جھک جاتی ہیں او پھول بند ہو جاتے ہیں۔[1]

پودے اور ان کا ماحول

آج کے ماہرین کہتے ہیں: تمام زندہ پودے حتمی طور پر نیند اور استراحت کے محتاج ہیں۔ نباتات کی مختلف اقسام پر جو تحقیقات کی گئی ہے، ان سے یہ نتیجہ سامنے آیا کہ ہر پودے کی نشوونما کے ماحول میں روشنی۔ حرارت اور رطوبت کی تبدیلی ان کی نیند اور استرحت کی مدت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اسی طرح نباتات کی مختلف اقسام کا باہمی طبیعی فرق بھی ان کی نیند اور استراحت کے مواقع اور مدت کی لمبائی میں تبدیلی کا موجب بنتا ہے۔ پودوں کی بہت سی اہم اقسام روزانہ کی نیند کے علاوہ خصوصی موسم کی نیند کی مالک بھی ہیں۔

حیوانات کے برخلاف پودے غیر دائمی نشوونما کرتے ہیں، جبکہ ان کے نمو کے عوامل مناسب اور خصوصی موسموں میں فعال ہو جاتے ہیں۔ جب بیرونی حالات نامناسب ہو جاتے ہیں تو ان کی نشوونما بھی سست بلکہ بسا اوقات صفر کے نزدیک ہو جاتی ہے۔ بنابریں اس دوران میں اس پودے کی نشوونما عدم تسلسل کا شکار ہو جاتی ہے اور اس کی یہ سستی روزانہ ہونے کے ساتھ ساتھ موسمی بھی ہوتی ہے۔

پودے کی روزانہ نیند

کچھ پودے ایسے ہیں کہ صبح کے تڑکے سے طلوع آفتاب کے کچھ بعد تک ان کا نمو بہت زیادہ مقدار میں ہوتا ہے اور قبل از غروب سے غروب کے کچھ دیر بعد تک نمو بہت کم ہو جاتا ہے۔ یہ عمل کہ جس کا تعلق روزانہ کی روشنی کی مدت اور اس کے مقابلے میں اس پودے کی اپنی حساسیت سے اتنا زیادہ ہے کہ اتنا تعلق حرارت اور رطوبت کے درجے سے نہیں ہے۔ روزانہ نیند کا یہ دورہ اس پودے کی زندگی کے لئے معمول کی ایک ضرورت ہوتا ہے اور اس کے بغیر پودے کا کوئی چارہ کار ہی نہیں ہے''

---

[1] ریتم ہائے حیاتی ص ۳۷

نباتات کی کچھ اقسام ایسی ہیں کہ وہ اپنے استراحت کے موسم میں اپنی فعال اور عادی زندگی کا دوبارہ آغاز نہیں کر سکتے، جب کہ ان کی موسم سرما کی استراحت زیادہ طولانی مدت تک انہیں میسر نہ آ چکی ہو۔[۱]

ابتداء میں یوں دکھائی دیتا تھا کہ پودوں کی استراحت موسی اور فضائی حالات کے ساتھ مربوط ہے اور جونہی موسم بہار میں آب وہوا کا ماحول مناسب ہوتا ہے تو پودے اپنی نشوونما کا آغاز کر دیتے ہیں۔لیکن استوائی علاقوں کے مشاہدات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ وہ مقامات جہاں پودوں کا نموتوقف کا شکار نہیں ہوتا، وہاں بھی استراحت کا ایک دورہ موجود ہوتا ہے۔لیکن وہ جگہ کہ جہاں پورا سال آب وہوا کا ماحول یکساں رہتا ہے، وہاں ان کا استراحت کرنا سال کے کسی معین دور کے ساتھ مربوط نہیں ہے۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ مختلف درختوں میں حتیٰ کہ ایک درخت کی مختلف شاخوں میں استراحت کا دورہ مختلف ہو۔بنابریں نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ استراحت اور آرام کی ضرورت خود بناتا کی ضرورت ہے اور تمام پودے پنی نیند کی ضرورت کو بیرونی حالات کے ساتھ منطبق کرتے رہتے ہیں۔[۲]

حیوانات میں نینداور بیداری

تمام عالم حیوانات میں بھی بلا استثناء نینداور بیداری کے دونوں مرحلے مشاہدہ کئے گئے ہیں۔حیوان کا دماغ جس قدر زیادہ کامل ہوتا ہے ان دونوں مرحلوں میں فرق زیادہ ہوتا جاتا ہے۔اوران دونوں کے درمیان ایک خاص رتیب آجاتی ہے۔"

ماہرین مختلف اقسام کے حیوانات پر تجربات کرنے کے بعد اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ ان میں بیشتر کی نینداور بیداری شب وروز کی تبدیلی سے وابستہ ہے۔ پرندے سورج کی سنہری کرنوں کے ظاہر ہوتے ہی روزی کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں اور غروب کے قریب اپنی جائے پناہ پر آپہنچتے اور سونے کے لئے آمادہ ہوجاتے ہیں۔لیکن کئی مرتبہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اگر ان کی آرام گاہوں میں دن کی طرح کی تیز روشنی ڈال دی جائے تو ان کی نیند ختم ہوجاتی ہے۔گھریلو پالتو پرندوں میں یہ تجربہ کیا جاچکا ہے۔"[۳]

بعض حیوانات ایسے بھی ہیں جو تاریکی میں بھی روزی کی تلاش میں نکل جاتے ہیں اوران کی نیند روشنی یا تاریکی سے مربوط نہیں ہے۔کچھ ایسے حیوان بھی ہیں مثلاً چمگاڈر کہ وہ صرف تاریکی میں ہیں دوڑ دھوپ کرتے ہیں اور روشنی میں آرام کرنے لگتے ہیں۔[۴]

قال علی علیہ السلام: فھی مسدلۃ الجفون بالنھار علی احداقھا وجاعلہ اللیل

---

[۱] NOVEAU-LAROUSSE-AGRICOLE.P:54,55

[۲] GRUNDLAGEN-DES-PFLANZENLEDENS,P:285

[۳] خواب ورؤیا ص ۱۵

[۴] خواب ورؤیا ص ۱۵

سراجا تستدل به فی التماس أرزاقنها فسبحان من جعل اللیل لها نهار او معاشا والنهار سکنا وقرارا[1]

امام علی علیہ السلام چمگاڈر کی عجیب وغریب خلقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

یہ چمگاڈر دن کو اپنی پلکیں اپنے پپوٹوں پر ڈالے رکھتی ہے اور آنکھیں بند کرلیتی ہے اور رات کو اپنا چراغ قرار دیتے ہوئے اپنی روزی کی تلاش میں نکل کھڑی ہوتی ہے۔ پاک ہے وہ ذات کہ جس نے رات کو اس کے لئے دن اور روزی کمانے کا وقت بنایا ہے اور دن کو اس کے لئے آرام وسکون کا وقت قرار دیا ہے۔

''حشرات کی دنیا میں بھی مختلف مراحل ملتے ہیں، کچھ ایسے کیڑے ہیں جو ہر وقت تلاش وکوشش میں مگن رہتے ہیں اور دن رات کا کوئی فرق نہیں جانتے۔ چیونٹیوں کی صورت یہ ہے کہ وہ سال کے ایک خاص موسم میں کبھی آرام نہیں کرتیں، لیکن اس کے عوض سال کے بہت سارے حصے میں بڑے آرام سے استراحت کرتی ہیں۔''

چوہوں اوران کی مثل حیوانوں کی نیند

ان حسرات میں سے جو کیڑے پرواز پر مجبور ہوجاتے ہیں، وہ اپنی نیند اور بیداری کے مراحل کو روشنی کے ساتھ مرتب کرتے اور روشنی کو دیکھتے ہی اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ چوہے اوران کی مثل حیوانوں میں نیند کے لئے کوئی باقاعدہ صورت معین نہیں ہے۔ بلکہ اکثر وہ ان کی غذائی کیفیت کے ساتھ مربوط ہے۔ وہ شکار کرلینے اور اپنی غذا حاصل کر لینے کے فوراً بعد اپنے سوراخوں اور بلوں میں گھس جاتے ہیں اور وہاں آرام کی نیند سوتے ہیں۔

پستاندار حیوانوں کی نیند

''پستاندار حیوانات کہ جن کی اکثریت پالتو بن جاتی ہے، ان کی نیند ایک حد تک مرتب ومنظم ہوتی ہے۔ لیکن ان میں سے جو جانور جنگلی ہوتے ہیں اور پہاڑوں کے دامنوں، صحراؤں اور جنگلوں میں زندگی بسر کرتے ہیں، ان کی نیند کا نظام آب وہوا۔ غذا اور موسم کی کیفیت کے ساتھ ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مختلف حیوانات میں ان کی نیند اور بیداری کا نظام ان کی زندگانی کے حالات۔ بودوباش کے مقامات اوران کی اپنی تکاملی کیفیت کے ساتھ مربوط ہوتا ہے۔''[2]

بے خوابی کا عارضہ

نیند کی ضرورت: یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں کہ زندگی کی حفاظت اور اس کی مصروفیات میں نیند ایک ضروری اور ناقابل

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۵۴

[2] خواب ورؤیا ص ۱۶

جتناب حقیقت ہے۔ادھر بے خوابی اپنی مدت کی لمبائی کے فرق کے ساتھ ساتھ بدن پر مختلف اقسام کے عوارض وآ ثار مرتب کرتی ہے۔شروع شروع میں بے خوابی سے قدرت تفکر کمزور ہونے لگتی ہے اور کام کرنے کی طاقت میں کمی آ جاتی ہے۔ پھر اندرونی تازگی اور نشاط کا خاتمہ ہوجا تا ہے ظاہری طراوت ناپید ہوجاتی ہے اور چہرے کی رونق ختم ہوجاتی ہے۔اگر یہی بے خوابی زیادہ لمبی ہوجائے تو انسان کے افکار واعمال میں ظاہر بظاہر خلل واقع ہونے لگتا ہے۔اگر بے خوابی مزید طول کھینچ لے تو رفتہ رفتہ اس فرد کی طاقت کا نظام بگڑنے لگتا ہے اور بالآخر موت تک بھی نوبت پہنچ جاتی ہے۔

نینداوراعصابی نظام کاتوازن

''پروفیسر گائی ٹون کہتا ہے:

علم الابدان کے لحاظ سے جسم پر نیند دوقسم کے اہم اثر ڈالتی ہے۔ایک سلسلہ اعصاب پر اور دوسرا پورے بدن کے نظام پر ہوتا ہے میری نگاہ میں پہلا اثر زیادہ اہمیت رکھتا ہے''

''طویل بے خوابی کی کیفیت کا سبب عموماً دماغی افعال میں اختلال کا آنا اور سلسلہ اعصاب کی کارگزاریوں میں خرابی آنے کا باعث بنتا ہے۔ہم سب جانتے ہیں کہ طولانی بے خوابی کے دوران فکری صلاحیت کمزور پڑ جاتی ہے۔ بلکہ ایک طویل عرصے تک جبری بیداری اور بے خوابی مسلط کرنے کی وجہ سے عین ممکن ہے کہ اس شخص کے جذبات تیز ہوجائیں اور بالآخر وہ نفسیاتی بیماری کا شکار ہوجائے۔اس سے ثابت ہوا کہ اعصابی نظام کے توازن کو بحال کرنے میں نیند بہت زیادہ مفید اثرات مرتب کرتی ہے اور مرکزی سلسلہ اعصاب کے مختلف گوشوں پر نیند کے عمدہ اور خوب اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔''[۱]

''نیند کے بغیر زندگی محال ہے اور جو حیوانات غذا کا نہ ملنا بیس روز برداشت کر سکتے ہیں وہ بے خوابی کو چار یا پانچ روز تک بھی برداشت نہیں کر سکتے اور ہلاک ہوجاتے ہیں۔ممکن ہے کہ انسان چھ ہفتوں تک غذا کے بغیر زندہ رہ سکے۔لیکن اگر مسلسل دس دن رات اسے نیند نہ آئے تو مرجائے گا۔''[۲]

کتوں پر تجربات

''غذا کی محرومیت نیند کی محرومیت سے زیادہ قابل برداشت ہے اور انسان وحیوان دونوں کے لئے بے خوابی بھوک سے زیادہ مہلک ہے۔(م۔مانا سیتا) ایک روسی سائنس دان نے اس بارے میں کچھ وضاحت بخش تجربے انجام دیئے تو معلوم ہوا کہ کتے کے چھوٹے بچے نیند سے محروم رہنے کی صورت میں چار سے یا پانچ روز میں مرجاتے ہیں، البتہ جوان کتے اٹھارہ یا بیس دنوں تک بے

---

[۱] فزیالوجی پزشکی ص ۱۰۵۰

[۲] دانستنی ہای جہان علم ص ۲۵۰

خوابی کا مقابلہ کر لیتے ہیں''

(این۔ فیودوروف) اور (سوکولوسکایا) نے کتوں پر تازہ ترین تحقیقات کے ضمن میں تجربات کئے ہیں۔

چنانچہ انہوں نے مختلف ذرائع کے ساتھ کتوں کو سونے سے ممانعت کی لیکن ان تمام ذرائع کے باوجود آٹھویں روز دو کتے مر گئے اور بقیہ بہر حال سو گئے۔''[1]

نیند سے تھکاوٹ دور ہونا

آئندہ سطور میں ہم اس امر کی وضاحت پیش کریں گے کہ طبیعی نیند کا مطلب دماغ کے سب سے اعلیٰ مراکز اور سلسلہ اعصاب کو اپنے کام سے روک دینا اور باز رکھنا ہے۔ ہر انسان کا دماغ یا فرمان دہی کا مرکز حالت بیداری میں اپنے اعصاب کے جال کے ساتھ مسلسل مصروف رہتا ہے۔ پس وہ اس متواتر اور دائمی محنت کی وجہ سے تھک جاتا ہے اور کام کرنے میں مشکل محسوس کرنے لگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حکیمانہ فیصلے اور مستقل قانون کے مطابق انسان کے لئے دن رات میں چند گھنٹے نیند کرنا قرار دے دیا ہے۔ تا کہ ہضم اور تنفس کے علاوہ اس کے بدن کی مشینری کا ایک بہت بڑا حصہ جو کام میں لگا رہا تھا، وہ بالجبر کام سے رک جائے، اس کی تھکاوٹ دور ہو جائے اور وہ دوبارہ کام کے لئے آمادہ ہو سکے۔

وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ﴿٩﴾[2]

مفردات راغب میں ہے: "سباتا ای قطعا للعمل"

یعنی خالق کائنات نے اپنے قانون کائنات کے ذریعے نیند کو کام کے قطع کرنے اور حالت بیداری کے سارے کاروبار کو تعطیل کرنے کا ذریعہ قرار دیا ہے۔

واضح ہو کہ نیند فقط ارادی و اختیاری کاموں کی تعطیل اور ان اعضاء کے آرام اور کام کرنے والی طاقتوں کی دوبارہ بحالی کا ہی وسلیہ نہیں، بلکہ نیند کے عالم میں ہمارے بدن کے دیگر بہت سے حصص کا عمل بھی کمزور پڑ جاتا ہے، چنانچہ کام کی یہ تخفیف اور بدن کی مسلسل کارگزاری میں یہ کمی ساری قوتوں کی بحالی اور ان کی استراحت کا موجب بنتی ہے۔''

متابولیزم میں کمی

حالت بیداری میں سمپاتک کی فعالیت میں اضافے کی وجہ سے اعضاء بدن تک پہنچنے والی تحریکات میں کثرت ہو جاتی ہے اور وہ بہت بڑھ جاتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس نیند کی حالت میں سمپاتک کی فعالیت میں کمی ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی سمپاتک کی فعالیت

[1] خوابیدن وخواب کردن ص ۱۲

[2] سورۂ نباء آیت ۹

میں اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ ادھر نیند کے وقت رگوں میں خون کا دباؤ کم ہوجاتا ہے، نبض کی رفتار بھی گھٹ جاتی ہے، جلد کی رگیں پھول جاتی ہیں اور کبھی کبھی آنتوں اور معدے کی کارگزاری میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ سارے اعضاء اور پٹھے شل ہوجاتے ہیں، اور کام کرنا چھوڑ کر مکمل آرام کرنے لگتے ہیں اور مٹابولیزم ''دس سے بیس فی صد تک کم ہوجاتا ہے۔''[۱]

تھوڑی مدت کی نیند

مختصر یہ کہ کامل نیند تجدید قویٰ کا موجب ہوتی ہے، انسان اگر کافی حد تک نیند کرلے اور اپنی اس ضرورت کو بخوبی پورا کرلے تو بیدار ہونے پر نئی طاقت اور تازگی لے کر اٹھتا ہے اور اب وہ کاروبار کے لئے آمادہ ہوتا ہے۔ البتہ اس کا یہ معنی نہیں کہ کم اور ناقص نیند بالکل بے فائدہ اور بے اثر رہتی ہے، بلکہ نیند اگرچہ تھوڑی مدت کے لئے اور معمولی مقدار میں بھی کی ہو، تب بھی اپنا مفید اثر دکھاتی ہے، خستگی کو دور کرتی اور توانائی پیدا کرتی ہے۔

قال علیہ السلام: اربعة القلیل منها کثیر۔ النار القلیل منها کثیر والنوم القلیل منه کثیر والمرض القلیل منه کثیر والعداوة القلیل منها کثیر[۲]

امام علیہ السلام نے فرمایا ہے: کہ چار چیزیں ایسی ہیں کہ ان کی معمولی مقدار بھی کثیر ہوتی ہے: آگ۔ نیند۔ بیماری اور دشمنی۔ ان چاروں میں سے ہر ایک کی تھوڑی سی مقدار کو بھی ناچیز نہ سمجھو، بلکہ ان کی تھوڑی سی مقدار بھی زیادہ ہے اور اس میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ کثیر اثرات کی بنیاد بن جائے۔

کامل نیند

کامل نیند کے بارے میں اولین سوال یہ ہے کہ نیند کی کتنی مقدار طبیعی احتیاج کے لئے کافی ہوتی ہے؟ بالفاظ دیگر ایک انسان کو کتنے گھنٹے سونا چاہئے تاکہ کہا جائے کہ اس نے کافی اور کامل نیند کی ہے۔؟

''اس سوال کا جوب آسان نہیں۔ ایک طرف یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات جب نیند بہت گہری اور بھاری ہو تو ممکن ہے اس کی تھوڑی مقدار بھی کافی ہوجائے۔ دوسری طرف اختلاف افراد کے حالات کے لحاظ سے ان کے لئے نیند کی احتیاج بھی مختلف ہوتی ہے۔ یعنی عمر۔ عادت اور زندگانی کے حالات وغیرہ یہ سارے امور نیند کی مدت اور مقدار میں دخل رکھتے ہیں''

البتہ ایک قاعدہ جو عمومی طور پر بیان کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ ہر شخص کی عمر جس قدر بڑھتی جاتی ہے، اس کی نیند کی احتیاج اسی قدر کمتر ہوتی جاتی ہے۔ ایک نوزاد بچہ تقریباً دن رات میں بائیس گھنٹے سوتا ہے، لیکن بوڑھے لوگ بہت کم نیند کرتے ہیں۔ ان کے لئے

---

[۱] فزیالوجی پزشکی ص ۱۰۵۰

[۲] بحار الانوار، ج ۱۴ ص ۲۶۴

غالباً پانچ چھ گھنٹے کی نیند کافی ہوجاتی ہے،خواہ وہ نیند گہری نہ بھی ہو۔ایک بالغ شخص ایک شب و روز میں معمولاً سات سے آٹھ گھنٹے تک سوتا ہے،البتہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اپنی صحت وسلامتی کو نقصان پہنچائے بغیر عمومی قاعدے سے تجاوز کر جائے اور آٹھ گھنٹے سے زیادہ یا سات سے بھی کمتر سوئے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو سب وروز میں پانچ تا چھ گھنٹے سے زیادہ نہیں سوتے اور پھر بھی مکمل طور پر صحیح و سالم رہتے ہیں اور کاروبار میں ان کی مشغولیت بھی زیادہ رہتی ہے''

بچوں کی نیند

''بچوں کی نیند کے وقت کا تعین بہت آسان ہے، دو سے چار سال تک کے بچوں کو ایک دن رات میں پندرہ سے سولہ گھنٹے نیند آنا چاہئے۔ چار سے سات سال تک بارہ گھنٹے بارہ سولہ سال تک کی عمر میں ساڑھے آٹھ گھنٹے سے نو گھنٹے کی نیند ہونی چاہئے۔

چار پانچ سال تک کے بچوں کو رات کے علاوہ دن کو بھی سونا چاہئے۔ کیونکہ بچوں کے اعصاب کا سلسلہ انتہائی لطیف اور سخت حساس ہوتا ہے۔وہ بہت جلد تھک جاتے ہیں اور بالغ افراد کی نسبت سے نیند کے زیادہ محتاج ہوتے ہیں''

متوجہ رہنا چاہئے کہ نیند میں فقط بچوں کے اعصاب ہی آرام نہیں کرتے اوران کے قویٰ ہی کی تجدید نہیں ہوتی، بلکہ نیند کی حالت میں بالخصوص بچوں کی نشوونما کمال کو پہنچتی ہے۔اس لئے بچوں کی نیند کے نظام کو باقاعدہ رکھنا چاہئے، تاکہ اس سے ان کے نمو پانے اور پلنے بڑھنے کا عمل بہتر طریقے سے انجام پذیر ہو۔[1]

حیوانات اپنی کامل نیند کے لحاظ سے نیند کی ساعتوں میں تسلسل یا شب وروز میں چند حصوں پر اس کی تقسیم کرتے یا پورے سال میں ایک مرتبہ ایک لمبی مدت تک سوئے رہتے ہیں۔اس طرح وہ تین گروہوں میں تقسیم ہوجاتے ہیں:

۱۔ ایک مرحلہ کی نیند

۲۔ چند مرحلوں میں نیند

۳۔ موسمی نیند۔

ایک مرحلہ یا چند مرحلے کی نیند

حیوانات کی نیند اور بیداری کے اوقات کی اصلی بنیاد ان کے مقام سکونت کے حالات اور خصوصیات کے ساتھ ان کے مزاج کی موافقت پر ہے۔

نیند کی دو بڑی قسمیں ہیں:

ایک مرحلہ کی نیند: یعنی جب کوئی حیوان بغیر فاصلے کے چوبیس گھنٹے میں ایک بار نیند کرے۔

---

[1] دانستنی ہای جہان علم ص ۲۱۳

چند مرحلہ کی نیند: یعنی جب کوئی حیوان ایک دن رات میں کئی بار سوئے اور جاگے کہ کچھ دیر سولیا اور پھر کچھ دیر بیدار رہا اور اسی طرح کئی مرتبہ ایسا کرے۔

یہ چند مرحلوں والی نیند اکثر پالتو حیوانات میں دیکھنے میں آتی ہے۔ ایک بلی جو اون کے ایک گچھے سے کھیلتی ہے، وہ اپنے اس کھیل کے دوران کبھی کبھی سو لیتی ہے۔ کتا سخت دھوپ میں ادھر ادھر گھومنے اور بھونکتے ہوئے کبھی تھوڑی دیر کے لئے سو لیتا ہے۔

کچھ حیوانات ایسے ہیں کہ ان میں ایک اور قسم کی نیند پائی جاتی ہے کہ جو موسمی نیند ہے۔ یہ بے حسی والی نیند سال میں ایک لمبی مدت تک رہتی ہے۔ مثلاً خار پشت (جھا)۔ ریچھ۔ گلہری اور گورکن (بجو) موسم گرما میں اور ایک خاص قسم کا چوہا سردیوں میں اسی قسم کی نیند کرتے ہیں۔ اسی طرح گرم علاقے کے بعض حیوانات بھی اسی گروہ میں شمار ہوتے ہیں کہ جن کے لئے سخت گرمی نا قابل برداشت ہوتی ہے۔ یعنی وہ اس تپش میں اپنی مصروفیت انجام نہیں دے سکتے اور اس موسم میں نیند کرتے ہیں۔

موسم سرما اور گرما کی نیند

موسم سرما یا موسم گرما کی نیند۔ اپنی کیفیت اور مدت کی طوالت میں روزانہ کی نیند سے دو اعتبار سے جدا ہے اور اس سے جسم پر مرتب ہونے والے اثرات بھی علیحدہ ہیں۔ مثلاً ہمیں معلوم ہے کہ کچھ جانور ایسے ہیں کہ وہ موسم سرما یا گرما کی لمبی مدت میں اپنے جسم کا درجہ حرارت ایک خاص حد پر محفوظ رکھنے پر قدرت نہیں رکھتے، اس لئے ان کے بدن کا درجہ حرارت اور ان کے سوراخ اور بل کے اندر کا درجہ حرارت ایک ہو جاتا ہے۔

انسان میں کام کرنے اور سونے کا زمانہ اس کی عمر اور زندگی کے حالات کے تابع رہتا ہے۔ چنانچہ چند مرحلوں والی نیند خورد سال بچوں سے مخصوص ہے اور وہ شب و روز میں چند مرتبہ سوتے ہیں۔ نو جوان لوگ فقط رات کو ایک بار سوتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی بعض ایسے اوقات بھی آجاتے ہیں کہ کام کاج کی مصروفیات کے پیش نظر جوان آدمی چند مرحلوں والی نیند کو ایک مرحلہ کی نیند کے قائم مقام کر لیتا ہے۔[1]

انسان کی نیند

اگر سوال ہو کہ طبیعی اعتبار سے انسان کی نیند یک مرحلہ ہوتی ہے یا چند مرحلوں والی تو اس کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ نیند اور کسب معاش والی آیات قرآن میں سے بیشتر یہ کہتے ہیں کہ رات کو یک مرحلہ نیند اور دن کو کسب معاش۔ یہ نظام انسان کی طبیعت اور اس کی تخلیق کے لحاظ سے زیادہ مناسب اور اولیت رکھتا ہے۔

اس بارے میں متعدد آیات موجود ہیں

---

[1] خوابیدن وخواب کردن ص ۱۱

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الَّیْلَ لِتَسْکُنُوْا فِیْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا [1]

وَّجَعَلْنَا نَوْمَکُمْ سُبَاتًا ﴿۹﴾ وَّجَعَلْنَا الَّیْلَ لِبَاسًا ﴿۱۰﴾ وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ﴿۱۱﴾ [2]

اَلَمْ یَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّیْلَ لِیَسْکُنُوْا فِیْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا [3]

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الَّیْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ﴿۴۷﴾ [4]

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الَّیْلَ لِتَسْکُنُوْا فِیْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا [5]

رات نیند کے لیے ہے

ان تمام آیات میں لفظ ''جعل'' ستعمال ہوا ہے اوران سب سے مراد یہ ہے کہ خداوند کریم نے اپ نے تکوینی دستور میں یہ فیصلہ فرمایا ہے کہ رات نینداوراوراستراحت کے لئے مختص ہواور دن کوروزی کی تلاش اور زندگی کی دیگر ضروریات پوری کرنے کے لئے کام کاج ہو۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین نظام اوراعلیٰ قسم کی بدنی ساخت کے ساتھ پیدا کیا ہے، اس لئے انسان کو یہ اختیار حاصل ہے کہ خود کو مختلف حالات کے ساتھ منطبق کرے۔ بشر ایک محصور ومحدود چمگادڑ کی طرح نہیں جو مجبور ہو کہ دن کو حتماً آرام کرے، رات کو اپنی روزی کے لئے دوڑ دھوپ کرے اوراس طریقے کی مخالفت اس کے لئے ناممکن ہو۔

یک مرحلہ نیند بہتر ہے

اگر چہ انسان کے لئے زیادہ بہتر تو یہی ہے کہ رات کو یک مرحلہ نیند کرے اوردن کو محنت سے اپنا کاروبار کرے۔ تاہم وہ اس پر قادر ہے کہ اس میں تبدیلی کر کے شب وروز کو باہم ملادے۔ یعنی ان دونوں کے کچھ حصے میں نینداور کچھ حصے میں کاروبار کرے اوراس طرح اپنی زندگی وسلامتی کی حفاظت کرے۔ چنانچہ قرآن کریم نے آیت ذیل میں اس طرف اشارہ فرمایا ہے:۔

وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَکُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْکُنُوْا فِیْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ [6]

---

[1] سورۂ یونس۔ آیت ۶۷

[2] سورۂ نباء آیت ۹۔۱۰۔۱۱

[3] سورۂ نمل آیت ۸۶

[4] سورۂ فرقان آیت ۴۷

[5] سورۂ مومن آیت ۶۱

[6] سورۂ قصص آیت ۷۳

اوراس کی رحمت میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لئے رات اوردن بنائے ہیں تا کہ تم اس میں آرام کرواوراس کے فضل کو تلاش کرو۔

وَمِنۡ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمۡ بِالَّيۡلِ وَالنَّهَارِ وَابۡتِغَآؤُكُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ [1]

اوراس کی نشانیوں میں سے تمہاراسونارات اوردن کواورتمہارافضل تلاش کرنا۔

گزشتہ آیات میں رات کونیند کے لئے اوردن کوکاروبار کے لئے علیحدہ علیحدہ ذکرکیا گیااور یہ بات بڑی صراحت سے کی گئی ہے۔لیکن ان دوآیات میں دن رات کواکٹھالایا گیااورنینداورکاروبار کا تذکرہ بھی اکٹھا آیا ہے۔پس ہمارے لئے ممکن ہے کہ یوں بھی کہہ دیں کہ یہ دوآیات بھی گزشتہ آیات والے مطلب کو بتانا چاہتی ہیں۔لیکن چونکہ ان آیات میں طرز بیان تبدیل ہوا ہے۔نیز اس لئے کہ ان آیات کا آغاز رحمت و آیت کے عنوان سے ہوا ہے اس لئے یہ استفادہ بھی ممکن ہے کہ ان دوآیات کا مقصد یہی ہو کہ تمہارے لئے نینداورکاروبار کے لئے شب وروز دونوں سے ملاجلااستفادہ کرنا بھی ممکن ہے۔

چندمرحلوں کی نیند

گویادوآیات میں خداوندتعالیٰ لوگوں کو یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ اے انسانو! میں نے تمہیں ایسا پیدا کیا کہ تم اس پر قادر ہو کہ اپنی نینداورکاروبار کے لئے روز وشب سے ملاجلا فائدہ اٹھاؤ۔یعنی دن کا کچھ حصہ نیندکرواوررات کا کچھ حصہ کاروبارکرو۔یا چاہوتو پوری رات کوکاروبارمیں صرف کردواوردن کوسوجاؤ کہ اس سے بھی تمہاری صحت وسلامتی کوکوئی گزند نہ پہنچے گا۔

بشرمیں حالات کے ساتھ ڈھل جانے کی قدرت

یہ ایک نا قابل تردیدحقیقت ہے کہ بشرمیں تبدیلی کوقبول کرنے اورزندگی کے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ اپنے آپ کوسازگارکر لینے کی قدرت اس کے پیش رفت کرنے میں ایک بہت بڑی نعمت ہے۔آج کے اس میکانکی اورتکنیکی دورمیں پورے ترقی یافتہ ممالک میں صنعتی اوراقتصادی کاروباردن رات چلنے لگے ہیں ور چوبیس گھنٹے کام ہوتا رہتا ہے۔اب یہ روش رفتہ رفتہ دیگر ممالک تک وسیع ہوتی جارہی ہے اورکارخانہ جات میں کارکنان مختلف مرحلوں میں چوبیس گھنٹے کام میں مشغول رہتے ہیں۔تمام بڑے بڑے ہوائی اڈوں پران کی انتظامیہ کے افرادشب وروز مسافرین کی آمدورفت اور ہوائی جہازوں کی پروازوں کومنظم کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔اسی طرح ہسپتالوں میں ڈاکٹراورنرسیں،عالمی رابطوں کے مراکز میں فنی ماہرین اورملازمین غرضیکہ تمام اہم اداروں میں مختلف ذمہ داریاں رکھنے والے شب وروزکام میں مصروف نظرآتے ہیں۔

ان تمام امورمیں انسان کی کامیابی اس کی اس قدرت کی مرہون منت ہے کہ خداوندتعالیٰ نے اسے بدلتے ہوئے حالات

---

[1] سورۂ روم آیت ۲۳

کے مطابق خود کو ڈھالنے کی صلاحیت عطا فرما رکھی ہے۔ اگر انسان کی تخلیق اس طرح کی ہوتی کہ رات کو نیند کرنا اس کی زندگی کی بقاء کے لئے ضروری ہوتا اور وہ اس کے بغیر زندہ ہی نہ رہ سکتا تو واضح ہے کہ وہ کبھی ان عظیم کامیابیوں اور وسیع ذمہ داریوں میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش ہی نہ کرتا۔

لمبی مدت کی نیند

آج کے سائنس دانوں نے اپنی توجہ موسمی اور فصلی نیند کی طرف بھی معطوف کی ہے اور اب وہ ان حیوانات کے مطالعہ میں مصروف ہیں جو پورے موسم سرما کو نیند میں گزار دیتے ہیں۔ یہ کوشش اس امید کے ساتھ ہو رہی ہے کہ شاید کسی روز انہیں اس امر میں کامیابی حاصل ہو جائے کہ اس لمبی مدت والی نیند کو کسی انسان پر آزمانے میں کامیاب ہو جائیں اور آدمی کو بھی لمبی مدت تک کے لیے سلا دیں۔

اس کامیابی سے یہ فائدہ ہوگا کہ ڈاکٹر اس عمل سے بعض بیماریوں کے علاج میں استفادہ کر سکتے ہیں۔ علاوہ بر ایں جدید فضائی تحقیقات میں بشر کو کافی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اس نے آسمانی راہوں ڈ کا سفر شروع کر دیا ہے اور اب اس کی خواہش یہ ہے کہ آسمانی کروں میں جائے اور وہاں کے طبیعی حالات سے آگاہی حاصل کرے۔

بازوں کے لیے فصلی نیند

ہماری زمین سے چند ایک اجرام فلکی کا فاصلہ اس قدر زیادہ ہے کہ ہوائی جہاز اور خلائی راکٹ اپنی پوری سرعت کے ساتھ چلیں تو بھی ایک یا دو سال بعد اس تک پہنچنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اس قسم کے لمبے سفروں میں ان خلائی جہازوں کے مسافروں کے لئے سب سے مشکل ترین مسئلہ ان کی غذا۔ ہوا اور دیگر احتیاجات کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ چنانچہ اب سائنسی ماہرین اس نہج پر کام کر رہے ہیں کہ موسم سرما کی اس طولانی نیند سے استفادہ کریں اور ان خلا بازوں کو منزل مقصود پر پہنچنے تک کے عرصے میں لمبی نیند سلا دیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کی ضروریات قلیل ترین حد تک آ پہنچیں گی اور بشر کے لئے ان اجرام فلکی تک پہنچنے کا راستہ آسان ہو جائے گا۔

چنانچہ کرۂ مریخ یا زہرہ کی طرف راکٹ یا جہاز کی پرواز کے دوران خلانورد اس جہاز کے مخصوص سرد خانے میں چلے جائیں گے اور ایک انجکشن کے ساتھ موسم سرما کی طویل نیند سو جائیں گے۔ (یہ انجکشن سرمائی نیند کی مدت یا وقت کی تنظیم کا کام کرے گا)۔ پھر منزل مقصود پر پہنچ کر اس سرد خانے کا درجہ حرارت دوبارہ تجدید پائے گا اور خلانورد ایک یا دو سال کی لمبی نیند کے بعد بیدار ہو جائے گے۔'' اس طویل مدت میں تمام خلانورد خوراک نہیں کھائیں گے اور ان کی سانس آہستہ آہستہ چلتی رہے گی اور ان کے دل کی دھڑکن ستر بار فی منٹ کی بجائے چھ بار فی منٹ ہوگی۔ یہ سرمائی نیند بدن کی چربی کے ذخیرے سے گہری وابستگی رکھتی ہے اور موٹاپے کے ذریعہ

اس سرمائی نیند کی مدت میں اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس عرصے میں خلانوردوں کو اس جگہ کے گرم کرنے اور آکسیجن استعمال کرنے کی ضرورت نہ ہوگی، بلکہ اس میں ہر طرح سے کمی کر دی جائے گی۔ یہ موسم سرما کی نیند کوئی نئی بات نہیں بلکہ بہت سے حیوانات موسم سرما میں اس قسم کی نیند کرتے ہیں اور یہ ایک طبیعی امر ہے۔

''انگلینڈ کے بایوکیمیکل انسٹی ٹیوٹ کے سرپرست (ڈاکٹر لئونارڈ آکسبلر وڈ) نے اپنی ایک پریس کانفرنس میں کہا:۔ زیادہ سے زیادہ دس سال تک ہم اس بات پر قادر ہو جائیں گے کہ نجات بشر کے لئے سرمائی نیند سے استفادہ کریں۔''

تجربہ گاہوں میں اس وقت تک جو تجربات انجام دیئے گئے ہیں ان کے نتائج کو سامنے رکھنے سے سرمائی نیند پایہ ثبوت تک پہنچ گئی ہے اور اس سے درج ذیل آثار حاصل ہوئے ہیں:

۱۔ بدن کی حرارت میں کمی کہ جس سے بدن میں موجود مواد کا تبادلہ ہوتا ہے اس میں بہت نچلے درجے تک کمی واقع ہو جاتی ہے اور زندگی کی بقاء و دوام کے لئے اضافی چربی سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ بیرونی اسباب اگر نامناسب ہو جائیں تو وہ سرمائی نیند کی مدت میں کمی بھی کر دیتے ہیں۔

۳۔ سانس اور دل کی دھڑکن کی رفتار میں کم سے کم حد تک تنزلی ہو جاتی ہے۔ مثلاً وہ جانور جن کے دل کی دھڑکن یک صد پچاس بار فی منٹ تک آ جاتی ہے۔ بلکہ بعض ایسے حیوانات بھی ہیں کہ موسم سرما ایک طویل نیند میں ان کا دل ایک منٹ میں فقط ایک مرتبہ دھڑکتا ہے۔

۴۔ سرمائی نیند سے بدن کی حساسیت کی قوت میں کافی حد تک کمی آ جاتی ہے۔

۵۔ دماغ صفر درجہ حرارت پر رہتے ہوئے اپنی کارگزاری میں حداقل تک کمی کر دیتا ہے۔ وہ فقط بدن تک غذا پہچانے اور لازمی مادوں کے تبادلے کو کم سے کم صورت میں جاری کرنے اور نظام اعصاب کے لئے ان ضروری مادوں کی ترسیل برقرار رکھنے کے فرائض انجام دیتا رہتا ہے۔

یہ سرمائی نیند انسان کے لئے مندرجہ ذیل نتائج ذیل مرتب کرتی ہے۔

۱۔ انسان بدن کے لاغر ہونے کا بہترین ذریعہ ہے کیونکہ موسم سرما کی نیند میں زائد چربی والا مواد بتدریج بدن کے مصرف میں آ جاتا ہے۔

۲۔ بدن کے بیکٹر یا سرمائی نیند کے دوران نابود ہو جاتے ہیں۔

۳۔ بدن کی تمام فعال ریڈیائی شعاعیں اس سرمائی نیند میں ختم ہو جاتی ہیں۔

ایسے جانور جو کبھی سرمائی نیند نہیں کرتے، ممکن ہے کہ ان کو دماغی مائع کا ایک انجکشن لگانے سے موسم سرما میں تھوڑا تھوڑا سونا مکمل سرمائی نیند میں بدل جائے۔ ان خاصیتوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے حفظ صحت کے ماہرین سب سے پہلے بندر پر تجربہ کرتے رہے ہیں۔ چونکہ وہ انسان سے بہت زیادہ قریب ہے، اس پر نیند مسلط کرنے کا عمل دہراتے رہے ہیں۔

بڑی قوی امید ہے کہ آئندہ چند سالوں میں ہم کئی ایک انسان دردوں میں افاقے کے لئے اس سرمائی نیند سے استفادہ کرنے میں کامیاب ہو جائے۔یعنی ایسے انسانی افراد جو بیماری کی وجہ سے موت کے قریب اور لاعلاج ہوتے ہیں، انہیں اس سرمائی نیند کے ذریعے سلا دیا جائے۔ہاں ان کو ایک سردخانے میں سلا دیا جائے، تاکہ علاج اور دوا کے میسر آنے تک انہیں یہاں محفوظ اور زندہ رکھا جائے۔[1]

[1] مجلہ دانشمند شمارہ ۹ ص ۴۴

نیند کا بنیادی سبب

نیند کی علت کی پہچان

ماضی اور حال میں نیند کے متعلق جو اہم ترین مسئلہ ماہرین کی توجہ کا مرکز بنا رہا اور جس کی توجیہ و توضیح میں متعدد نظریئے سامنے آئے، وہ نیند کی علت کی پہچان ہے۔ ''یعنی اس سوال کا جواب کہ آخر یہ کیا سبب ہوتا ہے کہ ایک حیوان سوجاتا ہے؟'' یا ''حیوان پر کیوں نیند کا غلبہ ہو جاتا ہے؟''

فلاسفہ کا نظریہ

قدیم حکماء فلاسفہ اپنے دور کی علمی تشریح کی بنیاد پر جو نظریئے رکھتے تھے اور وہی کئی صدیوں تک ماہرین و محققین کا مقبول نظریہ بھی تھا۔ اسی کا خلاصہ جالینوس کی کتب تشریح اور دوسرے محققین کی کتب میں وارد ہوا اور وہ یہ ہے:۔

روح حیوانی ایک لطیف اور بخارات کی طرح کا جسم ہے کہ جس کا مرکز دل کے بائیں حصے کے جوف (یعنی کھلی جگہ) میں ہے۔ یہ بخار یا روح حیوانی خون کے ساتھ مل کر رگوں میں دوڑتی رہتی ہے۔ ایک حیوانی بدن کے تمام اعمال اور ساری حرکات اسی روح کی وجہ سے ہیں۔ چونکہ حواس ظاہری جسمانی اشیاء ہیں، اس لئے مسلسل محنت ان کو تھکا دیتی ہے اور وہ فرسودہ ہونے کے بموجب استراحت کے لئے مجبور ہونے لگتے ہیں، پس وہ اس استراحت بھری نیند کے ساتھ تجدید قویٰ کر لیتے ہیں۔ یہ امر اسی وقت تحقق پذیر ہوتا ہے، جب روح حیوانی تمام ظاہری حواس سے منقطع ہو جاتی ہے اور حس باطن کی طرف چلی جاتی ہے تو اس سے حیوان انسان کی نیند بھی دیگر حیوانات کی طرح روح حیوانی کے حواس ظاہری سے منقطع ہونے کا نام ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ انسان روح حیوانی کے علاوہ نفس ناطقہ انسانی کا بھی مالک ہے۔ اس نفس ناطقہ کے تمام ادراکات روح حیوانی کی کمک کے ساتھ ہوتے ہیں اور بیداری کے دوران نفس ناطقہ اس روح حیوانی جیسے بہترین وسیلے سے تعقل اور تفکر کرتا ہے اور نیند میں بھی اسی کے ذریعے اپنے کام کو جاری رکھتا ہے۔ تب وہ اپنی قوت حافظہ میں ذخیرہ شدہ تصاویر کے تجزیہ و ترکیب میں مصروف ہو جاتا ہے اور صورتوں کے اسی تجزیہ و ترکیب کو خواب دیکھنے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ [1]

مفردات راغب میں کلمۂ ''نوم'' کے بارے میں لکھا ہے:۔

((قیل ھو استرخاء اعصاب الدماغ برطوبات البخار ابلصاعد الیہ))

بعض صاحبان نے کہا ہے کہ نیند دماغ کے اعصاب کا ان بخارات کی رطوبتوں کے سبب سست ہو جانا ہے جو دماغ کی طرف

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۷

چڑھ جاتے ہیں۔

ارادی حرکات میں توقف

حکیم سبزواری فرماتے ہیں:۔

((ان النوم حالة تعرض للحیوان یقف فیها النفس عن الحس والحرکة الارادیة لا عن الافعال الطبیعیة))

نیند ایسی حالت میں ہے جو حیوان کو عارض ہوتی ہے کہ اس حالت میں نفس حیوان حس وحرکت ارادی سے محروم ہوجاتا ہے، لیکن اس کے طبیعی افعال ختم نہیں ہوتے۔

اس کے بعد آپ اس حالت کے نمودار ہونے کے اسباب کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

روح حیوانی کا بدن کے ظاہری قویٰ سے جدا ہونا اور باطن میں مرکوز ہوجانا درحقیقت روح کے استراحت کرنے کی غرض سے ہوتا ہے۔ کیونکہ روح ایک لطیف جسم ہے جو مادی بدن کی نسبت زیادہ اثر قبول کرتا ہے۔ اگر حیوان میں بیداری تسلسل پکڑ جائے تو روح تحلیل کا شکار ہوجاتی ہے اور بالآخر بالکل ختم ہوجاتی ہے۔ کیونکہ حیوانی بدن کی حس وحرکت روح حیوانی کی حرکت کے نتیجے میں ہے اور روح حیوانی کی حرکت اگر دائما" برقرار رہے گی تو وہ روح کے جوہر کی تحلیل کا موجب بن جائے گی، اس لئے یہ روح حیوان نیند کے وقت باطن میں مقیم ہوجاتی ہے۔

النوم جس الروح فی الدماغ

(نیند روح کا دماغ میں محبوس ہونا ہے)

پس روح دماغ میں حاضر ہوجاتی ہے تا کہ تجدید قویٰ کرلے اور اس نے بیداری کے اوقات میں جس قدر توانائیاں صرف کی ہیں، ان کا بدل حاصل کرلے۔[1]

دور حاضر کا عالمی ترقی یافتہ نظام علم وصنعت کی ترقی کا باعث بنا ہے تو اس سے بہت سے علمی نظرئے عظیم تبدیلیوں کا شکار ہوئے اور انسان کی نگاہ دنیا کی بہت سی اشیاء کے متعلق تبدیل ہوگئی ہے۔ چنانچہ مختلف علوم کے کئی شعبوں میں جو نظریات گزشتہ دور کے فلاسفہ و ماہرین کے ہاں مقبول تھے، وہ آج متروک اور غیر صحیح قرار دیئے جاچکے ہیں۔

نینداورنئی تحقیق

اس جدید دور تحقیق میں زیر غور لائے جانے والے مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ زندہ موجودات سے مربوط مسائل اور ان

[1] شرح منظومہ ص ۳۱۸

کی زندگی کا موضوع ہے۔ان کی زندگی کی شناخت۔ان کے اعضاء بدن کی پہچان۔اعضاء کے فرائض کی شناسائی۔زندہ جسم کے اعضاء کی اپنی طبیعی ذمہ داریاں اور دوسرے ابدان سے متعلق رابطے کے حقائق وغیرہ ایسے تمام موضوعات پر بہت زیادہ کتابیں لکھی گئی ہیں۔اور تخصص رکھنے والے ماہر سائنس دان مختلف مسائل میں پیش کئے گئے نظریات میں صحیح اور غلط کی شناخت کر کے پورے عالم کے سامنے پیش کرتے رہے ہیں۔

چونکہ نیند بھی زندہ موجودات کے عوارض میں سے ایک ہے، لہٰذا یہ بھی ان ماہرین کے ہاں غور وخوض کا مورد قرار پائی ہے۔ پس جدید دور کی تحقیق میں نیند کے بارے میں کئی ایک نظریئے سامنے آئے اور بعض محققین کے ہاں مورد قبول قرار پائے ہیں۔لیکن ان نظریوں کا ایک بہت بڑا حصہ علمی اور تجرباتی عمل میں قابل تردید قرار دے دیا گیا ہے، ان میں سے چند ایک نظریوں سے آپ کو باخبر کرنے اور ان کی تردید کے دلائل سے آگاہ کرنے کے لئے ہم یہاں کچھ اشارے کئے دیتے ہیں۔

۱۔ نیند کے بنیادی اسباب کے بارے میں ایک مفروضہ یہ ہے کہ اس کا سبب دماغ کی طرف دوران خون کی کمی ہے۔ چنانچہ اس نظریئے کے حامیوں نے کہا ہے کہ نیند دماغ میں خون کے دوران میں تبدیلی واقع ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ان کا تصور یہی تھا کہ جوں ہی دماغ کی طرف خون کا دوران سست پڑتا ہے تو انسان کو نیند آجاتی ہے۔

ضروری ہے کہ پہلے اس نکتے کی طرف اشارہ کر دیا جائے کہ عام حالات میں اور بیداری کے وقت خون کا دوران دماغ کی طرف دیگر تمام اعضاء بدن اور عضلات کی نسبت زیادہ مقدار میں ہوتا ہے اور دماغ کو دیگر اعضاء کے مقابل خون کی ضرورت بھی زیادہ رہتی ہے۔

دوران خون میں تیزی

''ہمیں معلوم ہے کہ ایک لیٹر خون ہر ایک منٹ میں ایک سو دس کیلومیٹر لمبی رگوں کے گھتم گھتا جال میں سے گزرتا ہے۔نیز دماغ کو خون پہنچانے والی داخلی رگ میں خون کے دوران کی سرعت بیرونی شاہ رگ میں خون کے دوران سے ایک سو پچاس درجہ زیادہ ہوتی ہے جو بدن کے بقیہ حصوں تک خون پہنچاتی ہے۔''[۱]

آپ اگر ایک کتے کا گردہ باہر نکال لیں، اسے ایک گھنٹہ تک باہر محفوظ رکھیں اور پھر دوبارہ اس کو حیوان سے پیوست کر دیں۔یہ ایسا عضو ہے کہ خون سے وقتی طور پر پیش آنے والی اس محرومیت کو برداشت کر لیتا ہے اور اپنے طبیعی عادی اعمال کو از سر نو شروع کر دیتا ہے۔اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ہاتھوں اور پاؤں سے خون کی گردش کو تین یا چار گھنٹے روک لیا جائے، لیکن دماغ آکسیجن کے فقدان کے مسئلے میں سخت حساس ہے۔اگر یہ بیس منٹ تک خون سے محروم رہے اور اسے خون نہ ملے تو اس کی موت حتمی ہے۔حتیٰ کہ اگر پندرہ منٹ تک بھی اسے خون نہ ملے تو اس میں بہت سے نقائص اور کمزوریاں پیدا جاتی ہیں کہ جن کا پھر سے درست ہونا محال ہے اور

---

[۱] خوابیدن وخواب کردن ص ۱۹

جس شخص کا دماغ اتنی مدت تک آکسیجن سے محروم رہے اس کی درستی ناممکن ہے۔[1]

ترازو نما پلنگ

اٹلی کا سائنس دان ''اینگلوموسو'' جو اس مفروضے کا حامی تھا کہ نیند کا بنیادی سبب دماغ میں گردش خون کا کمزور پڑ جانا ہے، اس نے اس کے اثبات کے لئے ایک ایسا پلنگ تیار کیا جو ترازو کی شکل کا تھا۔ تاکہ معلوم ہو سکے کہ کیا نیند کے وقت دماغ میں گردش خون کی کمی ہوتی ہے یا زیادتی ہو جاتی ہے؟

''وہ ترازو نما پلنگ اس طرح بنایا گیا تھا کہ جب کوئی شخص اس پر دراز ہو کر متوازن کیفیت اختیار کرتا اور ابھی بیدار ہوتا تو اس پر لگی ہوئی سوئی صفر پر آ جاتی ہے۔ پھر جب یہ شخص سو جاتا اور اس کے سر یا پاؤں میں سے کسی طرف خون میں اضافہ ہوتا تو سوئی اس کے برعکس جھکنے لگتی اور اس طرح وہ گردش خون کی کمی یا اضافہ مکمل طور پر بتا دیتی تھی''۔

اس تجربے سے نتیجہ برآمد ہوا کہ جب کوئی شخص نیند میں جاتا ہے تو اس کے پاؤں وزنی ہوتے جاتے ہیں، لیکن جب وہ بیدار ہوتا ہے تو اس کے سر کا وزن بڑھنے لگتا ہے۔ اس سے اٹلی کے اس سائنس دان نے یہ معلوم کیا کہ نیند کا آغاز دماغ میں خون کی مقدار میں کمی واقع ہونے سے مربوط ہے۔[2]

نینداور خون کی تقسیم

فرانس کے ایک سائنس دان ''ارنسٹ ویر'' نے اس ترازو نما پلنگ کے تجربے کے رد میں کہا کہ ''اینگلوموسو'' نے اپنے تجربے کی غلط تفسیر پیش کی ہے۔ یہ بات تو صحیح ہے کہ نیند کے وقت پاؤں زیادہ وزنی ہو جاتے ہیں، لیکن ان کے وزنی ہونے کی وجہ دماغ سے خون کا نکلنا نہیں ہے۔ بلکہ اس تبدیلی کا سبب خون کا بدن کے اعضاء میں نئے انداز میں تقسیم ہونے کا عمل ہے جو نیند کے عالم میں مرتب ہوتا ہے۔ مختصر الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ جب ہم نیند میں جاتے ہیں تو بدن میں خون کی تقسیم کے انداز میں تبدیلی آتی ہے اور اس کے نتیجے میں پاؤں زیادہ وزنی ہو جاتے ہیں۔ گویا معاملہ یوں نہیں کہ ہم یہ کہہ سکیں کہ خون کی تقسیم میں تبدیلی نیند آنے کا موجب بنتی ہے۔ (یعنی نیند خون کی تقسیم میں تبدیلی واقع ہونے کی علت ہے نہ کہ خون کی تقسیم میں تبدیلی نیند آنے کی علت ہے)۔

''نیند کے وقت بدن کا نظام اور اس کے اعضاء کی کارگزاری بدل جاتی ہے۔ دل کی دھڑکن کمزور اور آہستہ پڑ جاتی ہے اور اس کے درمیانی وقفے طولانی ہو جاتے ہیں۔ خون کا دباؤ نیچے آ جاتا ہے اور زندگی کے بنیادی ارکان مثلاً دماغ۔ جگر۔ گردے وغیرہ کی طرف خون کا دوران آہستہ ہو جاتا ہے۔ بدن کی جلد میں موجود رگیں کھل جاتی ہیں اور ان میں خون کی مقدار میں اضافہ ہو

---

[1] انسان ناشناختہ ص ۷۹

[2] خواب ورؤیا ص ۳۳

جا تا ہے۔ باوجودیکہ بدن کا عمومی درجہ حرارت گر جا تا ہے، تاہم جلدی گرم تر ہوجاتی ہے اور نظام تنفس آہستہ گہرا اور راحت بھرا ہو جا تا ہے۔ (اکسید اسیون) کی روانی اور (میٹا پولیزم) کے جلنے اور بننے کے عمل میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور نیند کے اوقات میں گردہ بہت کم مقدار میں یعنی دو سے چار مرتبہ تک ترشیح کرتا ہے''۔[1]

نیند کے دوران دماغ میں گردش خون میں جس سستی اور خون کے دباؤ میں جس کمی کا مشاہدہ ہوتا ہے وہ نیند کی علت نہیں ہوتے، بلکہ ایسے امور ہیں جو نیند کے ذریعے وجود میں آتے ہیں۔''[2]

---

[1] خوابیدن وخواب کردن ص ۱۷۔ ۲۳

[2] خوابیدن وخواب کردن ص ۱۷۔ ۲۳

(۲) نیند کا کیمیاوی نظریہ

کیمیاوی نظریہ

نیند کے سبب کسی تشخیص میں سائنس دانوں کو ایک اور نظریہ جو سامنے آیا، وہ یہ ہے کہ نیند چند ایسے زہریلے مادوں کا معمول ہوتی ہے جو بدن میں کیمیاوی فعل وانفعال اور اس کی سوخت وساخت سے پیدا ہوتے ہیں۔ایک آدمی بیداری میں جتنا زیادہ کام کرتا ہے، ان کے بدن میں زہریلے کیمیاوی مادوں کا اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ پھر یہ زہریلے مادے دماغ۔اعصاب۔خون اور دیگر جسمانی نظام پر اپنا اثر چھوڑتے ہیں اور کام کاج کرنے کی طاقت سلب کر لیتے ہیں۔

نینداس مقصد کے لئے ہوتی ہے کہ دماغ۔اعصاب کا جال۔ بدن کے دیگر اعضاء اور اس کا تانا بانا کچھ دیر کے لئے اپنی عادی کارگزاریوں سے باز رہے اور کچھ دیر تک فرصت پائے۔ تاکہ کام کاج کی وجہ سے پیدا شدہ زہریلے موادا کو دور کرلے اور آئندہ کے لئے تازہ دم ہوکر خود کو کام کے لئے تیار کر سکے۔۔

''فرانسیسی سائنس دانوں ''لوژ ندر اور پیرن'' نے اس کیمیاوی نظریئے کے اثبات کے لئے بہت زیادہ تجرباتی نیندیں انجام دی ہیں۔ان ماہرین نے اپنے علمی مفروضے کی درستی کو ثابت کرنے کے لئے یوں کیا کہ ایسے کتے جنہیں زیادہ دیر تک نیند سے باز رکھا گیا تھا۔ان کے خون سے سرنج بھر لئے اور وہ ایسے کتوں کو لگا دئے جو نیند سے تازہ بیدار ہوئے تھے۔تب یہ دوسرے کتے اس خون کے ٹیکے کے لگتے ہی بلا فاصلہ دوبارہ سو گئے۔ اسی طرح جب دس دنوں تک بیدار رہنے والے کتوں کے دماغ سے سیاہ رنگ کا مائع نکال کر تازہ بیدار ہونے اور مکمل استراحت سے فارغ ہونے والے کتوں کے دماغ میں داخل کیا گیا تو بھی یہی نتیجہ برآمد ہوا اور وہ کتے دوبارہ سو گئے''۔

''لوژ ندر اور پیرن نے ان تجربات سے یہ نتیجہ نکالا کہ نیند دماغ کے مسموم ہونے یا ان خواب آور زہروں کا نتیجہ ہوتی ہے جو خون، دماغ کے مائعات اور سیاہ نکتے میں جمع ہو جاتی ہیں۔ان کے بعد دیگر سائنس دانوں نے بھی اس طریقے سے مزید تجربات کئے تو انہوں نے اسی سے ملتے جلتے نتائج حاصل کئے''۔[1]

لیکن عملی تحقیقات اور سائنس دانوں کے تجربات کے بعد یہ نظریہ بھی مسترد کر دیا گیا ہے اور چند ایک قطعی اور ناقابل تردید دلائل کے ذریعے یہ بات آشکار ہوگئی ہے کہ یہ نظریہ صحیح نہیں، چنانچہ وہ دلائل ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں۔

لوژ ندر اور پیرن کتوں کو نیند سے باز رکھنے کے لئے چند دن سخت ترین کاموں میں مصروف رکھتے تھے کہ جس سے ان میں

---

[1] خوابیدن وخواب کردن ص ۲۳

خصوصی تھکاوٹ اور وارفتگی کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔لیکن اس کیفیت کو عام حالات کی نیند سے ماقبل والی حالت سے کوئی اشتراک حاصل نہیں ہوتا تھا۔

یہ نظریہ معمول کے مطابق نیند کے آغاز اور پھر اچانک بیداری سے سخت مغایرت رکھتا ہے۔اگر نیند کا سبب اپنے بدن کی مسمومیت ہوتو چاہیئے کہ نیند بتدریج آئے اور خواب آور زہریلے مواد کے خون کے اندر تدریجی طور پر اثر انداز ہونے والے عمل کے مطابق وجود پائے۔ پھر اس طرح سویا ہوا شخص بتدریج بیدار ہو کہ اس کا بیداری کا عمل خون سے زہریلے مواد کے اثرات کے زائل ہونے والے تدریجی انداز کے ساتھ مطابقت پیدا کر سکے۔

اس مفروضے میں نیند کے عمومی قانون کے ساتھ دوسرا تناقص یہ سامنے آتا ہے کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ فقط چند منٹوں کی نیند انسان کو تروتازہ کرنے، کام کرنے کی صلاحیت بحال کرنے اور نشاط بخشنے کے لئے کافی ہو جاتی ہے نیز نیند کا احتیاج کا احساس بھی ختم کر دیتی ہے۔''

دو جڑواں بچے

پروفیسر روخلین کہتا ہے:۔ پی آنوخین اور ٹی الکسیو اان دو روسی سائنس دانوں نے دو ایسے جڑواں بچوں پر تجربات کئے جو باہم جڑے ہوئے تھے۔ان تجربات نے اس مورد بحث نظریئے پر تنقید اور اس کے تجزیہ وتحلیل کی طرف خصوصی توجہ مبذول کرادی ہے۔کیونکہ ان دونوں نے ''ماشا'' اور ''لاشا'' نامی دو جڑواں اور باہم جڑے ہوئے بچوں پر بڑی مدت تک تجربے کئے۔ان دونوں کی نوعیت یہ تھی کہ ان میں باہم جڑے ہوئے ہونے کے باوجود خون کی گردش تو مشترک تھی۔

لیکن اعصابی ''نظام جداگانہ تھا۔ان کی گردش خون کے مشترک ہونے کا ثبوت یہ تھا کہ دونوں کے خون کی ترکیب اور قسم ایک تھی اور جب ان میں سے ایک کے خون میں ٹیکے کے ذریعے کوئی مواد داخل کیا جاتا تو وہی مواد دوسرے کے خون میں بھی آ جاتا، اس سے معلوم ہو گیا کہ دونوں کا گردش خون کا نظام ایک ہے۔مثلاً ان میں سے ایک کو کسی بیماری کے دفعیئے مثلاً کسی پھوڑے وغیرہ کے دور کرنے کے لئے کوئی ایسا ٹیکہ لگایا جاتا تو دوسرے بچے کے اندر بھی اس بیماری سے تحفظ کے آثار وجود میں آ جاتے۔

ان دونوں کے اعصابی نظام کے جداگانہ ہونے کی دلیل یہ تھی کہ ان کے بدن کے ڈھانچے اور ان میں ہر ایک کی اپنی مستقل حساسیت تھی اور ہر ایک جداگانہ ردعمل دکھاتا تھا۔مثلاً اگر دو میں سے کسی ایک کے ہاتھ پر ایک سخت چٹکی لی جاتی تو فقط وہی اپنا ہاتھ کھینچ کر ردعمل دکھاتا۔اور دوسرا کوئی اثر نہ لیتا۔''

چنانچہ ان دونوں کی چوبیس گھنٹوں کی طبیعی نیند کا گہرا جائزہ لیا گیا اور پھر اسی طرح ان باہم جڑے ہوئے بچوں میں سے ہر ایک کی نیند کو مختلف حالات کے تحت بھی زیر تحقیق لایا گیا۔مثلاً انہیں ایسی مختلف غذائیں علیحدہ علیحدہ دی گئیں جو نیند پر مختلف اثرات مرتب کرتی ہیں، چنانچہ اس تجربے کے نتیجے میں جو کچھ سامنے آیا اس سے معلوم ہوا کہ ان دونوں کی نیند آنے کی مدت، نیند کرنے کی

مدت یا بیدار ہونے کے وقت اور طریقے وغیرہ ان تمام امور میں ان کے درمیان تھوڑا سا فرق موجود ہے۔ مثلاً اگر ان دو میں سے ایک سویا ہوا ہے تو دوسرا کاملاً بیدار اور آنکھیں کھولے ہوئے ہے۔''

اسی طرح چند ایک دیگر سائنس دانوں کی تحقیقات اور بالخصوص انگریز سائنس دان شرسبوری نے اسی قسم کے دو باہم جڑے ہوئے جڑواں بچوں پر ۱۹۴۹ء میں جو تجربات کئے، ان سے ثابت ہوا تھا کہ ان دونوں میں سے ہر ایک کی نیند دوسرے سے علیحدہ ہے۔ یہ دونوں جڑواں بچے مختلف اوقات میں سوتے تھے اور ان کی نیند کی طبیعی کیفیت میں باہم فرق تھا۔ پس ان باہم جڑے ہوئے جڑواں بچوں میں جداگانہ نیند کا موجود ہونا نیند کے اس کیمیاوی مفروضے کے خلاف ایک قطعی ثبوت ہے۔ کیونکہ اگر نیند خون مین موجود خواب آور زہروں کے اکٹھے ہونے کا نتیجہ ہو اور ان کیمیاوی مواد کا اثر نیند کی شکل میں نمودار ہوتا تو پھر ضروری ہے کہ ایسے دو باہم جڑے ہوئے بچوں میں دونوں کو ایک ہی وقت میں نیند آئے۔ حالانکہ حالت یہ تھی کہ ان دونوں کو کبھی بھی اکٹھے نیند نہ آتی تھی۔''[۱]

---

[۱] خوابیدن وخواب کردن ص ۲۴

(۳) دماغ میں نیند کے مرکز کا وجود

ایک یہ نظریہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ سلسلہ اعصاب کے مرکزی نظام میں ایک مخصوص نقطہ موجود ہے کہ جسے مرکزی حیثیت حاصل ہے۔اس نظریئے کے حامی یہ کہتے ہیں:

نیند زندگی کے مظاہرات میں سے ایک ضروری مظاہرہ ہے، دماغ میں جس طرح ہضم، تنفس اور زندگی کی دیگر بنیادی فعالیتوں میں سے ہر ایک کا ایک مرکز موجود ہے کہ جو اس کو منظم کرتا ہے، اسی طرح دماغ کے مرکزی اعصاب میں ایک مخصوص نقطہ نیند کے لئے بھی موجود ہے اور اسی مخصوص نقطے کی تحریک نیند کے ظاہر ہونے کا باعث ہوتی ہے۔لیکن گزشتہ دو مفروضوں کی طرح یہ مفروضہ بھی آج کل کے اہل دانش اور سائنس دانوں کے ہاں غلط قرار دیا گیا ہے اور قبول نہیں ہوسکا۔

ایک اور کمزور نظریہ

''مس سیپی یونیورسٹی میں فزکس اور بایوفزکس کے ماہر استاد پروفیسر گائیٹون کہتے ہیں:

آج سے پندرہ سال قبل تک یہ نظریہ قائم تھا کہ مرکزی اعصاب کی لڑی میں نیند کے لئے بھی ایک مرکز موجود ہے اور اس مرکز کی تحریک ایک شخص کو نیند میں لے جانے کا موجب بنتی ہے۔لیکن یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مزانسفالیک کا ایک حصہ جو جالی کی سی ترکیب رکھتا ہے اس کی برقی تحریک اس امر کا سبب بنتی ہے کہ دماغ کی سطح فوری طور پر فعال ہوجاتی ہے اور اسی سے سویا ہوا جاندار اچانک بیدار ہوجاتا ہے۔''[1]

چونکہ یہ بات مفید اور سودمند رہے گی کہ ہمیں اس نظریہ اور اس کے طرف داران کے دلائل پر زیادہ سے زیادہ اطلاع حاصل ہو اور اسی طرح اس نظریئے کے مخالفین نے اس کے رد میں جو دلائل پیش کئے ہیں وہ بھی ہمیں معلوم ہوں۔اس لئے ہم اس بارے میں ایک مکمل خلاصہ آپ کی خدمت میں بالاختصار پیش کئے دیتے ہیں۔

''پروفیسر روخلین'' کہتا ہے: اس نظریئے کے حامیوں کی بہت بڑی تعداد کا کہنا یہ ہے کہ نیند کا مرکزہ ہمارے دماغ کی نیم دائرہ خاکستری کھوپڑی کے نیچے (کورٹکس) نامی حصے کے اندر ہے۔ان سائنس دانوں کا استدلال دو قسم کے حقائق پر استوار ہے''

پہلی قسم کے حقائق کلینک میں ان مریضوں کے مشاہدہ سے متعلق ہیں جو گہری نیند نہ آنے والی بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں۔ آسٹریلیا کے سائنس دان ''اکونومو'' نے ایسے افراد کے دماغ کے اپریشن کئے جو دماغ کے ورم کی بیماری سے فوت ہوگئے۔(یہ ایک ایسی بیماری ہوتی ہے کہ جس کے علامات میں سے ایک علامت طولانی نیند ہوتی ہے کہ بعض اوقات کئی روز تک جاری رہتی ہے) اس

---

[1] فزیالوجی پزشکی ص ۱۰۴۵

آپریشن سے معلوم ہوا کہ ان مریضوں کے دماغ میں اس بیماری سے جو تبدیلیاں مرتب ہوئیں وہ دماغ کے پیندے کے قریب دیکھی گئیں۔ان مریضوں پر اس لمبی نیند کے مسلط ہونے کی وجہ دماغ کے ورم زدہ ہونے کی وجہ سے اس مرکزہ کا تحریک پانا تھا۔

دماغ میں بجلی کی لہر گزارنا

''دوسری قسم کے حقائق میں وہ نتائج شامل ہیں جو سوئٹزرلینڈ کے سائنس دان لٹوہس کے فزیکی تجربات کے ذریعے سامنے آئے ہیں۔اس سائنس دان نے زیر تجربہ حیوانات کی کھوپڑیوں میں سوراخ کیئے، ان میں سے بجلی کے مخصوص تار گزارے اور دماغ کے معین حصوں میں ان کی کارگزاری کا جائزہ لیا۔''

یہ دو عدد نازک قسم کے برقی تار تھے جن کے دونوں سروں کے علاوہ باقی سارا حصہ مضبوط طور چھپا ہوا تھا۔لٹوہس نے ان کو دماغ کے اندر اپنی حالت پر رہنے دیا اور ان کے بیرونی سرے کو کھوپڑی کے سوراخ کے ساتھ مضبوطی سے جوڑا اور زخم کو ٹانکے لگا کر بند کر دیا۔ چند روز بعد جب وہ حیوانات شفا پا گئے اور ان کے زخم بھر گئے تو پھر اس نے اپنے تجربے کا آغاز کیا اور ان تاروں کے ذریعے دماغ تک بجلی کی لہر دوڑائی۔''

یہ تار جن جانوروں کے دماغ کے پیندے کے قریب یعنی (ہیپوٹالامس) کی طرف لگے تھے، جونہی بجلی کی رو تاروں سے گزرتی وہ حیوان گہری نیند سو جاتے۔لیکن جن حیوانات میں یہ تار دماغ کے کسی اور حصے میں تھے، ان میں بجلی کی لہر سے نیند مسلط نہیں ہوتی تھی۔اسی طرح کے تجربات دیگر سائنس دانوں نے بھی انجام دیۓ جن میں سے ایک (ٹونیخ) نامی روسی سائنس دان بھی ہے، ان سب کے تجربات سے اسی قسم کے نتائج برآمد ہوئے۔''[1]

اب ان ماہرین سائنس کی گفتگو کا خلاصہ بھی سنئے جو اس نظریئے کو صحیح نہیں سمجھتے، وہ کہتے ہیں:۔اس نظریئے کے حامیوں نے دماغ کے ورم میں مبتلا یا بجلی کی تاثیر کے تحت رکھے جانے والے بیماروں پر نیند کے مسلط ہونے کی جو علت بیان کی، وہ ایک غلط تفسیر ہے ان کی نینداس وجہ سے نہیں ہے کہ دماغ کے اندر نیند کے لئے کوئی خصوصی مرکز موجود ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ بیماری یا اس خاص نقطہ کو تحریک دینا اس امر سے مانع ہو جاتا ہے کہ نظام دماغی اپنی ان فعال حرکات کو جاری رکھ سکے کہ جو بیداری کا سبب بنتی ہیں۔ چونکہ بیدار کرنے والا وہ سارا نظام معطل ہو جاتا ہے، اس لئے نتیجہ کے طور پر نیند طاری ہو جاتی ہے، تاہم اس بات کی مزید وضاحت چوتھے نظریئے کے بیان میں ہو جائیگی۔

(زیر کورٹکس) مرکز نیند کا یہ مفروضہ (ایوان پاؤلوف) کے مخالفت کا شکار ہوا ہے۔اس نے ان تمام واقعات کی تفسیر

---

[1] خوابیدن وخواب کردن ص ۲۷۔۲۸

ایک طرح سے پیش کی ہے کہ جن پر اس مفروضے والوں نے اپنی بنیاد قائم کر رکھی ہے۔ (پاؤلوف) نے دماغ کے اندر نیند کے ایک مرکز کے وجود سے انکار کیا اور اس نے یہ ملاحظہ کیا کہ دماغی ورم کے مرض میں مبتلا مریضوں کا ایک غیر طبیعی قسم کی نیند کا شکار ہو جانا (ہپوتالاموس) میں نیند کے کسی مرکز تحریک میں آ جانے کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ نیند دماغ کے ایک حصے میں ایک آسیب اور خرابی کا نتیجہ ہوتی ہے جو دل اور پھیپھڑوں جیسے اندرونی اعضاء کی تحریکات کے لئے مانع بن جاتی ہے۔ گویا یہ تحریکات بیداری کو برقرار رکھنے اور اس کی حفاظت کرنے کا اہم ترین عامل ہوتی ہیں۔

(پاؤلوف) کا نظریہ تھا کہ دماغی ورم میں مبتلا افراد کی نینداس نیند سے بہت زیادہ مشابہ ہوتی ہے جو اس کے شاگردوں میں سے ایک (گالکین) نے چند کتوں پر طاری کی تھی۔ (گالکین) نے ان کے دماغ کا سونگھنے۔ سننے والے اعضاء سے رابطہ قطع کر دیا، اس طریقے سے وہ ان کے دماغ کے اندر بیرونی تحریکات کے انتقال کو بہت حد تک کم کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

نیند کے شرائط پیدا کرنا

سوئیٹزرلینڈ کے معروف ماہر فزیالوجی (لسوہس) کے بجلی کی لہر دوڑانے والے مشہور تجربے کے بارے میں (پاؤلوف) نے یوں کہا: اس تجربے کے دوران مخصوص اعصابی جراثیم کا گروہ جو نیند کو منظم کرنے کا فریضہ ادا کرتا ہے) اسے بالکل تحریک نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ ان اعصابی کارگزاریوں کو ختم کرنے والے مخ کو تحریک ہوئی تھی اور اس طریقے سے وہ کمزور سی تحریکات جو برقی رو کے ساتھ دماغ کے اندر ایجاد ہوتی ہیں، اب وہ مخ (بھیجے) تک پہنچ گئی تھیں۔ چنانچہ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ نیند کے لئے مناسب حالات پیدا ہو گئے، وہ بالکل اسی طرح تھے جیسے بیرونی ضعیف تحرکات کے بسبب پیدا ہونے والے حالات کی وجہ سے نیند رونما ہو جاتی ہے۔[1]

البتہ کورٹکس کے نیچے نیند کے لئے ایک مخصوص مرکز کے موجود ہونے سے ہمارے انکار کا یہ مطلب نہیں کہ دماغ کا یہ حصہ نیند کی تولید میں کسی قسم کا کوئی اثر نہیں رکھتا۔ بلکہ اس کے برعکس ''فزیالوجی'' کے نقطہ نگاہ سے اس حصے کا نیند آنے میں مؤثر ہونا محقق اور ماہر لوگوں کی طرف سے تائید شدہ ہے۔

دماغ کے مراکز عالی کی تحریک کو روک دینے کا نظریہ

نیند کے بارے میں جو نظریہ بہترین سمجھا گیا اور دور حاضر میں اہل دانش اور سائنس دان طبقے کے ہاں بحث ونظر کے بعد مورد قبول قرار پایا ہے، وہ یہ ہے کہ نیند یعنی وسیع بنیادوں پر اس حد تک ممنوعیت اور بازداشت کہ وہ ممنوعیت دماغ کے تمام مراکز عالیہ پر غالب آ جائے اور فعال اور کارکن تحریکات کے نظام کو برکنار کر دے۔

''پروفیسر گائٹون کہتا ہے:۔ آج یہ بات روشن ہو چکی ہے کہ بیداری دماغ کے مختلف حصوں کے سخت فعالیت میں مصروف

---

[1] خوابیدن وخواب کردن ص ۲۷۔۲۸

ہونے کا نتیجہ اور نینداس قسم کی فعالیت کے فقدان کا نتیجہ ہے۔''[۱]

دماغ یاایک پیچیدہ عضو

انسانی دماغ ایک ایسا پیچیدہ ترین عضو ہے جو آدمی کے اندر خلق فرمایا گیااور وہ اس کتاب آفرنیش میں آیات الٰہی میں سے ایک بہت بڑی نشانی ہے۔روحانی اور مادی دونوں مکاتب فکر میں دماغ تعقل وتفکر۔ ہوش وحافظہ۔دیکھنے اور سننے۔سونگھنے اور چکھنے کا مرکز ہے۔دماغ ایک ایسا حکمران عضو ہے جو اپنے وسیع اور پیچیدہ نظام کے ذریعے بدن کے تمام اعمال کی نگرانی کرتا ہے۔دماغ اپنے وسیع اعصابی نظام کے توسط سے بدن کے تمام اطراف سے پیش آمدہ تحریکات کی اطلاع حاصل کرتا اور پھران پر اپنے موزوں عکس العمل کا اظہار کرتا رہتا ہے۔مختصر یہ کہ دماغ ان اعصابی رابطوں کے وسیع سلسلے سے ہر حس وحرکت پر مطلع رہتا ہے۔وہ بدن کے تمام حالات کی نگرانی کرتا ہے،اس کے سارے طبیعی مصالح کی حفاظت کرتا اور اس پر حکمرانی کرتا ہے۔

اعصابی نظام بدن کی تیزی سے انجام پانے والی کارگزاریوں کو منظم کرتا ہے،مثلاً عضلات کا سکڑنا اور آنتوں کے افعال سے سریع تبدیلیوں کا متحقق ہونا۔حتیٰ کہ مختلف غدودوں سے قطرات کا مترشح ہونا اور ان میں ایک خاص میزان کا قائم رکھنا، یہ سب کچھ اعصابی نظام کی باقاعدگی کا نتیجہ ہوتا ہے۔یہ اعصابی نظام بدن کے افعال کی تنظیم کے لئے انجام دی جانے والی کاروائی میں جن پیچیدگیوں کا حامل ہے ان کے پیش نظر فقط آپ اپنی مثال ہے۔یہ ایک ایسا خودکار نظام ہے جو اس قابل ہے کہ قسم قسم کے حسی اعضاء سے ہزاروں تحریکات کی اطلاع دریافت کرے، پھرانہیں ایک دوسری سے ملاکر جائزہ لے،اوران کے لئے عکس العمل تجویز کرے اور اس کی انہیں اطلاع بھیجے تاکہ بدن اسے انجام دے۔

اعصابی نظام کے یہ اعمال متعدد ری فلکسوں کے وسیلے سے انجام پاتے ہیں،حسی اعضاء سے ایک تحریک اعصابی نظام کو جاتی ہے اور خاص قسم کے اعصاب کی راہوں کے مختلف حصوں میں ری فلکسی جوابات کے ابھرنے کا باعث بنتی ہے،پس اس طرح ہماری روزانہ کی فعالیتوں کو منظم کیا جاتا ہے۔[۲]

اعصابی نظام کے خلیوں کی قوت فعلی اوران کی مقاومت کی توانائی محدود ہے،جبکہ بیداری کی گھڑیوں میں ان پر دائمی اور مسلسل کام کا بوجھ آتا تو اس سے تھکاوٹ اور خستگی طاری ہوجاتی ہے۔اب اگر یہ تسلسل قائم رہے اور وہ کام جاری رکھیں تو وہ رفتہ رفتہ ان نظام کے ناکارہ اور خراب ہونے کا باعث بن جائے گا۔

لٰہذا ان خلیوں کی اس تھکاوٹ اور خستگی کو دور کرنے کا بہترین وسیلہ اورانہیں تروتازہ رکھنے کا عمدہ ترین موجب نیند کرنا اور سو جانا ہے۔کیونکہ نیند کے وقت دماغ کے تمام فعال مراکز اوران کو فعال بنانے والا پورا نظام کام کرنا چھوڑ دیتا ہے اور مکمل

---

[۱] فزیالوجی پزشکی ص ۱۰۴۵ ۔ ۸۱۸

[۲] فزیالوجی پزشکی ص ۱۰۴۵ ۔ ۸۱۸

آرام کرنے لگتا ہے۔

مراکز دماغ کی تعطیل

واضح ہو کہ نیند کی حالت میں اعصابی نظام کی تعطیل سے مراد تعطیل مطلق نہیں ہے، کیونکہ ہر طرف سے کام چھوڑ دینے کا مطلب تو موت ہے۔ پس نیند کی تعطیل سے مراد یہ ہے کہ حکمرانی کرنے والے مراکز کا ایک بہت بڑا حصہ اور اسے فعال بنانے والا اعصابی جال تعطیل کرتا ہے، جبکہ ان کا ایک تھوڑا سا حصہ نیند میں بیداری کی حالت سے کمتر کام جاری رکھے رہتا ہے۔

عالم خواب میں دل۔ گردہ اور جگر کی حرکات کا برقرار رہنا خود کار اعصاب کی فعالیت میں مصروف رہنے کی دلیل ہے۔ اسی طرح نیند میں ہاتھ۔ پاؤں اور بدن کا ادھر ادھر ہوتے رہنا اور پہلو بدلنا بھی ارادی اعصاب کی محدود حد تک فعالیت میں ہونے کی نشانیاں ہیں۔

مندرجہ بالا وضاحت سے معلوم ہوا کہ نیند کا معیار دماغ کے مراکز کی تعطیل اور اس کو فعال رکھنے والے اعصابی نظام کی تعطیل ہے۔ کبھی ایسا اتفاق بھی ہو جاتا ہے کہ آدمی ایک ہیبت ناک آواز یا سخت گرمی کی وجہ سے نیند سے بیدار ہو جاتا ہے۔ یا ایک وحشت ناک خواب دیکھنے پر ایک شخص ڈرتا ہے اور ہیجان میں آ کر نیند سے بیدار ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ آواز یا گرمی جیسا بیرونی سبب یا وحشت ناک خواب جیسا اندرنی سبب فعالیت بخشنے والے اعصابی جال کو فعالیت پر آمادہ کر دیتے ہیں اور اس سے نیند برطرف ہو جاتی ہے۔

نیند کے وقت اعصاب کا جالی دار عامل تقریباً کامل طور پر غیر فعال ہو جاتا ہے، ایسی صورت میں ہر قسم کی حسی تحریک کے لئے ممکن ہوتا ہے کہ وہ اس عامل کو فوری طور پر فعالیت پر آمادہ کر لے۔ مثلاً جلد سے درد کی حسی امپولسیون، آنکھوں کی بینائی تحریکیں اور کانوں کی سماعت کی تحریکیں کہ ان میں سے ہر ایک اعصاب کے جالی دار فعالیتی نظام کو بہت جلدی فعالیت پر آمادہ کرنے پر قدرت رکھتی ہے اور اسطرح سے ہر جاندار کو نیند سے بیدار کر سکتی ہے۔ بہت سی حسی تحریکیں دوسری تمام چیزوں کی نسبت بیدار کرنے میں زیادہ مئوثر ہیں اور ان میں سب سے زیادہ طاقتور کوئی درد ہے یا دوسری بدنی تحریکات ہیں۔

حسی تحریکات کے علاوہ دماغ کی سطح بھی فعالیت پیدا کرنے والے اعصابی جال کے نظام کو تحریک دینے پر قادر رہے اور اس فعالیت میں اضافہ کر سکتی ہے۔ سطح دماغ کے تقریباً تمام حصوں کے فعالیت پیدا کرنے والے جالی دار نظام سے بلاواسطہ رابطے قائم ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں دماغ کے ہر حصے کی اپنی شدید فعالیت بھی فعال کنندہ نظام کو فعالیت پر آمادہ کر سکتی ہے اور یہ قابلیت رکھتی ہے کہ شدید بیداری کے تمام درجات کے ساتھ ساتھ برقرار رہے۔ [1]

---

[1] فزیالوجی پزشکی ص ۱۰۴۷

بیدار رہنا اور بیدار ہونا

بیدار رہنے کا معیار بھی وہی ہے جو بیدار ہونے کا معیار ہے، یعنی جس طرح درد اور آواز جیسے بیرونی اسباب یا وحشت ناک اور ڈراؤنے خواب جیسے اندرونی اسباب فعال کنندہ نظام اعصاب کو تحریک دے کر ایک سوئے ہوئے آدمی کو بیدا کر سکتے ہیں۔ اسی طرح درد، گرمی یا تشویش ناک افکار اور پریشان تخیلات بھی اس فعال کنندہ نظام اعصاب کو تحریک پر بحال رکھ کر نیند سے مانع ہو سکتے ہیں۔

اونگھ اور نیند

تدریجی وقفہ

دماغی مراکز کا فعالیت تدریجی انداز میں رکنا اور فاصلہ دے کر متحقق ہونا اونگھ کا موجب بنتا ہے۔ اس امر کی بنیاد پر کہ بدن کے اطراف میں سے ہر ایک کی حکمرانی کا مرکز ایک مخصوص نقطے کے ساتھ مربوط ہوتا ہے۔ جب ایک معین طرف سے مربوط نقطہ وقفہ پیدا کر لیتا ہے تو وہی عضو سستی کی حالت میں چلا جاتا ہے اور اونگھ کا آغاز ہو جاتا ہے۔ ابتداء آنکھوں کی پلکیں گرتی ہیں، پھر گردنی کے پٹھے شل ہوتے ہیں اور اس سے سر اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ قوت ساعت کمزور ہونے لگتی ہے اور بالآخر بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ سارے بدن کے پٹھے اور اس کا ڈھانچہ اپنی حالت بدلنے لگتا ہے۔ پس جب یہ وقفہ اور سکون دماغ کے سارے مراکز عالیہ کو گرفت میں لے لیتا ہے تو مکمل نیند غالب آ جاتی ہے۔

پاولوف نے اپنی تحقیقات کے دوران اونگھ کے ظہور کی کیفیت کو دریافت کیا کہ یہ وقفہ کیونکر بتدریج ظاہر ہوتا ہے۔ پھر دماغ کی سطح پر پھیل جاتا ہے کہ جس کے نتیجے میں نیند پیدا ہو جاتی ہے۔ اس نے اپنی دریافت کو ۱۹۳۵ء کو اپنی اس تقریر میں بیان کیا تھا جو اس نے اعصابی امراض کے متخصصین اور نفسیات کے ماہرین کی ایک کانفرنس میں نیند کے موضوع پر کی تھی۔ اس نے زیر تجربہ ایک کتے کے دماغ پر اس وقفہ دار نیند یعنی اونگھ کے دماغ کی سطح پر پھیل جانے والے عمل کو ابتداء سے لے کر گہری نیند بن جانے کے آخری مرحلے تک سب امور کو تشریح سے بیان کیا تھا۔

اس کی ترتیب کچھ اس طرح تھی کہ ابتدائے تجربہ میں یہ وقفہ فقط دماغ کی سطح تک ہوتا ہے یعنی ان مقامات تک جو زبان کی حرکات کو منظم کرتے ہیں ان تک پھیلتا ہے۔ اس کے بعد یہ وقفہ آگے بڑھ کر منہ اور جبڑوں کی حرکات پر حکومت کرنے والے مراکز کو جا لیتا ہے، اس مرحلے میں کتا اس بات پر قادر نہیں رہتا کہ کچھ کھا سکے۔ (اس مرحلے میں اگر کوئی چیز اس کے منہ میں رکھیں تو وہ بے اختیار باہر گر پڑتی ہے) اس کے بعد یہ وقفہ گردن کے عضلات (پٹھوں) کی حرکات کو قابو کرنے والے مراکز تک سرایت کرتا ہے۔ (پس اب کتا پورے بدن کو پھیرے بغیر غذا کی طرف نہیں مڑ سکتا) اس وقت اس کے تمام عضلات سست پڑ جاتے ہیں اور کتا نیند میں چلا جاتا ہے اور اپنی رسی کے ساتھ آویزاں ہو جاتا ہے۔[1]

غیر طبعی نوزاد

امام علی علیہ السلام نے ایک ایسے مولود کی میراث کا حصہ معین کرنے کے لئے کہ جس کی ایک کمر سے اوپر دو بدن اور دو سر

[1] نظریات پاولوف ص ۷۱

تھے۔آپ نے اس ضمن میں نینداور بیداری جیسے دو طبیعی امور سے ایک بہت بڑا علمی استفادہ فرمایا اور اپنے فیصلے کی بنیاد ان دو حالتوں کی اساس پر استوار فرمائی۔

ان امرأة ولدن علی فراش زوجها ولداله بدنان ور أسان علی حقو واحد فالتبس الأ مر علی أهله أهو واحد اوا ثنان فصار الی امیر المومنین علیه السلام یسئلو نه عن ذالك لیعرفوا الحکم فیه فقال۔ امیر المومنین علیه السلام اعتبروه اذانام ثم أنبهوا أحد البدنین والرأسین فان انتبها جمیعا فی حالة واحده فهما انسان واحده وان استیقظ أحد البذنین والرأسین فان انتبها جمیعا فی حالة واحدة فهما انسان واحد وان استقیظ أحد هماداه خرنائم فهما أثنان وحقهما من المیراث حق اثنین۔[1]

ایک عورت نے اپنے قانونی شوہر سے ایک فرزند جنا کہ جسکی ایک کمر کے اوپر دو بدن اور دو سر تھے۔اس مولود کے خاندان والے پریشانی سے دوچار ہوئے اور یہ فیصلہ کرنے سے عاجز رہے کہ یہ نوزاد ایک فرد ہے یا دو فرد ہیں؟ چنانچہ یہ لوگ حضرات میرالمومنین امام علی بن ابی طالب علیہ السلام کے حضور میں آئے، تا کہ آپ سے اس بارے میں حکم الٰہی دریافت کریں۔ حضرت نے فرمایا اس بچے کو نیند کے موقع پر آزماؤ کہ جب دونوں سوئے ہوئے ہوں۔تب ان دوسروں یا ان دو بدنوں میں سے ایک کو حرکت دے کر جگاؤ۔اگر دونوں بیک وقت بیدار ہو جائیں تو یہ دونوں ایک انسان ہیں اور اگر ایک بیدار ہو اور دوسرا سویا رہے تو پھر یہ دو فرد اور دو انسان ہیں،لہٰذا دو افراد کی میراث پائیں گے۔

''کیمیاوی نظریئے میں وضاحت سے بیان کیا گیا تھا کہ روس اور انگلستان میں دو ایسے بچوں کو زیر آزمائش رکھا گیا جو دونوں باہم جڑے ہوئے تھے، ماہرین متعدد تجربات کے بعد اس نتیجے تک پہنچے کہ ان دنوں باہم جڑے بچوں کا نظام گردش خون مشترک لیکن ان کا اعصابی نظام جداگانہ تھا۔ان کے اشتراک خون کا ثبوت اس طرح حاصل ہوا تھا کہ ان کے خون کی ترکیب واحد تھی۔ان دو میں سے ایک کے خون میں جو مادہ داخل کیا جاتا وہ دوسرے کے خون میں تاثیر کرتا اور اس میں پایا جاتا تھا''۔

لیکن ان کے اعصابی نظام کا جدا جدا ہونا اس طرح معلوم ہوا کہ ان میں سے ہر ایک کی بدنی ساخت اور حساسیت مستقل اور جنبش و تحریک کا عکس العمل بھی جداگانہ تھا۔کئی مرتبہ ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ ان دونوں میں سے ایک بچہ سویا ہوتا تھا تو دوسرا مکمل طور پر بیدار ہوتا اور اس کی آنکھیں کھلی ہوئی ہوتی تھیں۔[2]

---

[1] الارشاد شیخ مفید ص ۱۰۲

[2] خوابیدن و خواب کردن ص ۲۵

نینداوراعصابی نظام

اگران دونوں بچوں میں ایک کا اعصابی نظام کام کررہا ہوتا توضروری تھا کہ دماغ اوراعصاب کے عمل سے مربوط تمام امور دونوں میں یکساں ہوتے۔ اگران میں سے کسی ایک کے بازو کو دکھ دینے والے انداز میں دباؤ تو اگراس کو دردوالم کا احساس ہوتو دوسرے کو بھی اس طرح احساس الم ہونا چاہئے تھا، دونوں کو بیک وقت سونا اور پھر بیک وقت ہی بیدار ہونا چاہئے تھا۔ اگران میں سے ایک نیند میں اور دوسرا بیدا ہوتو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہرایک کا اعصابی نظام علیحدہ، ہرایک کی فعالیت مستقل اوراس کے اپنے لئے مخصوص ہے۔

وہ سوال جو امام علی علیہ السلام سے پوچھا گیا، وہ یہ تھا کہ یہ جو کمر کے اوپر دو بدن اور علیحدہ علیحدہ ہیں (نیچے سے بدن ایک ہے اوراوپر سے دو) آیا یہ ایک نفر ہے یا دونفر ہیں؟ لہٰذا میراث میں سے ایک فرد کا حصہ پائیں یا دوافراد کا۔؟

اس امر کی تشخیص ان دونوں کے فطری احساس وادراک کی کیفیت سے مربوط ہے کہ یہ جو بدن اور دوسر والے ہیں آیا یہ دونوں اپنے اس مجموعی بدن سے ایک فرد ہونے کا احساس کرتے اور خود کو ایک فرد سمجھتے ہیں۔؟ یعنی دونوں ایک فکر اور ایک شخصیت کے مالک ہیں یا یہ کہ ہرایک خود کو دوسرے کا غیر سمجھتا ہے؟ کیا ہرایک کے اندر اپنی فردیت کا احساس دوسرے سے جداگانہ طور پر موجود ہے یانہیں؟ مختصر یہ کہ آیا ان دو میں سے ہرایک اپنے وجدانی ادارک کے ساتھ سمجھتا ہے کہ میں وہ نہیں اور وہ میں نہیں، یعنی میں خود میں ہوں اور وہ خود وہ ہے۔

البتہ صورت حال یہ تھی کہ یہ سوال اس وقت کیا گیا کہ جب وہ بچے اپنی عقل اور احساس کی توانائیوں کو اس قدر پرورش نہ دے سکے تھے کہ بول سکیں۔ لہٰذا اس وقت اس معاملے کی تشخیص کے لئے بہترین علمی اور اساسی راستہ وہی تھا جو امام علی علیہ السلام نے اختیار فرمایا۔ آپ نے ان کے ایک یا دو ہونے کی تعیین کا معیار نینداور بیداری پر قائم فرمایا کہ دونوں طبیعی حالتیں ہیں (اس مسئلے کے حل کی صلاحیت ان میں موجود ہے)۔

ایک انسان یادوانسان

اب اگرایک کو بیدار کرنے سے دوسرا بھی بیدار ہوجاتا ہے تو وہ دونوں ایک انسان ہیں اور وراثت میں ایک فرد کے حصے کے مالک ہیں۔ یعنی ان دونوں کا اعصابی نظام ایک ہے اور ایک مرکز حکمرانی دونوں کے بدن میں کام کرتا ہے۔ اگرایک کو بیدار کرنے سے وہی بیدا ہوتا ہے اور دوسرا سویا رہتا ہے تو وہ دوانسان ہیں لہٰذا دوحصوں کے حقدار ہیں یعنی دونوں میں سے ہرایک کا اعصابی نظام جدا ہے اور اس کے اپنے ساتھ مختص ہے اور ہرایک کے بدن میں کام کرنے والا حکمران مرکز بھی علیحدہ ہے۔

جیسا کہ ہم نے بیان کردیا کہ نیند یعنی دماغ کے مراکز عالیہ کے وقفہ کرنے، سکون پانے اور فعالیت کو چھوڑ دینے کی یہ حالت

اچانک وجود میں نہیں آتی، بلکہ مرحلہ بہ مرحلہ اور رفتہ رفتہ آگے بڑھتی ہے۔اس کے آغاز میں ایک سستی کی کیفیت اور اونگھ کی سی حالت پیدا ہوتی ہے اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مراکز دماغ میں بعض مراکز میں وقفہ پیدا ہوتا ہے۔ پھر بہ تدریج دیگر حصوں کی طرف سرایت کرنے لگتا ہے اور جب یہ وقفہ یہ آرام اور یہ عدم فعالیت مزید پھیلتی ہوئی تمام مراکز فرماندہی پر غلبہ حاصل کر لیتی ہے تو مکمل نیند طاری ہوجاتی ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس شخص کو ہپناٹزم کے ذریعے گہری نیند سلا دیا جاتا ہے اور وہ اپنی طبیعی نیند کی مثل اپنے آپ سے آگاہ اور بے خبر ہوجاتا ہے تو پھر کیوں عامل کے سوالات کو صحیح طور پر سن لیتا ہے اور کیسے ان کے صحیح جواب دیتا ہے؟ اس کے ادراک کا مرکز۔حافظے کا شعبہ۔ سننے کے آلات اور بولنے کے آلات کیوں بیدار اور فعال رہتے ہیں۔؟ یعنی یہ حالت توقف اور آرام و استراحت کی یہ کیفیت دیگر تمام حصوں کی طرف پیش رفت کیوں نہیں کرتی اور تمام مراکز تک اس کا پھیلاؤ کیوں نہیں پہنچتا؟۔

نیند کے درجات

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ضروری ہے کہ ایک نکتے کی طرف ضروری توجہ ہو اور وہ ہے کہ نینداور بیداری دونوں فزیالوجی کی نظر میں مختلف درجات اور مراتب کے مالک ہوتے ہیں۔ یہ اختلاف نینداور بیداری کے عوامل کے ایک دوسرے پر تاثیر و تاثر کے تفاوت کا نتیجہ ہوتا ہے۔

یہ سوال کہ کوئی شخص نینداور بیداری میں کس طرح مختلف درجات کا حامل ہوسکتا ہے؟ اس کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ نینداور بیداری کی دونوں طرفوں کا مدار ان متوازی رابطوں پر قائم ہے جو کئی ملین کی تعداد پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر یہ دوطرفہ نظام ان رابطوں میں سے چند محدود تعداد کے رابطوں پر اثر کرے تو اس شخص کی بیداری کا عرصہ ختم ہوجائے گا۔لیکن اگر یہ کیفیت ان راہوں اور رابطوں میں سے بہت زیادہ تعداد میں باہم یک وقت ہوکر برقرار رہے تو اس شخص کا بیداری سے بہرہ مند ہونے کا عرصہ بہت زیادہ ہوجائے گا۔[1]

ہپناٹزم والی نیند کے سوال کا جواب یہ ہے کہ دماغ کے نیند سے مغلوب ہونے اور بے خبر ہوجانے والے مراکز ان مراکز سے جدا ہیں جو نیند سے مغلوب نہیں ہوئے اور ابھی تک باخبر و آگاہ ہیں۔ بالفاظ دیگر وقفہ وسکون دماغ کے چند ایک حصوں تک تو پھیل چکا ہوتا ہے لیکن چند دوسرے حصوں تک یہ اثر نہ پہنچنے سے وہ مراکز دماغ ہوشیار رہتے ہیں۔ایسی کیفیت کبھی کبھی طبیعی نیند میں بھی دیکھی جاتی ہے اور بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو نیند کے عالم میں باتیں کرتے ہیں اور کئی ایک سوتے ہی اٹھ کر چلنے بھی لگتے ہیں۔

''پاولوف کے نظریات کے مطابق ہپناٹزم ایک ناقص نیند ہوتی ہے جو جزوی بیداری کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔ وہ چند علمی حقائق اور عملی تجربات کے مطابق یہ کہتا ہے کہ بارہا طبیعی نیند کی حالت میں یہ بات دیکھنے میں آئی ہے کہ وقفہ ابتداء دماغ کے نیم دائرہ

---

[1] فزیالوجی پزشکی ص ۱۰۴۹

والے حصے میں ظاہر ہوتا ہے اور نیند کا آغاز کردیتا ہے۔لیکن در عین حل کچھ نقاط جنہیں میں محافظ اور نگہبان یا کام پر برقرار نقاط کا نام دیتا ہوں، ان میں ابھی تک فعالیت باقی ہوتی ہے اور وہ اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں''۔

''مثال کے طور پر دیہاتی پن چکی والے کو دیکھئے جو سوجاتا ہے لیکن جونہی اس کی چکی بند ہوتی اور اس کی آواز منقطع ہو جاتی ہے تو وہ فوراً بیدار ہوجاتا ہے۔ یا ایک ماں اپنے بچے کو معمولی سی صدا بلند ہونے پر نیند سے بیدار ہوکر اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور اسے کوئی بے چینی اور اضطراب بھی لاحق نہیں ہوتا۔ یہ سب کچھ انہیں محافظ و نگران نقاط کی وجہ سے ہوتا ہے جو ہر حال میں آمادہ اور فعال ہوتے ہیں۔

اسی سے مشابہ کیفیت ہپناٹزم میں پیش آتی ہے، البتہ اس اختلاف کے ساتھ کہ اس میں وہ نگران نقاط اور فعال مراکز یعنی دماغ کا ہوشیار حصہ ہپناٹزم کرنے والے اور زیر عمل فرد کے درمیان رابطہ برقرار کرتا ہے۔ان کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ تابع (زیر ہپناٹزم) اس وقت باوجودیکہ ایک طبیعی نیند سوئے ہوئے شخص کے مانند سویا ہوتا ہے اور بیرونی تحریکات اور اپنے بیرونی ماحول کے احساس سے غافل ہوتا ہے، تاہم ہپناٹزم کرنے والے عامل کی باتوں کو سنتا اور ان کا جواب بھی دیتا ہے''

طبیعی نیند اور ہپناٹزم کے باہم مشابہ ہونے کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ یہ دونوں حالتیں ایک دوسری میں تبدیل بھی ہو جاتی ہیں۔کبھی کبھی ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ ہپناٹزم کرنے والے اپنے تابع شخص کو بیدار نہیں کر سکتے، کیونکہ اس وقت ہپناٹزم کا مرحلہ طبیعی نیند تک پہنچ جاتا ہے۔

پاولوف کا نظریہ ہے کہ دماغ پر وقفہ کا ظہور دراصل مختلف درجات کا حامل ہوتا ہے کہ یہ درجات مرحلہ بیداری سے نیند و بیداری کے درمیانی مرحلے اور پھر گہری نیند کے مرحلے کی طرف جانا ہے۔ یہ درجات وقفے اور حالت سکون کے پھیلاؤ کی تدریج کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں جو اس نے متعدد تجربات کے ساتھ ثابت بھی کئے ہیں۔ [۱]

ایک اور سوال جو اس بحث میں اٹھ سکتا ہے وہ یہ ہے کہ طبیعی نیند اور مرگی کے دورے کے درمیان کیا فرق ہے؟ اسی طرح یہ سوال کہ نیند اور بے ہوشی (جو کمزوری یا دیگر ایسے اسباب سے طاری ہوجاتی ہے) میں کیا فرق ہے؟

ہمیں معلوم ہے کہ طبیعی نیند کو بے ہوشی کے ساتھ اس لحاظ سے مشابہت ہے کہ ان دونوں میں دماغ کے مراکز عالیہ اور جالی دار فعال کنندہ نظام کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں اور آدمی پر نا آگاہی اور بے خبری کی حالت طاری ہوجاتی ہے۔ وہ بیرونی تاثیرات کا ادراک نہیں کرتا اور اختیاری اور ارادی فعالیت میں تعطیل ہوجاتی ہے، لیکن طبیعی نیند اور بے ہوشی والے عارضے کے درمیان فرق ان دونوں حالتوں کی پیدائش کے اسباب سے واضح ہوسکتا ہے۔

نیند سو فیصد طبیعی حالت ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے حکیمانہ فیصلوں کے مطابق تمام افراد بشر کے لئے مقرر فرمایا ہے۔اس کے آنے کی وجہ اعصابی خلیوں پر خستگی اور تھکاوٹ کا طاری ہونا ہے جو انہیں بیداری کے اوقات میں مسلسل کام کرنے کی وجہ سے لاحق

---

[۱] نظریات پاولوف ص ۷۹

ہوجاتی ہے پس جب ایک آدمی بہت دیر تک سو لیتا ہے تو اس کی خستگی اور فرسودگی دور ہوجاتی ہے اور وہ خود بخود بیدار ہوجاتا ہے۔ اس اعصابی نظام نئی توانائی اور تازگی کے ساتھ اپنی عادی اور طبیعی مصروفیات کو از سر نو انجام دینے کے قابل ہوجاتا ہے۔

جب جالی دار فعال کنندہ نظام کچھ دیر تک استراحت کر لیتا ہے تو نیند اور بیداری دوطرفوں میں شریک اعصاب بتدریج اپنی تحرک قبول کرنے والی عام کیفیت دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ ان کے دوطرفہ حرکات ایک طرف وارد عمل ہو جاتے ہیں اور سویا ہوا شخص مرحلہ نیند سے نکل کر بیداری کے مرحلے میں واپس آجاتا ہے۔[1]

سکتہ قلبی۔ غشی۔ بے حسی اور بے ہوشی وغیرہ جیسے حالات دراصل دماغ کی فعالیت میں اختلال کا نتیجہ ہوتے ہیں غشی کا سبب ناگہانی طور پر دماغ سے خون کا سختی کے ساتھ واپس پلٹنا ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر دماغ میں اچانک خون کی سخت کمی کا لاحق ہو جانا اور کسی سخت صدمے سے متاثر ہو کر بے حسی کا لاحق ہوجانا بھی اعمال بدنی میں عمومی خلل، گردش خون میں بدنظمی، نظام تنفس میں خرابی اور بلڈ پریشر (خون کے دباؤ) میں کمی وغیرہ جیسے اسباب کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اکثر اوقات دماغ کے زہر آلود اور مسموم ہونے کی وجہ سے بھی بے ہوشی کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔

اپنے وقت پر نیند کا آنا دماغ کی عادی۔ طبیعی اور صحت مندانہ حالت ہے۔ نیند جس قدر بھی گہری کیوں نہ ہو عام طور پر لوگ اس سے خود بخود بیدار ہوجاتے ہیں اور کسی کے جگانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن جو شخص سکتہ قلبی یا صدمات سے متاثر یا بے ہوشی کا شکار ہوا ہو، اسے ان مخصوص ادویہ کے ذریعے ہوش میں لایا جاتا ہے جو ان بیماریوں کو دور کرتی ہیں۔[2]

غشی اور نیند کے اسلامی احکام

سابقہ بیانات سے واضح ہوا کہ نیند اور بے ہوشی بعض وجوہ سے باہم مشابہ ہیں اور بعض وجوہ میں متفاوت ہیں۔ یہ شباہت اور یہ فرق فرائض عبادت پر بھی اثر انداز ہوتا ہے، اس لئے یہ اسلام کے پیشواؤں کی توجہ کا مورد بھی قرار پایا ہے۔

کوئی شخص واجب نماز کے پورے وقت میں نیند میں رہے، مثلاً طلوع فجر سے طلوع آفتاب تک مسلسل سویا رہے کہ اس کی نیند نہ اکھڑے اور اس کی نماز فوت ہوجائے یا کوئی شخص کسی بیماری میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اغماء و بے ہوشی کا شکار ہو جائے اور پورا وقت نماز اسی حالت میں گزر جائے اور نماز صبح نہ پڑھ سکے۔ یہ دونوں قسم کے افراد چونکہ اپنے آپ سے بے خبر اور ناآگاہ تھے، اس لئے نماز پڑھنے پر مرتکب گناہ نہیں اور دونوں ایک جیسے ہیں۔ لیکن یہ دونوں اس لحاظ سے فرق بھی رکھتے ہیں کہ نیند ایک طبیعی حالت ہے اور غشی و بے ہوشی ایک غیر طبیعی عارضہ ہے، اس لئے جس صحیح وتندرست انسان نے اپنا وقت نماز نیند میں گزار دیا، اس کے لئے واجب ہے کہ وہ اس نماز کی قضا بجالائے۔ لیکن جس شخص کی نماز اس کی بے ہوشی کی وجہ سے فوت ہوئی ہے،

---

[1] فزیالوجی پزشکی ص ۱۰۴۹

[2] خوابیدن وخواب کردن ص ۱۳

روایات اور فقہاء کے فتاویٰ کے رو سے اس پر اس فوت شدہ نماز کی قضا واجب نہیں ہے۔

عن الرضا علیہ السلام فی حدیث قال: وکلما غلب اللہ علیہ المغمی الذی یغمی علیہ فی یوم ولیلۃ فلا یجب علیہ قضاء الصلاۃ [۱]

حضرت امام علی رضا علیہ السلام نے فرمایا: ہر ایسی حالت جو کسی آدمی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے غالب آئی ہو، جیسے کوئی شخص دن رات بے ہوش رہتا ہے تو اس پر نماز واجب کی قضا نہیں ہے۔

عن أبی عبداللہ علیہ السلام قال: سمعتہ یقول فی المغمی علیہ قال ما غلب اللہ علیہ فاللہ اولی بالعذر [۲]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے بے ہوش شخص کے بارے فرمایا:۔ وہ چیز جو خداوند تعالیٰ کی طرف سے کسی فرد پر مسلط ہو جائے اس کا عذر قبول کرنے کے لئے خداوند تعالیٰ کی ہستی سب سے زیادہ حق دار ہے۔

نینداور تھکاوٹ کی دوری

نیند کے بارے میں دور ماضی کے فلاسفہ اور دور حاضر کے سائنسی ماہرین ہر دو کے نظریات کا مطالعہ کرنے سے ایک قدر مشترک ہمارے ہاتھ آتی ہے۔ وہ یہ کہ حیوان اور انسان طبیعی مادوں کی ترکیب سے وجود میں آئے اور محدود توانائیوں کے مالک ہیں۔ وہ اوقات بیداری کی مسلسل محنت اور تگ و دو کی وجہ سے تھک جاتے ہیں۔ اس لئے مجبور ہیں کہ کچھ دیر کے لئے سوئیں۔ تاکہ اس کے ذریعے اپنی تھکاوٹ دور کریں اور نئی توانائی حاصل کریں کہ جس سے دوبارہ اپنی مصروفیات کا آغاز کر سکیں اور اپنی زندگی کی سرگرمیوں کا تسلسل قائم رکھ سکیں۔

ایک تھکا ماندہ شخص اپنی خستگی سے قطع نظر کچھ مزید خصوصیات کا حامل بھی ہوتا ہے۔ ایک تھکے ماندے شخص کا اعصابی نظام غیر متوازن ذہن میں کشمکش کی کیفیت اور وہ رنج والم کے دباؤ میں ہوتا ہے۔ اس عدم توزان کا سب سے زیادہ اثر دماغ کے پیندے میں کام کرنے والے مراکز پر ہوتا ہے اور ان میں سے بھی سب سے زیادہ اثر ''ہیپو ٹالاموس'' میں مرتب ہوتا ہے۔ چنانچہ اس سے دماغی اعصابی طبیعی نظام میں ایک عمیق اختلاف پیدا ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں فکر۔ شعور اور نگرانی کا نظام متاثر ہو جاتا ہے۔ ایک تھکا ہوا شخص گویا ایک مسموم فرد ہے کہ اس کا خون اور اس کے خلیے مجموعی طور پر ایسے ہیں جو بیکار اور ناکارہ ہو چکے ہیں اور وہ پیشاب پسینہ اور سانس کے راستے سے ان کو نکال دیتا ہے۔ لیکن یہ سارا عدم توازن صرف تھکاوٹ کی مسمومیت سے ہی نہیں، بلکہ اس کی ایک وجہ ان محافظ تنظیمی اعصاب کا غیر متوازن ہو کر کام سے دستبردار ہو جانا ہے۔ وہ اپنی نارسائی اور طبیعی کیفیت کی بحالی کے لئے کام سے بچنا

---

[۱] وسائل الشیعہ ج ۲ ص ۲۷۳

[۲] وسائل الشیعہ ج ۲ ص ۲۷۳

چاہتے ہیں اور جسمانی خلل میں اضافہ کر رہے ہوتے ہیں۔

یہ نکتہ بھی فراموشی کے قابل نہیں کہ ایسا شخص اگرچہ بظاہر ایک بدحال بیمار اور کبھی ایک اعصابی اور نفسیاتی مریض کی طرح دکھائی دیتا ہے، لیکن درحقیقت وہ بیمار نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کی ساری کمزوریاں جلد یا بدیر سونے اور مکمل اسراحت کرنے کے بعد خود بخود زائل ہو جاتی ہیں کیونکہ وہ شخص استراحت کر لینے کے بعد دوبارہ ایک کامل طبیعی انسان بن جاتا ہے۔[1]

مادی عوارض سے منزہ ہستی

آیت الکرسی ''الہ واقعی'' اور حقیقی معبود کی شناخت کرواتے ہوئے اعلان کرتی ہے کہ اونگھ اور نیند خداوند ''حی و قیوم'' پر غالب نہیں آسکتی اور سستی و ناآگاہی بھی اس ہستی پر مسلط نہیں ہو سکتی۔ گویا یہ آیت اس طریقے سے بالواسطہ لوگوں کو یہ بات سمجھانا چاہتی ہے کہ نیند کی ضرورت ان زندہ موجودات کو ہوتی ہے جن کا وجود طبیعی مادوں اور معدنی عناصر سے مرکب ہوتا ہے اور ان کی حیات مادے کے ساتھ قائم ہوتی ہے۔ لیکن ذات خداوند تعالیٰ مادہ سے منزہ ہے، اس کی حیات عین ذات اور مادی نقائص سے مبریٰ ہے، اس لئے اس کو اونگھ اور نیند کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ پروردگار عالم کو نہ تھکاوٹ ہوتی ہے اور نہ ہی خستگی و فرسودگی اس پر طاری ہو سکتی ہے۔ وہ کمزور و ناتواں نہیں ہوتا کہ نیند کے ذریعے بجدید قویٰ کرے اور صرف شدہ اجزائے بدن کا بدل حاصل کرے۔

ایک سوال کیا جا سکتا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے آیت الکرسی میں ''سنۃ'' کو ''نوم'' سے مقدم کیوں کیا ہے؟ حالانکہ بلاغت کلام کے اصولوں کے پیش نظر اس کے برعکس آنا چاہئے تھا۔ کیونکہ جب گفتگو مقام اثبات میں ہو تو وہاں ضعیف سے قوی کی طرف ترقی کی جاتی ہے، ہاں اگر گفتگو مقام نفی میں کی جا رہی ہو تو قوی سے ضعیف کی طرف توجہ دی جاتی ہے، مثلاً ہم کسی تیراک کی مہارت کے اثبات کے مقام پر محو گفتگو ہوں تو کہیں گے کہ وہ بلاتوقف ایک کیلومیٹر بلکہ دو کیلومیٹر تک تیرا کی کرنے پر بھی قادر ہے لیکن اگر مقام نفی میں ہوں تو یوں کہیں گے کہ وہ تو بلاتکلف ایک کیلومیٹر تک بلکہ نصف کیلومیٹر تک بھی تیر نہیں سکتا۔ اس سوال کا پہلا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ طبیعی نظام کے متعلق ہم وضاحت کر چکے ہیں کہ اس میں اونگھ نیند سے پہلے آتی ہے اور آیت الکرسی میں کلام الٰہی کا نظم کتاب تکوین کے مطابق ہے۔ اس لئے پہلے اونگھ کی نفی کی ہے جو ابتدائی حالت میں طاری ہوتی ہے اور اس کے بعد نیند کی نفی کی ہے جو ثانوی عارضے کے طور پر لاحق ہوتی ہے۔

دوسرا جواب یہ پیش کا جا سکتا ہے کہ اونگھ اور نیند ہر دو عادی عوارض میں سے نہیں، بلکہ ایسی دو حالتیں ہیں جو بالجبر و بالقہر حیوان اور انسان پر مسلط ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے آیت الکرسی میں ''اخذ'' کے الفاظ کو استعمال کیا گیا اور فرمایا **(لا تأخذہ سنة ولا نوم)**۔ یعنی خداوند تعالیٰ کو اونگھ اور نیند نہیں پکڑتی اور یہ دونوں حالتیں اس ذات حق پر غالب نہیں آتی ہیں۔

جب اس تسلط اور غلبہ والے معنی کی طرف نظر ملتفت ہو تو پھر ضعیف سے قوی کی طرف ترقی کرنا بہتر ہے اور اس کے برعکس

---

[1] چہ میدانم؟ چگونہ بر خستگی غلبہ کنیم ص ۴۳

بلاغت کے خلاف ہوگا مثلاً ہم یوں کہیں کہ فلاح شخص فوجی استحکامات وانتظامات کے لحاظ سے اس قدر قوی ہے کہ اسے ایک بٹالین فوج فتح نہیں کرسکتی ہے۔اور نہ ہی ایک بریگیڈ فتح کرسکتا ہے یا یہ کہیں کہ ہرن اس قدر تیز دوڑتا ہے کہ نہ تو اسے بھاگ کر پکڑا جاسکتا ہے اور نہ سائیکل پرسوار ہوکر پکڑا جاسکتا ہے۔

آیت الکرسی لوگوں کہ یہ سمجھا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ حیات وقیومت، رفعت وکمال کے اعلیٰ ترین درجہ پر فائز ہے کہ نہ تو اس پر اونگھ غلبہ کرسکتی ہے اور نہ اسے قومیت سے باز رکھ سکتی ہے۔ نہ نینداس پر مسلط ہوسکتی ہے جو اونگھ سے زیادہ قوی تر ہوتی ہے اور نہ ہی اسے قومیت سے مانع ہوسکتی ہے۔ بلکہ وہ ہمیشہ ہر جگہ اور ہر موقع پر بذات خود قائم ہے اور سارا جہان اس کی ذات کے ساتھ قائم اور موجود ہے۔

پانچویں تقریر

کائنات کا مالک حقیقی

کتاب خدا میں ارشاد خداوندی ہے:

لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ [1]

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب خداوند تعالیٰ کا ملک حقیقی ہے۔

اس جملے سے آیت الکرسی انسانوں کی فکر کو بلندی کی طرف لے جا رہی ہے اور انہیں سمجھا رہی ہے کہ ہمارا معبود حقیقی فقط اس مجموعہ کائنات کی ہی ''قیوم'' اور بر پا کرنے والا نہیں بلکہ سارے آسمان، زمین اور ان کے اندر کے تمام موجودات اور تمام مخلوقات اسی کی حقیقی ملکیت ہیں اور وہی اس جہان ہستی کا بالاستحقاق مالک ہے۔

آیت الکرسی اس جملے میں یہ مطلب واضح کرنا چاہتی ہے کہ اسے راستہ گم کرنے والو اور اسے شرک کی وادی میں بھٹکنے والے لوگو! سن لو کہ تمہارا حقیقی مالک اور تمہارے معبود کہ جنہیں تم عبادت کے لئے منتخب کئے بیٹھے ہو، ان کا مالک بھی وہی خداوند خالق ہے۔ یہ کس قدر نادانی اور جہالت کی بات ہے کہ ایک مملوک دوسرے مملوک کی پوجا کرے، ایک مخلوق دوسری مخلوق کی پرستش کرے اور اس کے سامنے ذلیل وخوار ہو کر جھکنے لگے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ [2]

اللہ تعالیٰ کے علاوہ جس کسی کو (یا جس چیز کو) تم اپنا خدا سمجھ کر پکارتے ہو (اور اس کی پروستش کرتے ہو) وہ تمہاری طرح بندے (اور اس کی مخلوق) ہیں پس اے وہ انسانو جو قسم قسم کے معبود بنائے ہوئے ہو اور اپنے حقیقی خدا کے ساتھ عبادت میں انہیں شریک قرار دیتے ہو۔ ذرا ہوش میں آؤ، اپنی عقلی طاقت سے کام لو اور ایک گھڑی بھر سوچو کہ شاید اپنی ان قبیح کرتوتوں کو سمجھ لو، اپنی عقل کے ہتھیار سے غلامی وبندگی کی زنجیروں کو توڑ ڈالو اور اپنے آپ کو ان نقلی اور خودساختہ معبودوں کی قید سے آزاد کرلو۔

پرستش کے لائق معبود

آیت الکرسی ''لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ'' والے جملے کے ذریعے انسانوں کو آگاہ کر رہی ہے کہ اسلام کے مقدس آئین کے مطابق بندگی اور پرستش فقط اس کائنات کو پیدا کرنے والے خداوند قدوس کے لئے ہے اور وہی تمام افراد

---

[1] سورۂ بقرہ آیت ۲۵۵

[2] سورۂ اعراف آیت ۱۹۴

اور تمام اشیاء کا حقیقی مالک ہے۔

قرآن مجید نے اپنی متعدد آیات میں اللہ تعالیٰ کو مالک کائنات بتایا اور آسمانوں اور زمین کے اندر پائی جانے والی تمام اشیاء کو اس پروردگار عالم کی ملکیت قرار دیا ہے۔ خداوند تعالیٰ کی مالکیت پر ایمان فکر انسانی کو درست رکھنے میں گہرا اثر ڈالتا ہے اور کائنات کے متعلق نظریہ قائم کرنے میں انسان کے طرز تفکر میں ایک انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ مومن اس جہان کو لوگوں کے سامنے ایک نئی نظر سے پیش کرتا ہے اور یہ ایمان بشر کو خودسری۔ سرکشی اور بے راہ روی سے نجات عطا کرتا ہے۔ اس طرح ہر جانب سے حاصل ہونے والا تکامل انسانوں کو ایک صحیح اور سعادت بخش راستے کی سمت لے جاتا ہے۔ اس مطلب کو واضح کرنے کے لئے ضروری ہوگا کہ اس بارے میں کچھ مزید گفتگو کی جائے۔

حکومت الٰہی

قرآن شریف میں دو قسم کی آیات موجود ہیں:۔

ایک قسم کی آیات میں آسمان وزمین میں جو کچھ موجود ہے اس کا مالک اللہ تعالیٰ کو بتایا گیا ہے۔

گزشتہ تشریحات سے واضح ہو چکا ہے کہ آیت الکرسی میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور اس کی حکیمانہ تدبیر کا بیان صفت ''قیوم'' کے ذریعے کیا گیا ہے جبکہ دیگر بیشتر آیات میں اللہ تعالیٰ کی حکومت وقیومیت کو کلمہ ''ملک'' کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٨٩﴾ [1]

اور آسمانوں اور زمین کی فرماں روائی اللہ تعالیٰ سے مختص ہے اور وہی ہر شئی پر قادر ہے۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٧﴾ [2]

آسمانوں۔ زمین اور ان کے مابین جو کچھ ہے ان سب کو حکومت اللہ تعالیٰ سے مختص ہے۔ وہ جو چاہتا پیدا کرتا ہے اور وہ ہر شئی پر قادر وتوانا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۭ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿١١٦﴾ [3]

آسمانوں اور زمین کے امور کا مدبر وحکمران فقط اللہ تعالیٰ ہے، وہی زندگی بخشتا ہے۔ وہی موت دیتا ہے۔ اور تمہارا مختار و

---

[1] سورۂ آل عمران آیت ۱۸۹

[2] سورۂ مائدہ آیت ۱۷

[3] سورۂ توبہ آیت ۱۱۶

مددگار اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں۔

الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا ﴿۲﴾ [۱]

وہ خدا تعالیٰ جس کے واجب الاطاعت فرمان نے آسمانوں اور زمین کو برقرار رکھا ہوا ہے۔ اور وہ کہ جس نے اپنا کوئی فرزند نہیں بنایا۔ اور جس کی حکومت میں کوئی اس کا شریک نہیں اور جس نے تمام موجودات کو خلق فرمایا ہے اور ان میں سے ہر ایک کو معین حدود کے اندر محدود کر دیا ہے۔

قرآن مجید میں اس قسم کی بہت سی آیات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی حکومت مطلقہ۔ تدبیر حکیمانہ اور بلا قید و شرط فرمان روائی کو جو اسے پورے جہان ہستی پر حاصل ہے۔ کلمہ ''ملک'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن ہم نے فقط انہیں چند ایک آیتوں کے تذکرے پر اکتفا کیا ہے۔

وہ آیات کہ جن میں خداوند تعالیٰ کی مالکیت کی بات کی گئی اور لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ تمام ارضی و سماوی موجودات پروردگار عالم کی مالکیت ہیں۔ ان میں سے اکثر میں یہ مضمون ''لام اختصاص'' کے ساتھ ادا کیا گیا ہے۔

لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ [۲]

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے پروردگار عالم کی ملکیت ہے۔ اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اگر اسے ظاہر کر دو یا اسے مخفی رکھو خداوند تعالیٰ اس کو تمہارے حساب میں شمار کرے گا۔

وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَلَقَدْ وَصَّیْنَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِیَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِیًّا حَمِیْدًا ﴿۱۳۱﴾ [۳]

آسمانوں میں جو کچھ ہے اور زمین کے اندر جو کچھ ہے یہ سب اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے اور ہم نے تم سے پہلے کے تمام انبیاء کے پیروکاروں اور خود تم کو وصیت کی ہے کہ خدا سے ڈرو اور پرہیز گار رہو اور اگر تم نے راہ کفر و انحراف اختیار کی تو (تمہاری اطاعت کی اسے کوئی احتیاج نہیں ہے) کیونکہ وہ اس عالم کائنات کا مالک حقیقی ہے اور بے نیاز اور قابل تعریف ذات ہے۔

---

[۱] سورۂ فرقان آیت ۲

[۲] سورۂ بقرہ آیت ۲۸۴

[۳] سورۂ نساء آیت ۱۳۱

گر جملہ کائنات کافر گردند
بر دامن کبریاش ننشیند گرد

اگر ساری کائنات کافر ہو جائے تو بھی اس کی ذات کبریا کے دامن پر گرد تک نہیں پڑے گی۔

پروردگار عالم کی بے نیازی

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قَدْ يَعْلَمُ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ ؕ وَيَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٦٤﴾ [1]

آگاہ رہو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ موجود ہے اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے اور تم جس حالت پر ہو خداوند تعالیٰ اس سے آگاہ ہے۔ اور جس دن لوگ خداوند عظیم کی درگاہ میں پلٹائے جائیں گے اللہ تعالیٰ انہیں ان کے تمام نیک و بد اعمال کی خبر دے گا۔ اور پروردگار عالم ہر شئی سے دانا و آگاہ ہے۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۙ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ﴿٣١﴾ [2]

تمام سماوی و ارضی موجودات کا مالک واقعی اللہ تعالیٰ ہے (اور وہی اپنے حق مالکیت کی بنیاد پر) تمام بدکاروں کو ان کے برے اعمال کی سزا دیتا ہے اور تمام نیکوکاروں کو ان کے نیک اعمال کی جزا دیتا ہے۔

اس طرح کی دیگر بہت سی آیات قرآن شریف میں موجود ہیں کہ جو خداوند عالم کی مالکیت کو بیان کرتی اور تمام ارضی و سماوی موجودات کو خالق عالم کی ملک قرار دیتی ہیں۔

بشر کی اعتباری مالکیت

بشر اشیاء کا حقیقی مالک نہیں اور اس کی مالکیت ایک اعتباری اور انتزاعی امر ہے، پرانے زمانے میں انسان کی اجتماعی اور اقتصادی ضروریات کے پیش نظر اس جہان میں انسان کی مالکیت کی بنیاد قائم ہوئی اور خدائی پیغمبران نے بھی آسمانی دستور کے مطابق اس مالکیت کی تصدیق فرمائی۔

ایک پھلدار درخت پر ایک انسان کی مالکیت کی حدود یہ ہیں کہ اگر وہ چاہے تو اسے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ وہ اس کے پھولوں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ ان پھلوں کو دوسروں کے ہاتھ فروخت کر سکتا ہے اور چاہے تو اس درخت کو کاٹ سکتا ہے، لیکن یہ سب حقوق

---

[1] سورۂ نور آیت ۶۴

[2] سورۂ نجم آیت ۳۱

حقیقی مالکیت کا مفہوم نہیں رکھتے۔

اس درخت کا حقیقی اور واقعی مالک اللہ تعالیٰ ہے کہ جس نے اس درخت کے وجود کے تمام ذرات کو خلق فرمایا ہے۔ یعنی اس درخت کے تمام خلیوں کی زندگی اسی ہستی کے فیض کا نتیجہ اور اسی کی عنایات کا اثر ہے۔ چنانچہ اس درخت کا واقعی مالک وہ ہوسکتا ہے جو اس کی زندگی کی حفاظت اور اس کی حیات کی بقاء کے لئے اسے ایک طرف سے غذا حاصل کرنے کی توانائی بخشا اور ہضم و جذب کی صلاحیت دیتا ہے تو دوسری طرف اس درخت کی غذا کا سامان عالم طبیعت کے دامن میں تیار کر دیتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ درخت کا مالک حقیقی وہ پروردگار ہے جو اس کے تمام اجزاء کا پیدا کرنے والا ہے، انہیں بخشنے والا ہے اور جس نے اپنی حکیمانہ تدبیر کو تکوینی قوانین کی صورت میں اس درخت کے وجود میں جاری کیا اور اسے اپنے تکامل کی راہ پر رواں کر رکھا ہے۔

مالک ملک وملک

نتیجہ یہ ہے کہ اس جہان ہستی کی ''ملک'' اور اس عالم وجود کا ''ملک'' اس ذات الٰہی لم یزل ولا یزال سے مختص ہے۔ کیونکہ تمام ذرات علام خداوند تعالیٰ کے پیدا کردہ اور اس کے فیض الٰہی کے طفیل موجود ہوئے ہیں۔ یہ کہنا بجا ہے کہ تمام موجودات کا حقیقی اور واقعی مالک اللہ تعالیٰ ہے کہ سارا نظام عالم اس ذات کی حکیمانہ تدبیر اور جاری وساری حکم کے ذریعے باقی اور برقرار ہے۔ یہ کہنا بھی درست ہے کہ اس جہان ہستی کا ملک اور فرمان روائی اسی حق تعالیٰ سے مخصوص ہے۔

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۭ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۵۴ [۱]

آگاہ رہو کہ اسی کو خلق کرنے اور امر دینے کا حق حاصل ہے اور اللہ تعالیٰ عالمین کا برکت والا رب ہے۔

استفادہ کی اجازت

اللہ تعالیٰ نے بشر کو اجازت دی اور اس نے اسے حکم دیا ہے کہ ہر کوئی اپنی زندگی کے تحفظ اور اپنی خوش حالی کی ضمانت کے لئے اس زمین میں موجود تمام اشیاء اور اس کے تمام منابع سے شرعی حدود کے اندر اور مصلحت کے مطابق استفادہ کرے، حالانکہ یہ سب خزانے خداوند تعالیٰ کی ملکیت ہیں اور تکوینی قوانین کی مدد سے پروردگار عالم ''ملک'' اور حکومت کے تمام ضابطوں کو جاری کئے رکھتا ہے۔

هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا [۲]

اللہ نے تمہیں زمین سے پیدا فرمایا اور تمہیں اس میں آباد کیا۔ (تاکہ اپنی محنت اور کوشش کے ساتھ اس زمین کو آباد کر دکھاؤ)۔

---

[۱] سورۂ اعراف آیت ۵۴

[۲] سورۂ ہود آیت ۶۱

انسان زمین میں گندم کا بیج ڈالتا ہے اور کچھ عرصہ کے بعد اس کی پیداوار سے اپنا سالانہ خرچہ اٹھا لیتا ہے۔ یادر ہے کہ انسان اپنے اس کام میں بھی ''ملک خدا'' ہر دو سے استفادہ کرتا ہے۔ گندم۔ زمین اور پانی یہ سب پروردگار کی ملکیت ہیں کہ جن کو ایک کاشتکار اپنے فائدے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ لیکن قانون حیات سے زیر زمین دانے کو چیرنا۔ پودوں کا غذا حاصل کرنا اور نشوونما پانا یہ سب معاملات جو بیج کے پرورش پانے کے عوامل ہوتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے ملک اور حکومت کے قاعدے قانون میں شامل اور تکوینی قوانین کا حصہ ہیں کہ جن سے ایک کاشتکار فائدہ اٹھاتا ہے۔

أَفَرَءَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ﴿٦٣﴾ ءَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُۥٓ أَمْ نَحْنُ ٱلزَّٰرِعُونَ ﴿٦٤﴾[1]

کیا تم نے دیکھا کہ زمین میں جو بیج تم کاشت کرتے ہو، کیا تم اسے اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں؟

اس آیت کا پہلا بشر کے ''ملک خدا'' سے استفادہ کرنے کا بیان ہے جو ہمارے ارادہ واختیار کے اندر ہے۔ دوسرا حصہ ''ملک خدا'' کے متعلق ہے اور تکوینی قوانین سے فائدہ پانے کو بیان کر رہا ہے جو ہمارے اختیار میں نہیں ہیں۔

ناجائز استفادہ

''ملک پروردگار'' سے متعلق امور میں خداوند تعالیٰ کے تشریعی قوانین سے بے پرواہی برتنا ایک بشر کے مقدور میں ہے اور وہ اس زمین کی اشیاء سے ناجائز فائدہ اٹھانے پر قدرت رکھتا ہے۔ بایں طور کہ ان اشیاء کو اس راستے میں استعمال کرنے لگے جن کی اجازت پروردگار عالم نے نہ دی ہو۔ لیکن جہاں تک تکوینی قوانین اور اس نظام آفرینش میں جاری الٰہی سنن کا تعلق ہے تو چونکہ وہ حق تعالیٰ کے توانا ارادے اور اس کی قیومیت وحکومت کے ترجمان اور اس قدر قطعی اور لازم الاجراء ہیں کہ کسی کو قدرت نہیں کہ ان قوانین کے بارے میں اپنی رائے اور اپنے اختیار کو دخل دے سکے۔ نہ ہی کوئی اس کے مقررات سے سرتابی اور انکار کا حق رکھتا ہے کہ ''ولایمکن الفرار من حکومتك'') اور تیری حکومت سے فرار ناممکن ہے (

دور حاضر کی علمی وسائنسی ترقی کے باوجود بشر عالم طبیعت کے قوانین کے سامنے مجبور ہے کہ ان کی اطاعت کے بغیر کوئی چارہ نہیں رکھتا۔ یہ خداوند تعالیٰ کی حاکمیت کے نفاذ کا حصہ ہیں۔ اس لئے ہر انسان کو اس نظام آفرینش کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے۔ اگر وہ اپنی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتا ہے اور علمی وعملی مدارج تک ترقی کرنا چاہتا ہے تو اسے قوانین خلقت سے ہم آہنگی رکھنا پڑتی ہے۔ اس کو یہ قدرت حاصل نہیں کہ ان قوانین کو اپنی خواہش کے مطابق موڑ لے۔

تکوینی قوانین میں جبر

''رسل کہتا ہے: انسان جس قدر بھی قدرت والا اور عالم ہو وہ قادر مطلق نہیں ہے اور اس کی قدرت ہمیشہ عالم طبیعت کی

---

[1] سورۂ واقعہ آیت ۶۳ ۔ ۶۴

حدود کے اندر محدود ہے۔ یہ اپنے علم وصنعت کے ذریعے ان حدود میں وسعت تو پیدا کرسکتا ہے، لیکن ایسا ہرگز نہیں کرسکتا ان حدود کو بالکل ختم کرڈالے''

''ہم یہ تو کرسکتے ہیں کہ اپنی بہت سی آرزوؤں کو پورا کرنے کے لئے اپنی طبیعت کو نرم طریقے سے راضی کرلیں۔ لیکن یہ نہیں کرسکتے کہ اپنی طبیعت پر فرمان روائی کرتے ہوئے اسے اپنے راستے سے بالکل منحرف کردیں یا اسے اپنے قانون سے سر موانحراف کرنے پر تیار کرلیں۔''[1]

آئندہ سطور میں ہم اس نکتے کو توضیح کریں گے کہ خداوند عالم نے لوگوں کو یہ اجازت دی ہے کہ وہ ''ملک خدا'' شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے تصرف کریں۔ اسی لیے قرآن مجید کی جان آیات میں خداوند تعالیٰ کی مالکیت کا تذکرہ ہوا ہے، ان کی کثیر تعداد کے آخر میں لوگوں کا نام لیا گیا ہے۔ پھر ایسے جملے لائے گئے جن میں لوگوں کی اچھی یا بری نیت، ان کے اعمال کی جزا یا سزا، ان کے کیے سے درگزر یا مواخذہ، اور اس قسم کے امور کو بیان کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ اس پوری آئنات کی فرماں روائی اور قیومیت اس ذات الٰہی سے مختص ہے اور لوگوں کو اس معاملے میں مداخلت کا کوئی حق نہیں اور نہ وہ اس میں دخل دینے پر قادر ہیں۔ اس لئے قرآن مجید کی جس قدر آیات میں ''ملک خدا'' اور حکومت الٰہی کو بیان کیا گیا ہے ان سب کے آخر میں اللہ تعالیٰ کی لامحدود قدرت۔ مخلوقات کی آفرنیش۔ زندگی بخشنا یا موت دینا، بیٹیاں عطا کرنا یا بیٹے دینا اور ایسے امور کو لا گیا ہے جن کا تعلق محض رب العزت سے ہے۔ (اور اس میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے)

مناسب ہوگا کہ یہاں دو نکتوں کی طرف اشارہ کردیا جائے:۔

آزاد خدائی حکومت

اول: خداوند تعالیٰ نے اس جہان میں اپنی حاکمیت اور قیومیت کو تکوینی قوانین کے ذریعہ نافذ کیا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان تکوینی قوانین کو وضع کرنے کے بعد وہ اپنے ارادہ واختیار سلب کرا بیٹھا اور اب ان قوانین کو زیروزبر کرنے سے عاجز ہوگیا ہے۔ بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے اور اس کی بے قید وشرط حاکمیت اور اس کی لامحدود قدرت ہمارے اس جہان اور دیگر تمام جہانوں کے لئے بلا ریب وشک ثابت ہے۔ وہ اگر چاہے تو ان تکوینی قوانین کی بنیاد کو ہی تبدیل کرکے رکھ دے یا چاہے تو بعض خاص موارد میں اپنی حاکمیت کا استعمال عام طبیعی قوانین سے ہٹ کر کسی دوسرے راستے سے انجام دے دیں۔

چنانچ حضرت صالحؑ کی اونٹنی، حضرت ابراہیمؑ کے لئے آتش نمرود کا گلزار ہونا اور موسیٰؑ کے عصا کا اژدھا بن جانا سب اسی قسم کے امور سے تعلق رکھنے والے واقعات ہیں۔

دوم: بعض خدا رسیدہ لوگ خدا سے معنوی ارتباط اور کمال عبودیت کے نتیجے میں ایسا روحانی مقام پا گئے کہ ولایت تکوینی

---

[1] امید ہای نوص ۴۱

کے بلند ومقام کے اہل ثابت ہوئے۔ یہ اس شان کے لوگ ہیں کہ اگر کسی موقع پر چاہیں تو خداوند تعالیٰ کے اذن اور الٰہی قوت وقدرت کے سہارے تکوینی قوانین کی حدود کو عبور کر جاتے ہیں اور اس جہان کے عمومی قوانین سے برتر کام انجام دے دیتے ہیں۔

قَالَ الَّذِیۡ عِنۡدَہٗ عِلۡمٌ مِّنَ الۡکِتٰبِ اَنَا اٰتِیۡکَ بِہٖ قَبۡلَ اَنۡ یَّرۡتَدَّ اِلَیۡکَ طَرۡفُکَ ؕ [1]

جس شخص کے پاس کتاب کا کچھ علم تھا، اس نے کہا کہ میں آپ کے ہاں اس ''تخت'' کو لے آتا ہوں قبل اس کے کہ آپ کی پلک جھپکے۔

اَنِّیۡۤ اَخۡلُقُ لَکُمۡ مِّنَ الطِّیۡنِ کَہَیۡـَٔۃِ الطَّیۡرِ فَاَنۡفُخُ فِیۡہِ فَیَکُوۡنُ طَیۡرًۢا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ۚ [2]

تحقیق میں تمہارے لئے مٹی سے ایک پرندے جیسی شکل بناتا ہوں۔ پھر میں اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے ساتھ پرندہ بن جاتا ہے

ان دونوں آیات میں دو بزرگوں اور الٰہی انسانوں کے ولایت تکوینی رکھنے اور تکوینی قوانین کی حدود سے بالاتر افعال انجام دینے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ قرآن شریف نے آیت الکرسی میں (لہ مافی السموات ومافی الارض) کا جملہ لاکر اور اسی طرح کی دیگر آیات کے ذریعے آسمانوں اور زمین کے دائرے میں موجود تمام اشیاء کو خالق پروردگار کی ملکیت بتایا ہے۔ بلکہ بنیادی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین، اسلام میں خداوند تعالیٰ کے مالک ہونے کو ایک خصوصی مقام اور اس نکتے کو ایک خصوصی شان حاصل ہے۔

اعتقاد مالکیت حق تعالیٰ

پروردگار عالم کی مالکیت پر اعتقاد رکھنا ان اصولی اور اساسی مسائل میں سے ہے جن کے ذریعے الٰہی مکتب کو مادی مکتب سے ممتاز کیا جاتا ہے۔ پھر اسی اعتقاد سے انسان وجہان کی شناخت کے باب میں ایک آدمی کے طرز تفکر پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مالکیت پر اعتقاد رکھنے کو انسان سازی اور اسلامی نظام تعلیم وتربیت کی بنیادوں میں ایک اہم ترین مقام حاصل ہے۔ یہ عقیدہ ایک انسان کی زندگی کے تمام مظاہر پر دوررس اثرات مرتب کرسکتا ہے، اسے خودسری وبے راہ روی سے نجات دلا سکتا ہے اور فرض شناسی اور انسانیت کی طرف تحریک کرسکتا ہے۔

بشر جو خود بھی ارضی موجودات میں سے ایک ہے اور ''لہ مافی السموات ومافی الارض'' کا جملہ اس کو بھی شامل ہے۔ یہ بشر بھی مادی مکتب اور الٰہی مکتب ہر دو کے ہاں تحقیق ومطالعہ کا موضوع بنایا گیا ہے اور ان دونوں مکاتب کے پیروکار انسان کی شناخت کے بارے میں اپنا اپنا جو طرز تفکر سامنے لائے ہیں، بہتر ہوگا کہ ان کا باہمی موازنہ کیا جائے۔

---

[1] سورۂ نمل آیت ۴۰

[2] سورۂ آل عمران آیت ۴۹

مادی شخص کا طرز تفکر

ایک مادہ پرست شخص جب اپنے بارے میں سوچتا ہے تو اس نتیجے تک پہنچتا ہے کہ وہ ایک مادی مخلوق ہے اور اس عالم طبیعت کے دامن میں سے نابینا و بے شعور مادے سے اتفاقاً وجود میں آ گیا ہے۔ نیز یہ بھی ایک اتفاقی حادثہ ہے کہ اسے عقل، ہوش اور اخلاق و جدان نصیب ہو گیا اور اسی طرح شہوت۔ غضب اور دیگر نفسانی خواہشات ورجحانات کا حصول بھی ایک اچانک واقعہ ہے۔

گویا کہ ان عظیم صلاحیتوں میں سے کوئی ایک بھی کسی حکیمانہ منصوبے کے تحت کسی خالق حکیم کے ارادے سے اسے عطا نہیں ہوئی۔ چنانچہ ایسی فکر رکھنے والا شخص اپنے خالق یعنی اس عالم طبیعت کے سامنے اپنے اندر کوئی احساس ذمہ داری محسوس نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ طبیعت تو ایک بے شعور شے ہیں کہ وہ نہ تو ذمہ داری کے سمجھنے پر قادر ہے اور نہ ہی اپنی مخلوق سے کوئی مطالبہ کر سکتی ہے۔ پس نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسا شخص اپنی شہوات اور خواہشات کو پورا کرنے کے لئے اپنے آپ کو ہر قسم کی قید و شرط سے آزاد خیال کرتا ہے۔ یعنی وہ ایک حیوان کی طرح اپنے غرائز کی کشش کے تحت انہیں پورا کرنے کی کوشش کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کا مطمح نظر یہی ہوتا ہے کہ ہر ممکن طریقے سے اپنی خواہشات نفسانیہ کو عملی جامہ پہنائے تا کہ زیادہ سے زیادہ لذت اٹھائے اور اپنے نفس کو راضی رکھنے کی کوشش کرے۔

ہاں اگر وہ اپنے اوپر کسی پابندی کا قائل ہوتا ہے تو وہ فقط اس ملک کی عدلیہ یا انتظامیہ کی طرف سے مقرر کردہ قوانین و ضوابط کی پابندی ہوتی ہے کہ جس میں وہ زندگی گزار رہا ہے۔ لیکن وہ بھی لذت طلبی کا غریزہ کبھی کبھی اسے اس قدر سرکش بنا دیتا ہے کہ وہ ملکی قانون کو بھی توڑ دیتا ہے اور کام و دہن کی لذت حاصل کرنے کے لئے ممنوع افعال کا ارتکاب کر لیتا ہے۔ حتی کہ ہیروئین فروشی اور چوری وغیرہ کی جرأت بھی کر گزرتا ہے۔

الٰہی انسان کا عقیدہ

لیکن ایک خدا پرست انسان جب اپنے بارے میں غور و فکر کرتا ہے تو اس نتیجے تک پہنچتا ہے کہ مجھے ایک قادر۔ عالم اور حکیم خالق نے اپنے ارادہ و اختیار کے ساتھ خلق فرمایا ہے۔ نیز اس نے جہاں مجھے حیوانی غرائز اور نفسانی خواہشات عطا کی ہیں وہاں مجھے عقل و ہوش اور اخلاقی وجدان کی نعمت سے بھی مالا مال فرمایا ہے۔

وہ خود سے سوال کرتا ہے کہ کیا میں ایک حیوان کی مانند بلا قید و شرط آزاد ہو سکتا ہوں؟ اگر میرا خالق میرے بارے میں یہی چاہتا ہے کہ حیوان کی طرح زندہ رہوں تو پھر اس نے مجھے اخلاقی وجدان کیوں عطا کیا اور مجھے عقل کیوں دی ہے؟ کیا یہ انسانی سرمائے کوئی فضول شے ہیں؟ کیا وجدان اخلاقی جو میرے وجود کے اندر موجود ہے۔ وہ بے فائدہ اور لغو ہے کیا یہ اخلاقی وجدان نے مجھے اس لئے عنایت نہیں کیا گیا کہ سعادت کے حصول میں میری راہنمائی کرے؟ کیا یہ فیصلہ کرنے کی فضیلت میری

سرشت میں اس لئے نہیں رکھی کہ میں اپنے حیوانی میلانات کو اس کے سامنے پیش کروں اور پھر اس کے فیصلے پر عمل کروں تا کہ غیر انسانی کردار اختیار کرنے سے بچ جاؤں۔؟ کیا اس ہستی نے مجھے عقل اسی لئے نہیں دی کہ نیکی و بدی کا ادراک کروں اور انسانی فرائض کا پابند اور الٰہی تکالیف کا مکلف قرار پا سکوں؟

أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَن يُتْرَكَ سُدًى ﴿٣٦﴾[1]

کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ اسے ویسے ہی چھوڑ دیا جائے گا

یعنی اس کے باوجود کہ اسے عقل و طاقت عمل سے مالا مال کیا گیا ہے، کیا خداوند عالم اسے مہمل اور اپنی حالت پر چھوڑ دے گا اور رب العزت اس پر اپنے اوامر و نواہی کی ذمہ داری عائد نہیں کرے گا۔؟

جو شخص بھی خود کو خدا کی مخلوق سمجھتا اور اپنی بقاء کو اس کی حکیمانہ تدبیر کا مرہون قرار دیتا ہے، وہ کبھی اس ذات کے اوامر و نواہی کے سامنے خود کو بے تعلق قرار نہیں دیتا۔ وہ جب اس حقیقت بینی اور نورانی فکر تک پہنچ چکا تو اپنے جسم و جان، عقل و وجدان۔ غرائز و میلانات حیوانی بلکہ اپنے وجود کے تمام ذرات کو اپنے محسن خدا کی مخلوق مانتا ہے اور یہی عقیدہ رکھتا ہے کہ وہی میرا خالق اور حقیقی مالک ہے۔

خدا پر ایمان

ایسا انسان کبھی اپنے مالک حقیقی کے حکم کے خلاف قدم نہیں اٹھاتا اور گناہ کا ارتکاب کرنے کی جرات نہیں کرتا۔ اگر کبھی غفلت وغیرہ کے نتیجے میں اس سے کوئی گناہ سرزدہ ہو بھی جائے۔ تو جب بندگی او عبودیت کی فکر اس کے اندر بیدار ہوتی ہے اور اسے یاد دلاتی ہے کہ تو اپنے پروردگار کا مملوک ہے اور ایک مملوک بندہ اپنے آقا و مولیٰ کے فرمان کی مخالفت نہیں کرتا۔ تب وہ متنبہ ہو جاتا ہے، اپنی روش تبدیل کر دیتا ہے، اپنے کئے پر پشیمان ہو جاتا ہے اور مستقبل میں گناہ اور مخالفت مولیٰ سے پرہیز کرنے لگتا ہے۔

اہل مرو میں ایک شخص بشر بن حارث حافی ہوا ہے، اس کی زندگی کا ایک طویل حصہ گناہوں اور ناجائز شہوت رانیوں میں گزرا۔ ایک دن حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اس کوچے سے گزرے کہ جس میں اس کا گھر تھا۔۔ جب آپ بُشر کے گھر کے دروازے پر پہنچے تو اتفاقاً دروازہ کھلا اور بشر کی کنیزوں میں سے ایک کنیز باہر آئی۔ اس نے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو پہچان لیا اور حضرت بھی جانتے تھے کہ یہ بشر کا گھر ہے۔ آپ نے اس کنیز سے پوچھا کہ تمہارا آقا آزاد ہے یا غلام؟ وہ بولی: آزاد ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں ایسا ہی ہے جیسا کہ تو نے کہا۔ کیونکہ اگر غلام اور بندہ ہوتا تو غلامی و بندگی کے شرائط پر عمل کرتا اور اپنے آقا و مولیٰ کی اطاعت میں رہتا۔

---

[1] سورۂ قیامت آیت ۳۶

احساس ذمہ داری

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے یہ جملہ فرمایا اور اپنے راستے پر چل دیئے۔ تب وہ کنیز اندر گئی اور بُشر کے سامنے امام علیہ السلام کا فرمایا ہوا جملہ نقل کیا۔ اس جملے نے بشر کے اندر ایک طوفان پیدا کر دیا اور اس میں اندرونی انقلاب بپا ہو گیا۔ وہ جلدی سے اٹھا اور پابرہنہ اپنے گھر سے دوڑتا ہوا امام علیہ السلام کے قریب پہنچا۔ اس نے امام علیہ السلام کے ہاتھوں پو توبہ کی، اس کے بعد اس نے گناہوں کی زندگی چھوڑ دی اور اطاعت الٰہی کی راہ پر آ گیا۔ جس سعید وقت میں وہ امام علیہ السلام کے حضور میں شرفیاب ہوا اور توبہ کی اس لمحے وہ برہنہ پا تھا۔ چنانچہ اس سعادت بخش لمحے کے احترام میں اس نے پوری زندگی جوتا نہ پہنا اور ہمیشہ برہنہ پا رہا کرتا، اسی لئے ''بُشر حافی'' یعنی (پابرہنہ) مشہور ہوا۔[1]

بُشر جو کئی سالوں سے گناہ کی ناپاک زندگی سے آلودہ تھا، وہ ایک مختصر سے جملے کے ذریعے متنبہ ہو گیا۔ وہ اس طرح منقلب ہو گیا کہ اپنی گزشتہ زندگی سے استغفار کی اور بقیہ زندگی کو پاکیزگی، و درست روی میں ڈھال لیا۔ وہ اس لئے منقلب ہوا کہ وہ ایک الٰہی مرد تھا اور اللہ تعالیٰ کے مالک ہونے پر ایمان رکھتا تھا۔ جب امام علیہ السلام نے اسے اس مقدس عقیدے اور ایمانی فکر کی یاد دلائی کہ اگر تم خود کو ایک بندہ اور مملوک خدا سمجھتے ہو تو پھر تمہیں بندگی کے طرائق پر عمل کرنا چاہئے۔ یعنی تم اپنے مولیٰ و آقا کے اوامر سے روگردانی نہ کرو تو وہ فوراً اطاعت کرنے لگا اور اپنی ناپسند روش کو چھوڑ دیا۔

ایمان اور گناہ پر غلبہ

پس اگر ایک مادی انسان کے طرز تفکر اور ایک الٰہی انسان کے طرز تفکر کا باہمی موازنہ کیا جائے تو وہ ہمیں اس نتیجے تک پہنچاتا ہے کہ مادی طرز تفکر کا انسان اپنے اندر احساس ذمہ داری پیدا نہیں کرتا۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو ہر طرف سے آزاد تصور کرتا ہے اور اس کے لئے مشکل ہے کہ اپنے سرکش غرائز اور آزاد میلانات کو لگام دے اور طبعی رجحانات کی مخالفت کرتے ہوئے خود کو گناہ سے سے روک لے۔ لیکن ایک الٰہی شخص چونکہ اپنے آپ کو خداوند تعالیٰ کا بندہ اور مملوک مانتا ہے، اس لئے اپنے ذہن وفکر میں اس کی اطاعت کے جذبے کو پروان چڑھاتا ہے۔ یہ خدا پرست انسان عقیدہ رکھتا ہے کہ اپنے خداوند کی فرمان برادری مجھے اس کی طرف سے جزا کا مستحق بناتی ہے، جب کہ اس کے اوامر کی نافرمانی سزا کا مستوجب قرار دیتی ہے۔ یہی عقیدہ اس کا سبب بنتا ہے کہ وہ اپنی غلط خواہشات سے چشم پوشی کر لیتا ہے اور اپنے اللہ کی خوشنودی کے حصول کے جذبے سے سرشار ہو کر غیر مشروع خواہشات کو قابو کر لیتا ہے۔

دراصل آسمانی مکتب ''اسلام'' میں تربیت کا نظام ہی اس بنیا پر استوار ہے کہ ہر مسلمان خداوند تعالیٰ کا بندہ اور مملوک ہے۔ اس کے تمام اعضاء بدن اور اس کے اختیار میں دی گئی تمام طاقتیں درحقیقت اسی پروردگار عالم کی ملکیت ہیں۔ ہر مسلمان اس بات کا

---

[1] تتمۃ المنتہیٰ ص ۳۲۹

پابند ہے کہ اپنے ان اعضاء اوران طاقتوں کواپنے خداوندتعالیٰ کے پسندیدہ امور میں استعمال کرے اوراپنے اللہ کی اس ملکیت سے اس کی رضا کے اندر رہتے ہوئے استفادہ کرے۔

قال علی بن الحسین علیہ السلام۔ وحق نفسك علیك ان تستعملها لطاعة اللہ عزوجل [١]

اطاعت پروردگار

حضرت امام سجادعلیہ السلام نے فرمایا: تیرا اپنا حق تیرے اوپر یہ ہے کہ تو اپنے آپ کویعنی وہ تمام معنوی اور مادی طاقتیں کہ جو تیری ذات وشخصیت کو بنانے والی ہیں، تو ان کو ہمیشہ اپنے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں استعمال کرے اوراپنے پروردگار کی مخالفت کر کے اپنے ذاتی حق کوضائع نہ کرے۔

قال علیہ السلام: لم تیرك جوارحك سدی [٢]

امام علیہ السلام نے فرمایا: تیرے بدن کے تمام فعال اعضاء مہمل۔غیر ذمہ دار اورفضول نہیں چھوڑ دیئے گئے۔مال وثروت بھی ان ارضی موجودات کا ایک جزو ہے، اس لئے ''لہ ما فی السموات وما فی الارض'' کا جملہ اسے بھی شامل ہے۔

اسلام کے عظیم آسمانی مکتب میں تمام اموال۔املاک۔اشجار۔حیوانات۔خزانے۔معاون۔دریا۔صحرا۔غرضیکہ زمین میں موجود ہر مخلوق اسی خدا کی حقیقی اورواقعی ملکیت ہے۔

اس مالک حقیقی نے اپنے ان مملوک انسانوں کواجازت دی ہے کہ وہ اپنی زندگی کی بقاء اوراپنی خوش حالی کے لئے اس کی ملکیت میں تصرف کریں اورحد اعتدال میں ان سے فائدہ اٹھائیں۔انہیں یہ اجازت نہیں ہے کہ ان خداوندتعالیٰ کی ملکیتی اشیاء کو بے مقصد اورفضول کاموں کے لئے تصرف میں لائیں یاراہ گناہ وجرم میں ضائع کریں۔

عن ابان بن تغلب قال قال ابو عبداللہ علیہ السلام: اتری اللہ اعطی من اعطی من کرامته علیه ومنع من منع من هوان به علیه لا ولکن المال مال اللہ یضعه عند الرجل ودایع وجوزلهم ان یأکلوا قصدا ویلبسوا قصدا وینکحوا قصدا او یرکبو اقصدا او یعودوا بما سوی ذالك علی فقراء المومنین ویملوا به شعتهم فمن فعل ذالك کان ما یأکل حلالا ویشرب حلالًا ویرکب وینکح حلالاً ومن

---

[١] مکارم الاخلاق ص ٢٣٠

[٢] مجمع البحرین ''سدا''

عدا ذالك كان عليه حراما ثم قال: لا تسرفوا ان الله لا يحب المشرفين[۱]

امانت الٰہی

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ابان بن تغلب سے فرمایا: کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جس کو خداوند تعالیٰ زیادہ عطا فرماتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ پروردگار عالم کے ہاں زیادہ باعزت اور محبوب ہوتا ہے اور جس کو اس نے اپنے عطایا سے محروم کیا ہوتا ہے وہ خداوند عظیم کے نزدیک ذلیل وخوار ہوتا ہے؟ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ مال تو سارا مل خدا ہے جو اس نے مالداروں کے ہاتھ بطور امانت دیا ہوے۔ اس نے ان امانت داروں کو اجازت دی ہے کہ وہ اس مال خدا کو اپنی غذا۔ لباس۔ انتخاب زوجہ۔ سواری وغیرہ کے امور میں میانہ روی اور اپنی معاشرتی حیثیت کو مدنظر رکھتے ہوئے استعمال کریں۔ مال کی اس سے زائد مقدار کہ جو امانت خدا ہے۔ وہ دیگر محتاج۔ نادار اور معذور مسلمانوں کو دے دیں اور اس طرح ان کی پریشانیوں کو دور کریں اگر کوئی مال خدا میں اس مشروع اور معتدل طریقے کے مطابق تصرف کرتا ہے تو جو کچھ اس نے اپنے استفادہ کے لئے خرچ کیا ہے وہ اس پر حلال ہے۔ اگر اس کے خلاف عمل کرتا ہے اور حد سے زیادہ اپنے تصرف میں لاتا ہے تو وہ اس کے لئے ناروا اور حرام ہے۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا: اسراف مت کرو کیونکہ خدا تعالیٰ فضول خرچوں کو دوست نہیں رکھتا۔

ایک مرتبہ عنوان بصری حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں شرفیاب ہوا، تب اس کے اور امام علیہ السلام کے مابین کچھ گفتگو ہوئی، اس کے بعد اس نے حضرت سے پوچھا: عبودیت کی حقیقت کیا ہے؟

قال ثلاثه اشياء ان لا يرى العبد لنفسه فيما خوله الله ملكا۔ لان العبيد لا يكون لهم ملك يرون المال مال الله يضونه حيث امرهم الله به[۲]

حقیقت عبودیت

امام صادق علیہ السلام نے بیان کیا کہ عبودیت تین چیزوں میں منحصر ہے ان میں سے پہلی چیز خداوند تعالیٰ کی مالکیت کا مسئلہ ہے۔

آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا حقیقی بندہ وہ ہے جو اس کے عطا کردہ اموال میں اپنی مالکیت کا قائل نہ ہو کہ مال کے حقیقی مالک بندے نہیں۔ حق یہ ہے کہ ان کی نظر میں سارا مال اللہ تعالیٰ کا ہے اور اسی کی ملکیت ہے، اللہ کے بندے وہ ہیں جو اس مال کو ایسی جگہ رکھتے اور ایسے طریقے سے خرچ کرتے ہیں جس کا انہیں خداوند عالم نے حکم دیا ہوتا ہے۔

---

[۱] سفینۃ البحار ''سرف'' ص ۲۱۵

[۲] بحار الانوار ج ۱ ص ۶۹

نتیجہ یہ ہوا کہ آسمانی مکتب اسلام نے عالم انسانیت کے لئے جو بنیادی اصول وضع فرمایا، وہ یہ ہے کہ تمام ارضی میں سے ایک ہے اور پروردگار کا مملوک ہے۔ اللہ تعالی نے اسے اجازت دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حقیقی ملکیت پر مشتمل تمام موجودات سے شرعی حدود اور مالک حقیقی کی رضا کے مطابق استفادہ کرسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی اجازت کے حدود

اب اگر کوئی سوال کرے کہ خداوند عالم نے کس حد تک اپنی ملکیت سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دی ہے؟ اور انسان اپنی عقل وخرد کی توانائیوں کے ذریعے عالم طبیعت کے ان ذخائر سے کس حد تک استفادہ کرنے کی قدرت رکھتا ہے؟ مختصر یہ کہ بشر کس حد تک حق رکھتا ہے کہ وہ پروردگار عالم کی ملک میں اپنی سرگرمیوں کو وسعت دے؟ اس سوال کا جواب بشر کی صلاحیت کی حدود کو جان لینے سے حاصل نہیں ہوسکتا اور یہ خود خالق بشر اور مالک جہان جانتا ہے۔ وہ خود ہی اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ اس نے ہی بشر میں عقل و ہوش کی استعدادیں پیدا فرمائی ہیں اور اس کی استعداد قابلیت کی مقدار کو بھی وہ خود ہی سمجھ سکتا ہے۔ اس لئے اسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ بشر کے لئے ان آسمانی اور زمینی اشیاء سے استفادہ کرنے کی حدود معین فرمائے اور اپنی ملکیت سے اس کی بہرہ برداری کا اصول قائم کرے۔

بشر کی قدر و قیمت

البتہ قرآن مجید میں بشر کی قدر و قیمت اور انسان کے مقام کی رفعت کا بیان اس طرح ہوا ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝۴ [1]

ہم نے انسان کو بہترین اور عالی ترین ترکیب کے ساتھ پیدا کیا ہے۔

بشر حامل امانت الٰہی۔ صاحب عقل وہوش اور ایک معتدل اور متوازن بدن کا مالک ہے۔ یہ خدا کی اس قدر اہم مخلوق ہے کہ اس کو پیدا کرنے والے خدا نے اس کی تخلیق پر خود اپنی تعریف کی اور اپنے بارے میں یوں ارشاد فرمایا:

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝۱۴ [2]

نہ فلک راست مسلم نہ ملک را حاصل
آنچہ در سر سویدای نبی آدم ازا داست

وہ چیز نہ فلک کے پاس ہے نہ فرشتے کو ملی ہے کو جو خدا کی طرف سے انسان کے دل میں رکھی گئی ہے۔

---

[1] سورۂ تین آیت ۴

[2] سورۂ مومنون آیت ۱۴

البتہ ملک خدا سے انسان کے فائدے اٹھانے کی حدود، بیان کرنے میں بھی قرآن مجید نے گفتگو فرمائی ہے، چنانچہ ارضی موجودات کے بارے میں ارشاد ہوا:۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا [1]

وہ اللہ ہے جس نے زمین کی تمام مخلوقات کو تم (انسانوں) کے لئے خلق فرمایا ہے۔

اس آیت سے بکمال صراحت معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے انسانوں کو اجازت دی ہے کہ وہ زمین کی سطح اور گہرائی میں موجود تمام معاون ۔ تمام دریاؤں اور صحراؤں اور تمام جنگلوں اور حیوانوں غرضیکہ زمین کی تمام موجودات ومخلوقات سے اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق استفادہ کریں۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ [2]

کیا تم لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب کچھ تم (انسانوں) کے لئے مسخر کر دیا ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ [3]

اور اللہ نے تمام موجودات سماوی وارضی کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔

عجیب نکتہ یہ ہے کہ تمام موجودات جن کو خداوند عالم کی ملکیت قرار دیا گیا ہے، وہ سب کی سب انسان کے لئے تسخیر شدہ اشیاء میں بھی ذکر کر دی گئی ہیں۔ چنانچہ دونوں کا موضوع ایک ہے کہ آیات تسخیر میں بھی ''للہ ما فی السموات وما فی الارض'' کے الفاظ ذکر ہوئے ہیں۔

اجرام فلکی کی تسخیر

آسمانی اشیاء کی تسخیر کا جو مفہوم ہماری نظر میں یا جو کتب تفاسیر میں ملتا ہے وہ یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے اجرام فلکی کو انسانوں کی زندگی کے فائدے کے لئے مسخر اور مغلوب کر دیا ہے۔ سورج کی کرنیں جو نباتات اور حیوانات کی پرورش اور ان کی زندگی کی بقاء میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور ان کو کثیر فوائد بخشتی ہیں۔ یہ کرنیں متواتر زمین پر پڑتی رہتی ہیں اور انسان بھی مختلف شکلوں میں ان کے نور سے استفادہ کرتا رہتا ہے۔ چاند کی قوت جاذبہ دریاؤں اور سمندروں کے مدوجزر میں تنظیم پیدا کرتی ہے، اس کے نور سے تاریک رات روشن ہو جاتی ہے اور بشر اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ ستاروں سے لوگ صحراؤں اور دریاؤں میں راہنمائی حاصل کرتے ہیں اور اسی طرح ارضی موجودات کا ایک وسیع وعریض حصہ انسانوں کی بہرہ برداری کا مورد بنا رہتا ہے۔ ممکن ہے کہ ان اشیاء میں

---

[1] سورۂ بقرہ آیت ۲۹

[2] سورۂ لقمان آیت ۲۰

[3] سورۂ جاثیہ آیت ۱۳

سینکڑوں دیگر ایسے مفادات بھی موجود ہوں جنہیں انسان آج تک سمجھنے پر قادر نہ ہوا ہو۔ مختصر یہ کہ خداوند تعالیٰ نے تمام اجرام فلکی اور آسمانی وسعتوں میں پائی جانے والی اشیاء کو نوع بشر کے فائدے کے لئے کچھ اس طرح مسخر کر دیا ہے کہ انسان جانے انجانے میں ان کے منافع سے مستفید ہو رہا ہے۔

اختیاری استفادے

کیا ہمارے لئے یہ ممکن ہوگا کہ سماوی موجودات کی تسخیر کا مفہوم فقط ان مفادات تک محدود قرار دیں جو غیر اختیاری طور پر ان اشیا سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ کیا بشر کے لئے اجرا فلکی کی تسخیر کو اس قدر وسیع معنی میں نہیں لیا جا سکتا کہ جو اختیاری یا غیر اختیاری ہر دو قسم کے منافع کو شامل ہوں اور ان طبیعی ذخائر سے حاصل کئے جانے والے تمام منافع مراد ہوں؟

خداوند عالم نے دریاؤں اور سمندروں کو بشر کے لئے مسخر کیا تاکہ وہ ان کے فوائد سے بہرہ مند ہو۔ ان میں بعض فوائد بلا ارادہ و اختیار ہمیں حاصل ہو جاتے ہیں، مثلاً سورج دریاؤں پر چمکتا ہے تو پانی بخارات بن جاتا ہے۔ وہ فضاؤں میں جا کر بارش برسانے والے بادلوں کی شکل میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ پھر ہوا کے ذریعے یہ بادل ہماری فضاؤں کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں اور ہمارے کھیت جو سمندروں سے سینکڑوں کیلومیٹر دور ہیں، یہ بادل آ کر برستے ہیں وہ ان کھیتوں کو سرسبز و شاداب کر دیتے ہیں کہ جن سے ہماری زندگی کی بقاء و تسلسل کی ضمانت حاصل ہو جاتی ہے۔ ان عوامل میں سے کوئی ایک بھی ہمارے اختیار میں نہیں اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے تحت اس کے مقرر کردہ تکوینی قوانین کے مطابق خود بخود ہوتا رہتا ہے۔

ان غیر اختیاری مفادات کے مقابلے میں انہیں سمندروں کی تسخیر سے ہم اختیار مفادات حاصل کرنے پر بھی قادر ہیں اور یہ اس مہربان پروردگار کے فیض بیکراں کا نتیجہ ہے۔ ہم اپنی کوشش کے سائے میں ان ذخائر سے بہت زیادہ فائدے اٹھا لیتے ہیں، ان سمندروں کے پانی میں ہماری کشتیاں اور بحری جہاز وں رواں رہتے ہیں۔ ان کے ذریعے ہمارے اقتصادیات کا پہیہ گھومتا رہتا ہے اور اسی تجارتی عمل سے ہماری زندگی قائم و دائم ہے۔

وَهُوَ الَّذِىْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ
وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴿۱۴﴾[1]

سمندروں کی تسخیر

اس اللہ تعالیٰ نے سمندر کو مسخر کر دیا ہے تاکہ اس سے (مچھلیاں شکار کر کے) تم تازہ گوشت کی غذا کھاؤ۔ اور اس سے زیور (مروارید) نکال کر اپنے بدن پر سجاؤ۔ اور ان کے سینوں کو چیرنے والی کشتیاں ان میں دوڑاؤ۔ اور اپنے سامان کی حمل و نقل کے

---

[1] سورۂ نحل آیت ۱۴

ذریعے فضل الٰہی سے روزی پاؤ (تاکہ) اللہ تعالیٰ کے شکر گزار بنو۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْكُ فِیْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝۱۲ [1]

اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے تمہارے لئے سمندر کو مسخر کر دیا ہے تاکہ اس میں خدا حکم کے ساتھ کشتیاں دوڑاؤ۔ اور اس کے فضل سے روزی کماؤ۔ اور اس کا شکر ادا کرو۔

آسمانی وجودات سے فائدہ اٹھانے کو بھی ارضی موجودات کے منافع کی مثل قرار دیا جا سکتا ہے یعنی جس طرح اللہ تعالی کے تسخیری قانون سے انسان کو غیر اختیاری فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ اسی طرح ممکن ہے کہ انسان اپنی کوشش اور محنت کے ذریعے انہیں اجرام فلکی سے کچھ اختیار منافع حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہوجائے۔

افلاک کا سفر

انسان نے افلاک کی طرف سفر کرنے کا آغاز کر دیا ہے، وہ چاند کے کرے پر قدر رکھ چکا ہے اور اب وہ زہرہ و مریخ کی تسخیر کے خیال کو پروان چڑھا رہا ہے۔ آج انسان نے خلائی جہاز تیار کر لئے ہیں اور انہیں اس فضاء بسیط میں رواں کر رہا ہے۔ اس وقت زمین سے چاند تک آمد و رفت کر رہا ہے، چاند گاڑی کے ذریعے کرۂ مادہ پر اتر گیا اور اس کے پتھر لے آیا ہے تاکہ زمین پر ان کی تحقیق و تفتیش کرے۔

اب انسان نے ایک ایسی بیٹری ایجاد کر لی ہے جو سورج کی کرنوں سے توانائی ذخیرہ کر لیتی ہے۔ تاکہ اس کے ذریعے ایک طرف چاند کے سفر میں آلات کو چلایا جا سکے اور دوسری طرف زمین اور چاند کے مابین پیغام رسانی کا رابطہ برقرار رکھا جا سکے۔ پس انسان بیک وقت سورج اور چاند ہر دو سے اختیاری مفادات حاصل کر رہا ہے۔

تسخیر فضاء

خلاصہ یہ کہ آج انسان فضاؤں کی تسخیر میں اپنا ابتدائی قدم اٹھا چکا ہے۔ اور کچھ حد تک کامیابیاں حاصل کر چکا ہے۔ ممکن ہے کہ شاید آئندہ دو صدیوں میں وہ اس حد تک کامیابیاں حاصل کر لے کہ اب ان کا تصور کرنا بھی ناممکن ہو۔

خداوند تعالیٰ نے لوگوں کو ارضی سماوی ہر دو موجودات کی تسخیر کی نوید ایک ہی آیت میں سنائی اور فرمایا:

وسخر لکم ما فی السموات وما فی الارض

اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے وہ سب کچھ تسخیر کر رکھا ہے جو آسمانوں اور جو زمین میں ہے۔۔

---

[1] سورۂ جاثیہ آیت ۱۲

چونکہ آسمانوں اور زمین کے سارے موجودات کا مالک خداوند تعالیٰ ہے، اس لئے ان کی تسخیر کا مژدہ انسان کے لئے ایسا پروانہ ہے جو اس جہان کے مالک نے انسان کے فائدے کے لئے صادر فرمایا ہے۔ اس طرح اس نے انہیں اجازت دے دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اشیائے ملکیت میں خود محنت کریں اور رضائے الٰہی کی حدود کے اندر رہتے ہوئے ان سے خوب خوب فائدہ اٹھائیں۔

اجازۂ تکوینی

اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت تکوینی نہ ہوتا تو وسیع وعریض سمندروں میں کشتیاں صدیوں سے تیرنے پر کبھی قادر نہ ہو سکتیں، کیونکہ یہ سب سمندر خداوند عالم کی ملکیت ہیں۔ اسی طرح اگر خالق کائنات کی اجازت اور اس کا قانون آفرینش اس طرح کا نہ ہوتا تو آج یہ خلائی راکٹ اس امر پر قدرت نہ پاتے کہ اس وسیع فضاء میں پرواز کریں، کیونکہ فضائیں بھی حق تعالیٰ کی ملکیت ہیں۔

اگر رب العزت کی اجازت نہ ہوتی تو بشر کے لئے ماضی یا حال میں عمق دریا میں غوطے لگا کر موتیوں اور مروارید کو نکالنا ممکن نہ ہوتا۔ اسی طرح خداوند تعالیٰ کا تکوینی اذن نہ ہوتا تو آج کا انسان چاند کے کرے پر اترنے اور وہاں سے پتھر اور کنکر لیکر واپس زمین پر آنے پر قادر نہ ہوتا۔ مختصر یہ کہ انسان ارضی وسماوی موجودات کے متعلق جس قدر کامیابیاں حاصل کر چکا ہے یا مستقبل میں حاصل کرے گا، یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسخیر کر دینے اور اس کے اجازۂ تکوینی کا نتیجہ ہے۔

انسان کا تجسس

فرزند آدم طبعی طور پر متجسس پیدا ہوا ہے، اس کی خواہش ہوتی ہے کہ طبیعی حوادث کے علل واسباب سے واقف ہو جائے اور اسے ہر حادثے کی وجہ معلوم ہو جائے۔ انسان کی عقل، فکر، ہوش اور دیگر خداداد صلاحیتیں اس کی جستجو اور تلاش کی خواہش کو پورا کرنے میں بڑی معاون ثابت ہوتی ہیں اور اسرار خلقت پر آگاہی حاصل کرنے میں اس کے کام آتی ہیں۔

انسان ایک لمبے عرصے سے اس کتاب کے مطالعے میں لگا ہوا ہے، اس لئے بہت سے پوشیدہ حقائق کی شناخت حاصل کرنے اور ناشناخت رازوں پر سے پردہ اٹھانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ چنانچہ یہ قوانین تکوینی کو سمجھنے میں جتنی ترقی کرتا گیا، اسی نسبت سے ارضی وسماوی موجودات سے فائدہ اٹھانے میں بھی آگے بڑھ گیا ہے۔ اس طرح ''ملک خداوند تعالیٰ'' میں اس کے تصرفات کی حدود میں بھی اسی قدر وسعت آتی گئی ہے۔

انسان کا یہ مطالعہ کائنات ابھی ختم نہیں ہوا اور اس کی عملی تحقیقات آگے بڑھ رہی ہیں۔ بہت سی باتیں جو آج تک معلوم نہیں ہیں، وہ کل معلوم ہو جائیں گی۔ پس اسی نسبت سے انسان کا زمین وآسمان کی موجودات پر تسلط بھی بڑھتا جائے گا۔

علم وصنعت کی قدرت

آج کا انسان اپنے علم وصنعت کے بل بوتے پر زمین وہوا اور سمندر کی سطح وعمق پر غلبہ حاصل کر چکا ہے، طبعی ذخائر ومعاون

پر اختیار حاصل کئے ہوئے ہے اور اب اس کی نگاہیں اجرام فلکی پر لگی ہوئی ہیں۔ انسان زمین میں اللہ تعالیٰ کے ودیعت کردہ گونا گوں خزانوں کو اپنے قبضہ قدرت میں لے چکا ہے، اس ذات کو عطا کردہ تسخیری قوت سے خوب فائدہ اٹھا رہا ہے اور پروردگار کی ملکیت میں اپنی کارگزاریوں کے میدان کو بہت وسیع کر چکا ہے۔ لیکن افسوس کہ انسانوں کی اکثریت نے ملکیت خدا میں تصرف کرنے کے باوجود مالک کو بھلا دیا اور مخلوقات خدا سے فائدہ اٹھانے کے باوجود خالق کو فراموش کر چکے ہیں۔ کئی انسان تو ایسے بھی ہیں جو اپنی علمی اور صنعتی کامیابیوں پر اس قدر مغرور ہو چکے ہیں کہ نہ فقط یہ کہ خود اپنے خالق کی پرستش و عبادت کی بات تک نہیں کرتے بلکہ دوسرے لوگوں سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان کی پوجا کریں اور ان کے سامنے بندگی سر جھکائیں۔

بشر کا علمی غرور

رسل کہتا ہے: بشر خدا نہیں ہے اور ممکن ہے کہ تو میری اس بات پر خفا ہو کر چلائے اور کہے کہ میں نے تو انسان کے بارے میں کبھی یہ سوچا تک نہیں ہے۔ اے قاری! بے شک تو ان لوگوں میں سے نہیں ہے جنہیں آج کا شدید جنون دامن گیر ہو چکا ہے۔ کیونکہ اگر تو ان لوگوں میں سے ہوتا تو میری کتاب کے قارئین ہی میں نہ ہوتا۔ لیکن اگر تیری نگاہ پولیٹ بیورو یا امریکہ کے ٹیکنوکریٹس پر پڑے تو تجھے معلوم ہو جائے گا کہ کچھ ایسے انسان بھی ہیں جو خداوند تعالیٰ پر اعتقاد رکھنے سے بھاگتے ہیں اور حقیقتاً خود کو تخت خدائی پر بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ [1]

دین اسلام نے انسانوں کو اس کتاب آفرینش کا مطالعہ کرنے اور اس میں غور و فکر کرنے کی تشویق فرمائی اور اس کو اسلام کی عظیم ترین عبادات میں شمار کیا ہے مکتب اسلام نے لوگوں پر فرض قرار دیا ہے کہ وہ کائنات کے اس حکیمانہ نظام کی معرفت حاصل کرنے میں اپنی عقل استعمال کریں۔ وہ اس منظم جہان کے اسباب و مسببات اور علل و معلومات کے بارے میں غور و فکر کریں تا کہ اس جہان کے اسرار و رموز پر آگاہ ہونے سے ان کے خالق کی قدر و عظمت پر آگاہ ہو سکیں۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا ﴿۱۲﴾ [2]

وہ اللہ جس نے سات آسمان اور ان کی مثل زمین خلق فرمائے ہے۔ وہ ان کے درمیان اپنا حکم نافذ فرماتا ہے۔ تا کہ (اس جہان میں غور و فکر کے ذریعے اس کے خالق کی عظمت کو سمجھو اور) جان لو کہ اللہ تعالیٰ ہر شئی پر قادر ہے۔ اور وہ خداوند تعالیٰ اپنے علمی احاطے میں ہر اس شئی کو لئے ہوئے ہے جو اس جہان میں ہے۔

بشر آج بھی کتاب کائنات کے مطالعہ میں سرگرم ہے اور اپنی تحقیق و جستجو میں مشغول رہتا ہے۔ اب تک جو ترقی ہوئی وہ

[1] امید ہای نوص ۴۲

[2] سورۂ طلاق آیت ۱۲

اس کا ئنات کی مخلوقات میں غور وفکر کرنے اور اس عالم طبیعت کے علل و معلومات پر آگاہ ہونے ہی کی مرہون منت ہے۔ آج بشر کی یہی کوشش ہے۔ کہ حتی القدور عالم طبیعت کے تاریک گوشوں کو اپنے علم وتحقیق کے نور سے روش کرے اور کائنات کے ناشناختہ اسرار ورموز کے چہرے سے نقاب الٹ دے۔ تاکہ اس ترقی وکمال کی راہ میں ایک قدم اور آگے بڑھائے اور نوبونو کامیابیاں اس کا مقدر بن جائیں۔

اسلامی ثقافت اور جدید ثقافت

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی ثقافت اور جدید ثقافت دونوں کتاب خلقت کا مطالعہ کرنے اور اس میں غور وفکر کرنے کی حامی ہیں اور لوگوں کو شوق دلاتی ہیں کہ وہ اس جہان آفرنیش میں اپنی عقل وفکر کو استعمال کریں۔ لیکن ان دونوں ثقافتوں میں فرق یہ ہے کہ مکتب اسلام کے پیروکار اور خدا پرست (الٰہیون) جہان مخلوق میں تحقیق کے ساتھ ساتھ خالق کی عظمت پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ وہ اس کائنات کے حکیمانہ اسرار اور دقیق قوانین پر آگاہ ہونے کے ذریعے ان کے خالق پر ایمان لے آتے ہیں اور اس دائم قدرت کے سامنے سر تعظیم خم کردیتے ہیں۔ ہاں مادہ پرست لوگ ان جہان کی اشیاء میں تحقیق تو کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ان کے خالق کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ وہ اس عالم طبیعت کے علل ومعلومات کی تلاش تو کرتے ہیں لیکن ان کے بانی اور اس طبیعت کے خالق کے بارے میں بات تک نہیں کرتے۔

اب اگر کوئی سوال کرے کہ حق تعالی کی طرف توجہ کئے بغیر کتاب خلقت کا مطالعہ کرنا اور حق تعالی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اس کا مطالعہ کرنا۔ ان دونوں میں کیا فرق ہے؟ بالفاظ دیگر عالم کائنات میں غور وفکر کرتے ہوئے اسرار گیتی کی واقفیت پانا تو بلندی اور ترقی کا موجب ہے، کیا ایمان باللہ کے ساتھ ترقی اور بغیر ایمان باللہ کے ترقی میں باہم فرق ہے؟ اگر فرق ہے تو یہ فرق فقط نفسیاتی پہلو رکھتا ہے یا عملاً زندگی پر اثر انداز بھی ہوتا ہے۔؟

بے عیب ترقی

اس سوال کا جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ خالق کی طرف توجہ کرتے ہے مخلوق کا مطالعہ اس عالم ہستی کے حکیمانہ نظام کی توجیہ میں علمی واقعیت پسندی ہے اور مخلوقات عالم کے خالق کا اعتراف کرتے ہوئے ان سے فائدہ اٹھانا اس پیدا کرنے والے خدا کے حق میں انسانی اور اخلاقی حق پسندی ہے، لیکن ان دونوں معنوی پہلوؤں سے منہ پھیرنا ایک غیر اخلاقی حرکت ہے۔ ہم کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہوئے ترقی کرنا ایک صحیح اور بے عیب ترقی ہے اور انسانی زندگی پر دو طرح سے اثر انداز ہوتی ہے۔ ان دونوں جہتوں کی تفصیل ہم ذیل میں بیان کئے دیتے ہیں۔

اول: ایک الٰہی انسان جو تمام ارضی وسماوی موجودات کو مخلوق ومملوک خدا مانتا ہے۔ وہ اپنے لئے لازم جانتا ہے کہ ہمیشہ اس

ذات حق کی اطاعت کرے اور اپنے تمام معمولات زندگی میں بلاقید وشرط اس کا مطیع رہے۔ وہ اپنی حدود سے آگاہ ہوتا ہے اور اپنے خالق و مالک کی ملکیت میں اس کی دی ہوئی اجازت کے مطابق تصرف کرتا ہے۔ وہ اپنی خداداد طاقتوں کو لوگوں کی خدمت میں صرف کرتا ہے اور اپنی توانائیاں راہ ظلم و جرم میں خرچ نہیں کرتا۔ وہ ہمیشہ جائز اقتصادی ذریعہ اختیار کرتا ہے اور چوری یا دیگر بری حرکتوں سے پرہیز کرتا ہے۔

ایسا انسان کسی روز اپنی علمی تحقیق وتلاش کے ذریعے ایٹم کو مسخر کرنے میں کامیاب ہوجائے تو بھی خداوند عالم کی دی ہوئی اجازت کے مطابق استعمال کرتا ہے۔ مثلاً بیماروں کا علاج کرنے۔ شہروں میں روشنی مہیا کرنے۔ بحری جہازوں کو چلانے۔ ہوائی جہازوں کو اڑانے۔ کلوں کو متحرک رکھنے۔ غرض یہ کہ وہ اس قوت کو ایسے امور میں صرف کرتا ہے جن سے لوگوں کو رفاہ اور آسائش حاصل ہو۔ وہ ایٹمی توانائی کو خالق کی رضا کے خلاف آبادیوں کو تباہ کرنے۔ اجتماعی قتل و غارت بپا کرنے۔ بچوں۔ بوڑھوں۔ مردوں۔ عورتوں۔ بیماروں۔ تندرستوں سب کو یکبارگی نابود کرنے میں ہرگز استعمال نہیں کرتا۔

بندگی پروردگار

عبادت کے لغوی معنی عابد کا اپنے معبود کے سامنے تضرع و تذلل کرتے ہوئے اس کی اطاعت کرنا ہے۔ قرآن مجید نے سب انسانوں کو پروردگار عالم کی عبادت و بندگی کی دعوت دی اور ان پر فرض عائد کیا ہے کہ وہ اس مقدس عمل کو بجالائیں۔ عجیب بات ہے کہ اسلام کی اس آسمانی کتاب نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کو اس کے خالق ہونے سے مربوط کیا اور لوگوں کو عبادت خدا کی دعوت دیتے وقت اس عالم کائنات کی خلقت کا تذکرہ فرمایا ہے، درحقیقت وہ اس یاددہانی میں اللہ کی عبادت کے علل و اسباب کی توجیہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾ [۱]

اے انسانو! اپنے اس پروردگار کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور جو تم سے پہلے تھے انہیں پیدا کیا۔ تاکہ تم باتقویٰ ہوجاؤ۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَىْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۱۰۲﴾ [۲]

وہ وہی اللہ ہے جو تمہارا پروردگار ہے۔ اس کے علاوہ کوئی قابل عبادت نہیں۔ وہی ہر شئی کا خلق ہے۔ لہٰذا انسانو! تم فقط اسی کی عبادت کرو کہ وہی (کائنات) کی ہر شئی کا نگہبان ہے۔

---

[۱] سورۂ بقرہ آیت ۲۱

[۲] سورۂ انعام آیت ۱۰۲

عبادت کا وسیع معنی

اس نکتے کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری ہے۔ کہ اسلام کے آسمانی مکتب میں عبادت فقط چند عبادی فرائض کو انجام دینے تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ اس لفظ کے معنی میں بہت وسعت ہے۔ چنانچہ اولیاء کرام نے اس کا عقلی۔ فکری۔ اقتصادی اور اجتماعی تمام امور پر اطلاق فرمایا ہے، یہاں بطور نمونہ چند ایک روایات پیش خدمت ہیں۔

قال علی علیه السلام فیما اوصی به الحسن (ع) لا عبادة کالتفکر فی صنعة الله عزوجل [1]

امام علی علیہ السلام نے امام حسن علیہ السلام کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا:۔ مخلوقات الٰہی میں غور و فکر کرنے (اور ان کا مطالعہ کرنے) کی مثل کوئی عبادت نہیں۔

عن موسی بن جعفر علیهما السلام قال: یا هشام کان امیرالمومنین علیه السلام یقول: ما عبدالله بشیئی افضل من العقل [2]

عقلی عبادت

حضرت امام موسیٰ بن جعفر علیہما السلام نے ہشام سے فرمایا:۔ امام علی علیہ السلام فرمایا کرتے تھے کہ خداوند تعالیٰ کی عبادت عقل سے بہتر کسی شئی کے ذریعے نہیں کی گئی۔

عن علی علیه السلام: افضل العبادة الفکر ا [3]

امام علی علیہ السلام نے فرمایا:۔ ہر عبادت سے افضل عقل و فکر کو کام میں لانا ہے۔

عن ابی جعفر علیه السلام قال: قال رسول الله (ص) العبادة سبعون جزءً افضلها طلب الحلال [4]

امام محمد باقر علیہ السلام نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا:۔ عبادت کے ستر اجزاء ہیں اور ان میں سے افضل حلال روزی کمانا ہے۔

---

[1] سفینۃ البحار "فکر" ص ۳۸۲

[2] الکافی ج ۱ ص ۱۸

[3] فہرست غرر ص ۳۱۴

[4] الکافی ج ۵ ص ۷۸

عن موسی بن بکر قال قال ابوالحسن الاول علیه السلام: من طلب ھھذا الرزق عن حلہ لیبعود بہ علی نفسہ وعیالہ کان کالمجاھد فی سبیل اللہ[1]

موسیٰ بن بکر نے حضرت امام موسیٰ ابن جعفر علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا:۔ جو کوئی حلال روزی کمانے جاتا ہے تا کہ اپنے اور اپنے عیال کے اخراجات کما لائے تو اس کا اجر دربار الٰہی میں راہ خدا کے مجاہد کی مثل ہے۔

ان تمام روایات سے بخوبی یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اسلام میں عبادت کا مفہوم کس قدر وسیع ہے۔ایک باایمان فرد کے لئے ممکن ہے کہ وہ بعنون عبادت اس کتاب کائنات کا مطالعہ کرے اور اسرار آفرینش پر اطلاع پانے سے جہاں علمی ومعنوی طور پر ترقی و کمال کا درجہ پائے وہاں دربار الٰہی میں بھی ماجور ہو۔ کیونکہ وہ خداوندتعالیٰ کا بندہ اور مملوک ہے اور بعنوان عبادت کا فریضہ ہے کہ اپنی ترقی یافتہ علمی اور فکری صلاحیتوں کو فقط مشروع اور جائز امور میں صرف کرے۔لیکن ہر ایسی راہ جو خداوند عظیم کی پسندیدہ نہیں، وہ ان صلاحیتوں کو اس میں بروئے کار نہ لائے اور خد کو رب العزت کی سزاؤں کا مستحق نہ بنائے۔

اقتصادی مصروفیات

ایک مومن فرد کے لئے یہ بھی ممکن ہے کہ عبادت کی نیت سے اقتصادی امور میں مصروف عمل ہو۔ وہ اپنی محنت و کاوش کے ساتھ دولت حاصل کرے، باعزت زندگی گزارے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی مستحق اجر وثواب قرار پائے۔ چونکہ وہ مومن اپنے آپ کو حق تعالیٰ کا مملوک اور اپنی دولت کو خداوندتعالیٰ کی ملکیت سمجھتا ہے۔لہٰذا وہ پابند ہے کہ اپنے سرمائے سے فقط مشروع اور جائز منافع حاصل کرے، اسے ناروا امور میں خرچ نہ کرے اور اپنے آپ کو پروردگار عالم کی ناراضی کا مستحق نہ بنائے۔

جامع عبادت

خلاصہ یہ کہ اسلام میں عبادت ایسی چیز ہے جو ایک طرف سے لوگوں کی عقلی، علمی، فکری، عبادی، اخلاقی، اقتصادی، اجتماعی اور دیگر تمام مدارج کے اعتبار سے متحرک اور فعال بناتی ہے۔ دوسری طرف وہ ترقی کو اطاعت پروردگار کی چاردیواری کے اندر محدود کر دیتی ہے، یعنی وہ ترقی کو معاشرے کی سعادت ومصلحت کے لئے وقف کر دیتی ہے۔عبادت یہ اجازت نہیں دیتی کہ تمام مادی یا معنوی سرمائے غیر صحیح اور غیر مشروع مقامات پر کام میں لائے جائیں۔ یہ عبادت کا ایک جامع مفہوم ہے، اور اس سے بے عیب ترقی ہوتی ہے اور قرآن کریم کی اس آیت شریفہ کا بھی یہی مطلب ہے:

---

[1] قرب الاسناد ص ۱۴۶

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ﴿٥٦﴾[1]

اور میں نے جنات اور انسانوں کو نہیں خلق فرمایا مگر اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں

جولوگ مادی فکر رکھتے ہیں، وہ اس کائنات کو ایک اتفاقی حادثے کی پیداوار سمجھتے ہیں اور اس کے لئے ایک عالم وحکیم وخالق کے قائل نہیں ہیں۔ اسی طرح وہ لوگ جو اس کائنات کے خالق کو اس کی آفرینش کی توجیہ کے لئے ایک تصور کے طور پر تسلیم کرنے لگے ہیں، لیکن خود کو اس خالق کی اطاعت کا پابند بنانا ضروری نہیں سمجھتے۔ ایسے لوگوں کے طرز تفکر کو الٰہیون اور باایمان خدا پرستوں کے گروہ کے مقابلے میں لانا درست نہیں ہے۔

باایمان گروہ کی برتری

باایمان لوگ تو خود کو اور اس سارے جہان کو پروردگار کی ملکیت مانتے ہیں اور اپنے آپ کو اس خداوند متعال کے سامنے جواب دہ سمجھتے ہیں۔ جب کہ اول الذکر دونوں گروہ نہ تو اس جہان کو مملوک خدا مانتے ہیں اور نہ خود کو جواب دہ سمجھتے ہیں۔

باایمان گروہ ہمیشہ متوجہ بخدا ہوتا ہے اور اس کی متواتر یہی کوشش ہوتی ہے کہ اپنے سارے اعمال اسذات کی رضا کے مطابق انجام دے۔ لیکن وہ دونوں گروہ اپنے طبعی میلانات کے تابع رہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اپنی خواہشات پوری کرنے میں کامیاب رہیں اور انہیں عملی جامہ پہنانے میں عاجز نہ رہیں۔

چونکہ خداوند متعال ظلم وستم اور فساد وتباہی کو پسند نہیں کرتا، اس لئے باایمان گروہ کبھی یہ پسند نہیں کرتا کہ اپنی علمی صلاحیتوں اور طبیعی سرمایوں کو ظلم وفساد کی راہ میں صرف کردے اور اپنے خالق کی پسند کے برخلاف اپنے آپ کو بدی اور ستم گاری سے آلودہ کردے۔

چونکہ آدمی کے غرائز اندھے بہرے ہوتے ہیں۔ شہوت وغضب کے میلانات اور اپنے آپ کو برقرار دینے کے جذبات عدل وانصاف اور تقویٰ وفضائل کی بات سننے پر راضی نہیں ہوتے۔ اس لئے وہ پہلے دونوں گروہ اپنے نفسانی خواہشات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ظلم وستم کرنے میں بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اپنے دامن کو انسانیت دشمن اعمال کے داغ سے داغدار کرنے میں بے پروا نظر آتے ہیں۔

دور حاضر کے انسان نے علمی تحقیقات اور اسرار آفرینش کی اطلاعات میں عظیم کامیابیاں حاصل کی ہیں اور اس راستے میں بلند ترین مدارج تک جا پہنچا ہے۔ اس نے عقل ودانش کی طاقت کے ذریعے عالم طبیعت پر غلبہ پالیا ہے اور زمین کی اشیاء کو مسخر کر لیا ہے۔ آج کے بشر نے مشیری اور صنعت کی طاقت سے مختلف عناصر طبیعت کو اپنے قبضے میں لے لیا ہے اور اپنی زندگی کو بہتر بنانے او ر زیادہ آسائش مہیا کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ لیکن بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان سب باتوں کے باوجود یہ ترقی اور یہ

---

[1] سورۂ ذاریات آیت ۵۶

کامیابی اس کی خوش بختی اور سعادت کا موجب نہیں بن سکی اور اس کے لئے قلبی اور فکری اطمینان مہیا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔

جرائم کا سرچشمہ

آج کے انسان کی زندگی بے چینی۔ اضطراب اور دیگر گوناگوں مصائب اور آلام سے پرنظر آتی ہے۔ جنگ و خونریزی۔ جرم و جنایت، جارحیت و تجاوز اور طاقتوروں کا کمزوروں پر جبر و تسلط ایسے امور ہیں جن کے سبب انسان رنج و غم۔ ناراحتی و بے اطمینانی کا پیکر بن گیا ہے اور تقریباً تمام اقوام بالواسطہ یا بلاواسطہ ان مصیبتوں سے دوچار دکھائی دیتی ہیں۔

ان تمام مصائب کی بنیاد علم و دانش یا یونیورسٹیوں کی کمی نہیں اور نہ ہی مال و ثروت یا صنعت و حرفت کی قلت ہے۔ بلکہ ان تمام جرائم و مظالم کا سرچشمہ ایمان کی کمی ہے اور خداوند تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہونے کے احساس کا فقدان ہے۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا[1]

جو کوئی بھی میری یاد سے منہ پھیر لے گا وہ معاشی تنگی و سختی سے ضرور دوچار ہوگا۔

اس سے بڑھ کر اور کیا تنگی ہو سکتی ہے کہ اس جہان کی زیادہ ترترقی یافتہ اقوام زندگی کے عالی ترین وسائل کی مالک ہیں اور بہترین نعمتیں ان کو حاصل ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ بے اطمینانی اور ناراحتی میں زندگی بسر کرتی ہیں، قلب کو غم اور خوف سے امان نہیں۔ اغوا۔ قتل۔ خودکشی۔ چوری۔ ڈاکہ زنی۔ ناکامی۔ شکست۔ اور اس طرح کے دیگر مصائب اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کی زندگی کو تلخ بنائے ہوئے ہیں۔ اب نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ وہ چند گھنٹے آرام کی نیند سونے کے لئے بھی خواب آور گولیوں کی مدد کے محتاج ہو گئے ہیں۔ ان کی زندگی میں یہ تلخیاں اور سختیاں فقط اس لئے ہیں کہ آج کے انسان نے اپنے خدا سے منہ موڑ دیا ہے اور وہ خود کو اس کے سامنے جواب دہ نہیں سمجھتا۔ اس دنیا کے انسانوں کی اکثریت کا یہ حال ہے کہ خداوند تعالیٰ کی بندگی سے انکار کر کے خواہش نفس کی غیر مشروط بندگی اختیار کر بیٹھے ہیں۔ جاہ طلبی۔ برتری کی تلاش۔ شہوت و غضب کی کشش اور دولت کی طرف میلان نے ان کو اس طرح اپنا غلام بنا لیا ہے کہ اب وہ غرائز و خواہشات کو سیر کرنے کے لئے کسی قسم کی خیانت کی پرواہ نہیں کرتے۔ وہ اپنی نفسانی چاہتوں کے حصول میں ہر انسان دشمن حرکت اور ہر گناہ کے مرتکب ہوئے جاتے ہیں۔ اپنی علمی اور صنعتی پیش رفت کی وجہ سے جو ترقی و کمال انہیں نصیب ہوا تھا، وہ اپنی پوری درخشندگی اور وسعت کے باوجود ایک عیب دار ترقی۔ بے راہ روی اور خودسری کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ یہ ایک ایسی ترقی ہے جو اپنی تمام توانائیوں سمیت حیوانی غرائز و شہوت کی خدمت کے لئے وقف ہو چکی ہے۔ اس میں ایمان و حقیقت۔ حق و فضیلت۔ انصاف و عدالت اور اس قسم کے دیگر تمام انسانی خصائل و کمالات کا نام و نشان تک نہیں ہے۔

---

[1] سورہ طٰہٰ آیت ۱۲۴

نادرست ترقی

آج کے بشر نے اپنی صنعتی ترقی کے سائے میں بہت بڑی قدرت وطاقت حاصل کر لی ہے۔اگر یہ چاہے تو بہت تھوڑی مدت میں اس زمین کو لوگوں کی آسائش کے لئے آباد کرلے اور بھوک۔ بیماری۔ جہالت اور بدبختی کا مقابلہ کر کے ان کا خاتمہ کر دے۔ لیکن افسوس کہ بشر کی یہ عظیم طاقت چونکہ ایمان بہ خدا اور عدل وانصاف کے ماتحت نہیں ہے،اس لئے صحیح راستے پر گامزن نہیں ہوسکی۔ اس طاقت کا بہت بڑا حصہ اندھے بہرے حیوانی جذبات اور خودسر وجاہ طلب خواہشات نفسانی کے قابو میں ہے۔اسی لئے صنعتی میدان میں تباہی پھیلانے والے کیمیاوی مواد اور آدم کش اسلحے سب سے زیادہ ترقی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

ڈاکٹر برنارڈ ڈیکسون کہتا ہے یہ بات ناقابل تصور ہے کہ علم وصنعت کے مختلف شعبوں میں سے کسی شعبے نے آدم کشی والے اور نرم الفاظ میں (جنگ) والے شعبے سے زیادہ ترقی کی اور سے زیادہ تیکنیکی کام کیا ہو،حق بات یہ ہے کہ آج کی جنگ الیکٹرونک جنگ ہے اور اس کے تمام منصوبے،اقدامات اور فیصلے انسان کی بجائے مشینری انجام دیتی ہے۔اس جنگی نظام کا نقص یہ ہے کہ یہ اندھا ہے، یعنی یہ طریقہ جنگ ایک جنگجو فوجی او بے ضرر بچے کے درمیان فرق نہیں کرسکتا او نہ کسی بوڑھے اور مریض یا دوست دشمن کے درمیان تمیز کرسکتا ہے، بالفاظ دیگر یہ طریقہ جنگ سب کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہے اور ایک ہی الیکٹرونی دماغ کے ساتھ قتل کر دیتا ہے۔پس ایسے طریق جنگ کے اثرات کسی سے مخفی نہیں رہ سکتے۔ [۱]

امن وامان

بشری زندگی میں سعادت کا رکن امن وامان کا قائم رہنا ہے، کیونکہ امن کے ماحول ہی میں مختلف علمی۔ اقتصادی۔ صنعتی۔ اجتماعی اور اخلاقی سرگرمیاں جاری رہتی ہیں۔امن ہی کے سائے میں عوامی استعدادیں صحیح سمت میں آگے بڑھتی ہیں اور معاشرہ ترقی و تکامل کی راہیں طے کرتا ہے۔

اللہ تعالٰی پر ایمان رکھنے والے اور دین اسلام کے پیروکار ہمیشہ ایمان اور الٰہی تعلیمات کے سائے میں امن تلاش کرتے ہیں۔ جب دین وایمان کا سرمایہ موجود ہوتو امن اور اطمینان قلب خودبخود حاصل ہوجاتا ہے، کیونکہ متدین افراد میں سے کوئی بھی کسی دوسرے فرد پر تجاوز کو جائز نہیں سمجھتا۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۸۲﴾ [۲]

جو لوگ (اللہ تعالٰی) پر ایمان رکھتے ہیں اور اپنے ایمان کو ظلم وستم سے آلودہ نہیں کرتے انہیں کے لئے امن وآرام ہے اور

---

[۱] روزنامہ کیہان شمارہ ۸۶۲۶

[۲] سورۂ انعام آیت ۸۲

وہی ہدایت یافتہ ہیں۔

قال امیر المومنین علیه السلام: من استحکمت لی فیه خصلة من خصال الخیر احتملته علیها واعتفرت فقد ما سواها ولا اغتفر فقد عقل ولا دین لان مفارقة الدین مفارقة الامن فلا یتهنا بحیاة مع مخافة وفقد العقل فقد الحیاة ولا یقاس الا بالاموات[1]

بے دینی اور بدامنی

امام علی علیہ السلام نے فرمایا:۔ جو شخص میرے طریقے کی پیروی میں اپنے اندر پسندیدہ صفات پیدا کرے اور اس کو پختہ کرے تو میں اس کو ایک خصلت کے ساتھ قبول کرلوں گا اور اس کے دیگر اچھی صفات سے محروم ہونے سے چشم پوشی کرلوں گا۔ لیکن بے عقلی اور بے دینی میرے ہاں قابل معافی نہیں ہے اور میں اس سے کبھی چشم پوشی نہیں کرسکتا، کیونکہ بے دینی بدامنی کی بنیاد ہے اور زندگی بغیر امن کے تلخ اور ناگوار ہے۔ بے عقلی گویا انسانی زندگی سے محروم ہوجانا ہے۔، کیونکہ ایک بے عقل انسان کا مردوں کے علاوہ کسی پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔گروہ مومنین کی نگاہ میں جو امن انسانیت کی بلندیوں کے عین مطابق ہے، وہ وہی امن ہے جس کی بنیاد پر ایمان بہ خدا اور اس کے سامنے احساس جواب دہی پر قائم ہو۔یہی وہ امن ہے جس کا بہت بڑا حصہ اس انصاف وعدال اور حق وفضیلت کے اجرا سے مربوط ہوتا ہے جس کا حصول اخلاقی وجدان اور سلیم فطرت کے احیاء ہی سے ممکن ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ امن جو ایک عقل مند انسان کی شان کے لائق ہے، وہ ہی امن ہے جو فرض شناسی اور انسانی کمال پر توجہ دینے سے پیدا ہوتا ہے کہ جس سے ہر پستی سے دور رہا جاسکتا ہے۔

مادیون کا گروہ یعنی وہ لوگ کہ جو اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتے، خالق کائنات کے سامنے جواب دہی کا احساس نہیں رکھتے اور خود کو اپنے تمام اعمال پر آزاد تصور کرتے ہیں۔ وہ عالمی بہبود کی حفاظت۔امن وامان کے قیام، دوسروں کے معاملات میں عدم مداخلت اور اپنی برتری وفوقیت کے تحفظ کے لئے سب سے بڑھ کر آگ اور خون کی بات کرتے ہیں۔ان کا بھروشہ ہمیشہ تباہی اور بربادی پھیلانے کی طاقت پر ہوتا ہے اور جس قدر علمی اور طبیعی اثاثہ ان کے اختیار میں ہے، وہ اسے جدید ترین اسلحے بنانے اور شہری آبادیوں کو تباہ کرنے والے ہتھیاروں کی تیاری میں استعمال کرتے ہیں۔ وہ اسی دوڑ میں اپنے حریفوں سے آگے بڑھتے رہتے ہیں تا کہ اسلحہ سازی کے مقابلے میں ان پر اپنی برتری برقرار رکھیں۔

جو امن اس طرح سے حاصل ہوتا ہے وہ ایک غیر مقدس اور خون آلود امن ہے کہ خوف ودہشت کی پیداورار ہوتا ہے۔ ایسا امن درندوں کی دنیا کے لائق تو ہوسکتا ہے،لیکن عقل منداور فرض شناس انسانوں کی شان کے لائق کبھی نہیں ہوسکتا۔لیکن بدقسمتی

---

[1] الکافی ج ا ص ۲۷

سے آج کی دنیا اس اخلاقی پستی وگراوٹ کا شکار ہو چکی ہے اور اس بداخلاقی کے لازمی نتیجے کے طور پر مسلسل بدامنی کے رنج والم میں پھنستی جا رہی ہے۔

ادارہ اقوام متحدہ

اقوام متحدہ کے ایک خصوصی کمیشن نے اعلان کیا کہ اس سال پوری دنیا کا فوجی بجٹ دو کھرب ڈالر تک جا پہنچا ہے جو پوری دنیا کے خام مال کی پیداوار کا ۶ء۵ فیصد ہے۔

یہ اندازہ اقوام متحدہ کی اس رپورٹ میں پیش کیا گیا ہے جس میں اقتصادی۔ اجتماعی۔ اور اسلحہ سازی میں مسابقت اور فوجی اخراجات کے اعداد وشمار پیش کئے گئے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ یہ مقدار ان اخراجات کا اڑھائی گناہ ہے جو پوری دنیا میں صحت وتندرستی کی مد میں خرچ ہوتے ہیں۔

اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء تک کے عشرے میں عالمی حکومتوں نے بیس کھرب نوے ارب ڈالر اسلحہ بازی کے مقابلے میں خرچ کئے ہیں۔ اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ گزشتہ ادوار میں سے کسی دور میں ایسا نہیں دیکھا گیا کو حکومتوں نے امن کے زمانے میں اس قدر بھاری بھرکم رقوم جنگی ہتھیاروں پر خرچ کی ہوں۔ [1]

آج کی ترقی یافتہ دنیا حیرت انگیز تیزی کے ساتھ فساد، تباہی اور انسان دشمن منصوبوں کی طرف بڑھ رہی ہے اور ترقی یافتہ ممالک ہر روز اس راہ میں ایک نیا قدم اٹھاتے ہیں۔ علمی اور صنعتی ترقی سے جو نتائج برامد ہوئے اور اسطرح انسان کے مقدر میں جو کامیابی لکھی گئی ہے، اس کا ایک بہت بڑا حصہ ان ہتھیاروں کی تیاری پر خرچ ہو رہا ہے جو انسان کو اجتماعی طور پر تباہ اور نابود کرنے کے کام آتے ہیں۔

خوف وہراس پھیلانے کا مقابلہ

فرانس کے مطابق وزیر دفاع ''زول موک'' نے اقوام متحدہ کی پچیسویں سالگرہ اور وسائل جنگ کی ترقی کے ایک سیمینار میں یوں کہا: خوف ووحشت کا توازن ہی آج کل امن کا ضامن ہے، اقوام متحدہ کی ۲۵ سالہ زندگی دو قسم کے اہم واقعات سے مرکب ہے، ایک تو فنی ترقی کے ذریعہ اجتماعی تباہی کی طرف پیش رفت میں تندی وتیزی۔ دوسرے صلح وامن اور بالخصوص تخفیف اسلحہ کی گفتگو میں عدم دلچسپی اور سستی۔ سربراہان حکومت ایک طرف سے تباہ کن سائنسی معلومات کے دباؤ میں ہیں اور دوسری طرف اس کوشش میں مصروف ہیں کہ مہلک اسلحہ کے استعمال سے پرہیز کریں اور باہمی اختلافات کو مصالحانہ انداز سے حل کریں یا کم از کم ان میں اضافہ نہ ہونے دیں۔

---

[1] روزنامہ اطلاعات شمارہ ۱۳۶۴۰

بایں ترتیب ایک بے مقصد دنیا وجود میں آئی ہے کہ جس میں حکومتیں بے سود اپنے آپ کو تھکانے میں مصروف ہیں۔ کیونکہ یا تو صلح آمیز کوششوں پر خود کو قربان کر دیتی ہیں یا پھر تباہ کن اسلحہ کے حصول میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ اقوام عالم نے اپنی فنی ترقی سے ابھی تک ضروری درس حاصل نہیں کیا اور ایٹم بم جو دیگر تمام پھٹنے والے مادوں سے ہزار گناہ زیادہ دھماکے کی قوت کا حامل ہوتا ہے، ۱۹۴۵ء میں ایجاد ہوا تھا، اس کے چار سال بعد ہائیڈروجن بم وجود میں آ گیا جو اس سے بھی ہزار گناہ زیادہ طاقت رکھتا ہے۔ اب یہ لوگ بیکٹیر یالوجی کے اسلحہ کی ایجاد میں سرگرم ہیں جو ہائیڈروجن بم سے بھی کئی گناہ زیادہ تباہ کن ہے، پھر انتہائی زیادہ اخراجات کے ذریعے میزائل بنا کر مقابلے میں نصب کئے جاتے ہیں۔ وہ لوگ متواتر ایسی جدید مشینیں بنانے میں مصروف ہیں جو کئی گناہ زیادہ صحیح نشانہ لینے والی ہوں، ان کی وجہ سے سابقہ ماڈل ناکارہ ہو جاتے ہیں اور ہر ترقی یافتہ ماڈل گزشتہ ماڈل سے دس گناہ زیادہ اخراجات سے تیار ہونے لگتا ہے۔[۱]

انسانی تباہی کا پیش خیمہ

اس میں شک نہیں کہ آج کے انسان نے کتاب کائنات کے مطالعہ اور تحقیق کے نتیجے میں اس کی تخلیق کے پوشیدہ اسرار کو سمجھنے میں قابل رشک کامیابیاں حاصل کیں ہیں اور ترقی وتکامل کی راہ میں اہم ترین منازل کو طے کیا ہے۔ لیکن چونکہ وہ اپنے اس ترقی کے سفر میں ایمان بہ خدا سے غافل رہا اور مکارم اخلاق اور وقار انسانی کے خصائل کی طرف متوجہ نہیں ہوا، اس لئے کہنا پڑتا ہے کہ یہ انسان ایک خودسر اور سرکش ترقی میں کامیاب ہوا ہے۔ چنانچہ اپنی اس بے ایمان و بداخلاق ترقی کے باعث وہ خود اپنے لئے بدبختی اور تباہی کا میدان ہموار کرتا رہا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے دانش ور حضرات بخوبی سمجھنے میں کامیاب ہوئے ہیں اور اپنی مختلف تحریروں میں اس تلخ بات کو بیان کرنے میں مجبور ہو رہے ہیں۔

رسل کہتا ہے:۔ ایٹم بم اور اس سے بھی زیادہ طاقتور ہائیڈروجن بم انتہائی خوف و ہراس پھیلانے کا باعث بنا اور اس سے انسانی زندگی میں علم کے نتائج پہلے سے بھی زیادہ شک و تردید کا نشانہ بن گئے ہیں۔ حتی کہ بعض درجہ اول کے مفکرین کہ جن میں آئین سٹائن بھی شامل ہے، وہ خطرے کی یہ گھنٹی بجانے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ اب ہمارے اس خاکی سیارے کو باقاعدہ خطرہ لاحق ہو گیا ہے اور ممکن ہے کہ اس کا نام و نشان ہی مٹ جائے۔[۲]

لکنٹ ڈونوئی کہتا ہے:۔ آج جب کہ بشریت ایٹم بم کے تباہ کن استعمال کے نتائج سے آگاہ مکمل تباہی کا خطرہ محسوس کر رہی ہے۔ اب عام لوگ بھی متوجہ رہے ہیں کہ ہماری نجات کا واحد راستہ انسانی اخلاق کو زیادہ سے زیادہ وسعت دینے میں مضمر ہے۔ ہاں

---

[۱] روزنامہ کیہان شمارہ ۸۱۷۷

[۲] تاثیر علم بر اجتماع ص ۱۴۶

انسان پہلی مرتبہ اپنے ایسے اقدام سے خطرہ محسوس کررہا جو اپنے ہوش وحواس کے ساتھ اس نے خود انجام دیا تھا۔[۱]

پس وہ واحد ذریعہ جس سے بشریت کو تباہی و بربادی سے بچایا جا سکتا ہے، وحشت خیز وغارت سے نجات بخشی جاسکتی ہے اور وہ عامل جو پوری زمین پر ایک پائیدار امن کے قیام میں کامیاب ہوسکتا ہے اور صلح کی حفاظت کرسکتا ہے، وہ یہی ہے کہ انسان کی زندگی سے خواہش پرستی کی لعنت کا خاتم کر دیا جائے۔ یعنی غرائز۔ شہوت۔ جاہ طلبی۔ خواہش برتری۔ جاہلانہ تعصّبات اور خود پرستی کو معبودیت کے تخت سے اتار کر نیچے کھینچ لیا جائے۔ خلاصہ یہ کہ لوگوں کا طرز تفکر تبدیل ہو اور خود اپنے اور کائنات کے بارے میں انسان کا نظریہ تبدیل ہوجائے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ط [۲]

خداوند تعالیٰ کسی قوم کے حالات کو تبدیل نہیں کرتا جب تک وہ لوگ خود تبدیل نہ کریں (اور اپنی زندگی کی روش میں انقلاب نہ لائیں)

اگر انسان خواہش نفس کی پرستش کو چھوڑ دیں اور خدا پرست بن جائیں، اگر وہ اپنے غرائز کو خداوند تعالیٰ کی رضا کے مطابق ڈھال لیں اور انہیں خوشنودی خدا اور بھلائی کی حدود میں پابند کریں تو یقیناً وہ حیوانی پستی سے نکل کر انسانی بلندی کو پہنچ جائیں گے۔ اس وقت ان کی زندگی صلح وصفائی، امن وآرام اور خوش بختی وسعادت کا محور بن جائے گی۔

اگر این درده خوئی زطبیعت بهیرد
هم عمر، زنده باشی بروان آدمیت

اگر تیری طبیعت سے یہ درندگی نکل جائے تو پھر تو ہمیشہ آدمیت کی روح کے ساتھ زندہ رہ سکتا ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ خالق کائنات کی طرف توجہ اور پروردگار عالم کی مالکیت پر ایمان رکھتے ہوئے کتاب خلقت کا مطالعہ کرنا اور علمی کمال پیدا کرنا، اس علمی اور تحقیقی تکامل سے کوسوں دور ہے جو خالق یک طرف توجہ کئے بغیر اور ایمان کے بغیر حاصل ہوا ہو، ان دونوں میں علمی اور نفسانی لحاظ سے کئی تفریقات موجود ہیں۔

زیر شہوات ترقی

پہلا فرق: ان دونوں ترقیوں کے درمیان جو پہلا فرق ہے اور انسان کی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ خدا پر ایمان اور پروردگار کی مالکیت پر اعتقاد کے ساتھ جو علم کمال حاصل ہوتا ہے وہ ایک سالم صحیح اور ہر قسم کے انحراف سے محفوظ ہوتا ہے، لیکن بلا ایمان ترقی ایک ایسی ترقی ہے جو نا سالم۔ خودسر اور غرائز وشہوت کے تابع رہتی اور اندھے انداز سے آگے بڑھتی ہے۔ ہماری

---

[۱] سرنوشت بشر ص ۶۵

[۲] سورۂ رعد آیت ۱۱

سابقہ وضاحتوں کے مطابق یہ ترقی مسلسل کجروی اور انحراف کے زیر اثر رہتی ہے، اسی لئے ایسی بدبختیوں اور خطرات کا موجب بنتی ہے جن کی تلافی ناممکن ہوتی ہے۔

مادیوں کا طریقہ

دوسرا فرق: دوسرا فرق جس سے الٰہی گروہ، مادی گروہ سے جدا ہوجاتا ہے اور عوامی زندگی پر اس کا عملی اثر مرتب ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ مکتب الٰہی میں ترقی وتکامل کا بنیادی مقصد کمال مطلق کی طرف بڑھنا اور رضوان الٰہی کے حصول میں کامیابی حاصل کرنا ہے۔لیکن مادی مکتب میں ترقی وتکامل کا مقصد اس جہان طبیعت میں اپنی مادی کارگزاریوں کو وسعت دینا اور مادی امور میں زیادہ سے زیادہ کامیابیاں حاصل کرنا ہوتا ہے۔

لیکنٹ ڈونوئی کہتا ہے:۔انسان کی حقیقی ترقی جو اسے کمال تک پہنچنے میں کامیاب بناسکتی ہے، وہ فقط انسان کی خودسازی میں مضمر ہے۔نہ کہ ان اشیاءکو زیادہ کامل بنانا جنہیں انسان بطور آلات استعمال کرتا ہے یا جن سے اپنی مادی آسائش میں اضافہ کرتا ہے۔ یہ تو مادہ پرستوں کا طریقہ کار ہے اور انسان کی توہین کا باعث ہے، کیونکہ اس سے انسان کی بہترین اور اعلیٰ ترین صفات نظروں سے دور ہوجاتی ہے۔حالانکہ انسان کی حقیقی سعادت اور خوش بختی کی ضمانت انہیں صفات کے اندر پنہاں ہے، وہ ایسی سعادت ہے جو ایک جگالی کرنے والی گائے کی خوشی سے بھی بالاتر خوشی کا موجب ہوتی ہے۔پس جو لوگ اس کے برعکس نظرئے کے معتقد ہیں یا ایسے ہی پست نظریات کے حامی ہیں۔وہ اگر عام لوگ ہیں تو قابل رحم ہیں اور اگر قوم کے رہبر بنے ہوئے ہیں تو ان سے ڈرنا چاہئے یہی لوگ ہیں جو خداوند تعالیٰ کی منشاء کے خلاف کام کر رہے ہیں۔[۱]

واضح ہو کہ اب بحث میں جو کامل مرکز گفتگو بنایا گیا ہے، وہ اس عالم طبیعت میں لوگوں کا کسب کردہ تکامل ہے، کہ جسے ہر انسان اپنے اختیاری افعال اور ارادی جدوجہد کے ذریعے حاصل کرتا ہے۔اس کے نتیجے میں وہ اپنے آپ کو پستی اور انحطاط سے آزادی دلاتا اور ترقی کی راہ پر گامزن ہوجاتا ہے۔

الٰہی انسان کا عقیدہ

ایک باایمان اور خداپرست انسان اپنے سمیت پورے جہان کو پروردگار حکیم کی مخلوق تسلیم کرتا ہے۔اس کا نظریہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا آغاز فیض خداوندی کے ذریعے ہوا اور اس کا انجام بھی اسی ہستی کے حضور میں ہوگا۔

وَّهُوَ خَلَقَكُمۡ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۲۱﴾[۲]

---

[۱] سرنوشت بشر ص ۱۷۳

[۲] سورۂ حم سجدہ آیت ۲۱

اسی اللہ تعالیٰ نے تمہیں اولین بار خلق فرمایا اور تمہیں اسی کی درگاہ میں پلٹنا ہے

وَاَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَہٰی ﴿۴۲﴾ [۱]

اور لوگوں کی جائے انتہا تیرے پروردگار کے ہاں ہے۔

مادی انسان کا طرز تفکر

ایک مادہ پرست انسان اپنے سمیت سارے جہان کو ایک مادی پیداوار اور طبیعت جیسی اندھی اور بہری شئی کا کرشمہ سمجھتا ہے۔ اس کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ بشر اتفاقی حادثے کے ذریعے پیدا ہونے والے علل و معلولات کے توسط سے وجود میں آ گیا ہے۔ وہ اس جہان میں چندروز زندگی گزارتا ہے، پھر موت آتی ہے تو اس کی کتاب زندگی مکمل طور پر بند ہو جاتی ہے اور اس کا قصہ تمام ہو جاتا ہے۔

وَقَالُوْا مَا ہِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا یُہْلِکُنَآ اِلَّا الدَّہْرُ ۚ وَمَا لَہُمْ بِذٰلِکَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ ہُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ ﴿۲۴﴾ [۲]

اور ان کا کہنا یہ ہے کہ ہماری زندگی فقط یہی دنیوی زندگی ہے۔ اور یہی موت اور بس یہی عالم طبیعت ہمیں ہلاک کرتا ہے اور ہماری زندگی کا خاتمہ کرتا ہے، ان کی یہ بات کسی علم و تحقیق کے نتیجے میں نہیں انہیں اس کا کوئی یقین نہیں۔ وہ یہ سب باتیں فقط وہم و گمان کی بنیاد کرتے ہیں۔

دنیا اور الٰہیون

الٰہی انسان کی نظر میں یہ دنیا تکامل کی منزلوں میں سے ایک ایسی منزل ہے جو انسانی سفر کے راستے پر قائم ہے۔ چندروزہ زندگی جو انسان کو یہاں گزارنا ہوتی ہے، اس زندگی میں اس کا فرض ہے کہ اپنی مادی و معنوی سعادت اور جسمانی و روحانی کے لئے خوب کوشش کرے۔ اپنی غذا و لباس۔ سواری و رہائش گاہ اور دیگر لوازمات زندگی کے حصول میں خوب محنت کرے۔ جائز لذتیں اٹھائے۔ ان کے لئے اپنے ہاتھوں سے کمائی کرے اور دوسرے پر بوجھ نہ بنے۔ ہاں یہ نکتہ یاد رہے کہ بنیادی نظریہ اور اصلی مقصد اس دنیوی محنت و کوشش کا حیوانی زندگی کا تحفظ اور مادی لذائذ کا حصول نہیں، بلکہ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ سب سے بڑھ کر اپنے اصلی ہدف کے حصول میں ترقی کرے اور صاحب کمال بنے۔ جس قدر بھی ہو سکے اپنے آپ کو ایمانی۔ اخلاقی۔ علمی اور عملی کمالات سے آراستہ کرے، تا کہ جب زندگی اختتام کو پہنچے اور اسے اس دنیا سے رخت سفر باندھنا پڑے تو ترقی یافتہ اور کامل افراد سے جا ملے۔ درحالیکہ خدا اس

---

[۱] سورۂ نجم آیت ۴۲

[۲] سورۂ جاثیہ آیت ۲۴

سے راضی ہو اور وہ خدا سے راضی ہو، وہ حق تعالیٰ کے حضور میں پہنچے اور وہاں کمال مطلق سے بہرہ مند ہونے میں کامیاب ہو جائے۔

يَاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ﴿٢٧﴾ ارْجِعِىْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿٢٨﴾ فَادْخُلِىْ فِىْ عِبٰدِىْ ﴿٢٩﴾ وَادْخُلِىْ جَنَّتِىْ ﴿٣٠﴾ [1]

اے نفس مطمئنہ! پلٹ آ اپنے پروردگار کی طرف راضی ہو کر جبکہ وہ تجھ سے راضی ہے۔ پس میرے بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا

دنیا اور مادیون

ایک مادی انسان کی نگاہ میں دنیا کی زندگی ہی اصل ہدف اور بنیادی مقصد ہے، وہ نہ تو خدا کو اور نہ ہی موت کے بعد کسی عالم کو مانتا ہے۔ وہ اپنی خوش بختی اور سعادت فقط اچھی زندگی گزارنے میں سمجھتا ہے، وہ لذت حاصل کرنے کے لئے زیادہ تعلیم حاصل کرتا اور عالم طبیعت کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس کے علل و معلولات پر آگاہی حاصل کرتا اور اس کے پوشیدہ اسرار سے واقفیت پاتا ہے۔ اس کوشش سے اس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ عالم طبیعت کی تمام چیزوں کو اپنے غرائز کی سیری کے لئے استعمال کرے اور ان خزانوں کو ہر قسم کی لذت اٹھانے میں صرف کرے، پس مادی مکتب میں بشر کی اختیاری ترقی کا مفہوم اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚۖ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ﴿٧﴾ [2]

وہ اس دنیا کی زندگی کو (مادی پہلو) سے دیکھتے ہیں۔ اور اس کے ظاہر کی توجہ دیتے ہیں۔ اور آخرت کے (جہان) سے بے خبر اور غافل ہیں۔

عن الحسن علیه السلام کن یقول: یا بن آدم انك لم تزل فی هدم عمرك منذ سقطت من بطن امك فخذمما فی یدك لما بین یدیك فان المومن یتنزودو ان الکافر یتمتع [3]

زندگی سے صحیح فائدہ اٹھانا

حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام فرمایا کرتے تھے: اے فرزند آدم! تو جب سے اپنی ماں کے پیٹ سے نکل کر اس زمین پر آیا اس وقت سے مسلسل اپنی عمر کو ختم کرنے میں لگا ہوا ہے۔ لہٰذا اپنی زندگی کی فرصت سے فائدہ اٹھا اور جو کچھ تیرے ہاتھوں میں ہے

---

[1] سورۂ فجر آیت ۲۷ تا ۳۰

[2] سورۂ روم آیت ۷

[3] سفینۃ البحار ''وعظ'' ص ۲۷۱

اس سے اپنی آئندہ منزلوں میں فائدہ اٹھانے کا سامان کر! کیونکہ مومن آدمی اس دنیا سے کل کے لئے زادراہ حاصل کرتا ہے اور بے ایمان آدمی فقط یہاں کی لذت اٹھانے میں مصروف رہتا ہے۔

ایک باایمان انسان کا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا کی یہ محدود زندگی رحم مادر کی محدود زندگی کی مانند ہے اور موت انسان کے لئے ایک دوسری ولادت کی مثل ہے جو دنیا کی زندگی کے اختتام پر حاصل ہوتی ہے۔ جس طرح ایک جنین کا ولادت پانا اس نومود کے لئے نابودی کا باعث نہیں، اس طرح ایک آدمی کا مرجانا اس کے لئے نیستی کا موجب نہیں ہے، بلکہ یہ دونوں مراحل زندگی کے ماحول کی تبدیلی اور شرائط حیات کا انقلاب ہیں۔

جس طرح ایک جنین ولادت کے وقت اپنے اس جڑواں گوشت کے ایک لوتھڑے سے جدا ہوجاتا ہے جو شکم مادر میں اس کی زندگی کا وسیلہ بنا رہا تھا، اب وہ لوتھڑا کسی کونے میں نیست ونابود ہوجاتا ہے۔ لیکن نومولود نئے حالات اورنئی شرائط میں زندگی گزارنا شروع کردیتا ہے۔ اسی طرح جب آدمی پر موت آتی ہے تو اس کا بدن اس سے جدا ہوجاتا ہے۔ وہی بدن کہ جو رحم مادر میں اس آدمی کے لئے زندگی کا وسیلہ بنا تھا، اب وہ قبر کے اندر بوسیدہ ہوکر بکھر جاتا ہے۔ لیکن آدمی خود نئی شرائط اور نئے حالات کے ساتھ برزخی زندگی کا آغاز کردیتا ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: ما خلقتم للفناء بل خلقتم للبقاء وانما تنقلون من دار الی دار [1]

حضرت رسول کریمؐ نے فرمایا: تم فنا ہونے کے لئے پیدا نہیں کئے گئے ہو، بلکہ تم سب باقی رہنے کے لئے پیدا کئے گئے ہو۔ موت کے ذریعہ تم ایک جہان سے دوسرے جہان کی طرف منتقل ہوتے ہو۔

قال رجل لجعفر بن محمد علیہما السلام یا اباعبداللہ انا خلقنا للعجب قال وما ذالک اللہ انت قال خلقنا للنفاء فقال مہ یا بن اخ خلقنا للبقاء و کیف نفنی جنۃ لا تبید و نار لا تخمد ولکن قل انما نتحول من دار الی دار [2]

ایک مرد نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا۔ یا اباعبداللہ! ہم عجیب مقصد کے لئے خلق کئے گئے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا۔ بخدا بتاوہ امر عجیب کیا ہے؟ وہ کہنے لگا۔ ہم تو فنا اور نابود ہونے کے لئے خلق کئے گئے ہیں۔ آپ نے فرمایا برادرزادے! ٹھہرو! (ایسا نہیں) ہم تو باقی رہنے کے لئے خلق کئے گئے ہیں۔ وہ جنت کیسے فنا ہوسکتی ہے جو کبھی پراگندگی اور تفرق کا شکار نہ ہوگی اور وہ جہنم کی آگ کیسے فنا ہوگی جو کبھی نہ بجھنے پائے گی۔ لہٰذا یوں کہو! کہ ہم تو ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف منتقل ہوتے ہیں۔

---

[1] بحارالانوار ج ۳ ص ۱۶۱۔ ۸۶

[2] بحارالانوار ج ۳ ص ۱۶۱۔ ۸۶

رحم مادر میں جنین کا تکامل

رحم مادو جنین کے لئے ترقی و تکامل کی منزل ہوتی ہے اور یہ نکتہ کسی سے پوشیدہ نہیں کہ جنین تبھی سالم و کامل کہلاتا ہے جب اس کا دماغ، اعصاب، ہڈیاں پٹھے، اندرونی اور بیرونی اعضاء، غرضیکہ اس کا سارا جسم اور جان باہمی طور پر متوازن اور متعادل ہوں۔ تا کہ وہ ترقی و نمود کی راہ طبیعی تقاضوں کے مطابق طے کر سکے اور جب بھی وہ بچہ اپنی ماں کے بطن سے نکلے تو ایک کامل سالم اور طبیعی نومولود قرار دیا جا سکے۔

ایک باایمان انسان بھی اس دنیا کو اسی طرح اپنی ترقی و کمال کی منزل قرار دیتا ہے، جس طرح جنین کے لئے رحم مادر کا مقام ہوتا ہے۔ البتہ اس فرق کے ساتھ کہ جنین رحم مادر میں تکوینی قوانین کے ذریعے بالجبر ترقی کرتا اور کمال پاتا ہے، لیکن انسان اس دنیا کے رحم میں اپنے ارادہ و اختیار کے ساتھ اکتسابی تکامل حاصل کرتا ہے۔

دنیا میں انسان کا تکامل

ایک باایمان انسان سمجھتا ہے کہ انسان تب کامل قرار دیا جا سکتا ہے، جب وہ اپنی خودسازی کی راہ میں تمام مادی اور معنوی جہات کی طرف متوجہ ہو۔ یعنی اپنے غرائز کو سیر کرنے اور لذتوں کے حصول کے ساتھ ساتھ تمام معنوی انسانی گوشوں اور بلند رجانات کی طرف بھی متوجہ ہو۔ وہ اپنے مادی امور کو منظم کرتے ہوئے معنوی اور روحانی جان کے تکامل کا انتظام بھی کرے۔ مختصر یہ کہ وہ اس دنیا کے رحم میں اسطرح خودسازی کرے کہ موت کے بعد جب اگلے جہان کو سدھارے تو وہ ایک واقعی انسان بن چکا ہو اور انسانوں کے ساتھ محشور ہو سکے۔

ایک مومن انسان جانتا ہے کہ اگر شکم مادر میں بچے کی ترقی ناقص اور ناموزوں رہے، مثلاً وہ اندھا متولد ہو تو اسے زندگی کا پورا دور نابینائی کی مصیبت میں گزارنا ہوگا۔ اسی طرح وہ آگاہ ہے کہ اگر اس شکم روزگار میں اس کا تکامل ناقص و ناموزوں رہے گا، دل و نگاہ آیات الٰہی کے مطالعہ کے لئے نہ کھلیں گے اور اپنے آپ کو، کوردل اور بے بصیرت بنائے رکھوں گا تو موت کے بعد اگلے جہان میں بھی اندھا ہی رہوں گا۔

وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ۝ [1]

جو بھی اس جہان میں اندھا رہے گا (اپنی بصیریت کو ناکارہ رکھے گا اور اپنی عمر کوردلی سے گزار دے گا)
تو وہ قیامت میں بھی نابینا اور گمراہ تر ہو کر آئے گا۔

---

[1] سورۂ بنی اسرائیل آیت ۷۲

مرکز خودسازی

خلاصہ یہ کہ باایمان انسان کی نگاہ میں دنیا ایک مدرسہ اور خودسازی کے مرکز کی مانند ہے۔اور بعداز موت کا جہان اس آزاد فضا کی مثل ہے جس میں ایک انسان اپنی تعلیمی زندگی سے فارغ ہونے کے بعد قدم رکھتا اور اپنے طالب علمی کے دور کی محنت کے نتائج حاصل کرتا ہے۔البتہ اس فرق کے ساتھ کہ یہ اجتماعی ماحول ایک محدود وقت کا مقام ہے۔لیکن جہان آخرت ایک ابدی اور جاودانی جگہ ہے۔

ہر وہ روز مدرسہ جاتا اور آتا ہے، لیکن اس آمد و رفت سے آزردہ اور تنگدل نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہر روز نیا درس لیتا ہے اور ہر روز ترقی کی طرف نیا قدم اٹھاتا ہے۔ پھر اسی نسبت سے اپنے اعلیٰ اہداف کے نزدیک تر ہوتا جاتا ہے اور اپنے علمی شعبے میں تخصص پا جاتا ہے۔

وہ اپنے طالب علمی کے دور کے مشکلات ومصائب سے ہم آہنگی پیدا کرلیتا ہے۔اور یہی مصائب وآلام اسے صبر وشکیبائی سکھاتے ہیں۔ وہ درس لینے کی پابندیوں اور پریشانیوں سے ناخوش نہیں ہوتا، کیونکہ جانتا ہے کہ تکلیف اٹھائے بغیر خزانہ حاصل نہیں ہو سکتا اور جہد جہد اور سعی وکوشش کے بغیر کوئی آدمی بلند مدارج نہیں تک پہنچ سکتا۔

وہ اپنی مشکلات ومطالعہ کی زحمات پر اس لئے خوش اور مسرور ہوتا ہے کہ جوں ہی دور تحصیل ختم ہوگا اور وہ مدرسہ چھوڑے گا تو بڑی سربلندی اور افتخار کے ساتھ معاشرے میں قدم رکھے گا۔ اس وقت وہ اپنے اس علم ودانش سے استفادہ کرے گا، جو اس نے دوران تعلیم اپنے لئے ذخیرہ کی اور جسے اس علمی رہ گزر میں حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔

قال علی علیہ السلام: ایھا الناس انما الدنیا دار مجاز والاخرة دار قرار فخذوا من ممرکم لمقرکم [1]

امام علی علیہ السلام نے فرمایا: اے لوگو! یہ دنیا ایک رہ گزر ہے اور اپنا آخری (ابدی) جائے سکونت ہے۔لہٰذا تم اس (دنیا سے) جو تمہاری گزرگاہ ہے اپنی قرارگاہ کے لئے کچھ لے لو (اور اپنے ساتھ سرمایہ لے جاؤ)

آخری مقصد

ایک مادی انسان جو دنیا ہی کو اپنا آخری مقصد اور آخری منزل سمجھتا ہے اور موت کو اپنا اختیار تصور کرتا ہے۔ وہ نہ خداوند عالم کو مانتا ہے اور نہ ہی بعداز موت ایک دوسرے جہان کے وجود کا عقیدہ رکھتا ہے۔ وہ فنا ہوجانے والے مادے پر یقین رکھتا ہے اور باقی

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۴

رہنے والی روح اور اس کی جاودانی حقیقت سے بالکل بے خبر اور غافل رہتا ہے۔ اپنے آپ کو اسی عالم طبیعت کی چار دیواری اور اس کی زودگزر رلذتوں کا قیدی بنائے رہتا ہے، کیونکہ اس کی نظر میں یہ دنیوی زندگی ایک لغو اور بے مقصد شئ ہے۔

ایسا انسان اس دنیوی زندگی کو سوائے اس کے اور کچھ نہیں سمجھتا کہ ایک تھکا دینے والا تکراری سلسلہ اور ملول کر دینے والا ایک عمل ہے۔ یہاں زندگی گزارنا اس کے خیال میں عبث اور بے معنی مساعی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ یہ دنیا ہے کہ جس میں لذت کے ساتھ رنج اور پسند کے ساتھ ناپسند ملی ہوئی ہے۔یعنی ایسی دنیا جس میں ہر خوشی کے بعد غم اور ہر نوش کے ساتھ نیش ہے۔ بلکہ اگر اس دنیا کی لذت کے ساتھ رنج اور پسند کے ساتھ ناپسند ملی ہوئی ہے۔یعنی ایسی دنیا جس میں ہر خوشی کے بعد غم اور ہر نوش کے ساتھ نیش ہے۔ بلکہ اگر اس دنیا کی لذت بار بار ملنے لگے تو وہی الم میں تبدیل ہو جاتی ہے اور پسندیدہ امر مکرر ہونے لگے تو وہ ناپسندیدہ بن جاتا ہے۔

ایک خام نظریہ

ایک مادہ پرست ہمیشہ اپنے آپ سے سوال کرتا ہے: اس کی زندگی سے کیا مراد ہے؟ یہ کیوں ہے؟ میں دنیا میں کیوں آیا ہوں؟ اور پھر اس دنیا سے کیوں چلا جاتا ہوں؟ وہ آمد جو رفت پر ختم ہو اور وہ جگہ جس کی انتہا موت ہو، کیا ایسی آمد و رفت فضول اور بے معنی نہیں؟ حالانکہ اس غلط فکر اور فضول سوچ کی بنیاد اس کے مادہ پرست افکار ہیں اور یہ نتیجہ ان خام نظریات کا نتیجہ ہے جو مادیون نے اس کائنات، اس کے آغاز اور اس کے خالق کے بارے میں وضع کر رکھے ہیں۔

اگر وہ اس دنیا کو جنین کے لئے رحم مادر کی طرح اپنی خود سازی آبادی اور انسان کی تربیت کے مرکز کے طور پر تسلیم کر لیتا اور موت کو ایک دوسری ولادت اور ایک عالم سے بالاتر عالم کی طرف انتقال کا وسیلہ قرار دیتا۔ اگر وہ اس دنیا کو اپنی ترقی و بلندی بلکہ تمام انسانوں کے حصول کمال کا ایک مدرسہ سمجھتا اور عقیدہ رکھتا کہ یہ عالم انسان کو موت کے بعد کے عالم کے لئے تیار کرنے والے ایک مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔تب وہ اس دنیا کی لغو اور بے مقصد شمار نہ کرتا اور نہ ہی اپنے آپ سے اس قسم کے سوالات کرتا دکھائی دیتا۔

لیکن شومئ قسمت کہ بے ایمانی سے جنم لینے والی یہ غلط فکر جہان غرب میں ایک بیماری کی شکل اختیار کر چکی ہے اور رفتہ رفتہ مشرق کی طرف بھی سرایت کر رہی ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ نوجوانوں کی اکثریت روح نشاط وامید سے محروم ہو گئی ہے، اور وہ اس دنیوی زندگی سے مایوس اور دل سرد ہو چکے ہیں، کچھ افراد مزید آگے بڑھ جاتے ہیں اور خودکشی کے بارے میں سوچنے لگ جاتے ہیں۔ تاکہ اس طریقے سے ان رنج آور اور غم انگیز زندگی سے نجات پالیں اور جس قدر جلد ہو سکے اس لغو اور بے معنی ماحول کو چھوڑ دیں۔

بے مقصد زندگی

پروفیسر یونک جو مغرب کے ماہرین نفسیات میں سے ایک بڑا ماہر استاد ہے، وہ یوں کہتا ہے: میرے ہاں ساری دنیا سے آنے والے مریضوں میں سے دو تہائی افراد جو تعلیم یافتہ اور صاحبان ثروت بھی ہوتے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا درد یہی ہوتا ہے کہ

انہیں زندگی کا بے معنی اور بے مقصد ہونا ستائے رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ٹیکنالوجی کو ترقی، تعلیمی جمود، کوتاہ نظری اور تعصب نے بیسیویں صدی کے بشر کو (لامذہب) بنا دیا ہے اور اب وہ اپنی روح کی جستجو میں سرگردان ہو گیا ہے۔ لیکن جب تک وہ مذہب کی طرف نہ آئے راحت نہ پا سکے گا، اسے چاہیے کہ وہ اپنے راستے کا کوئی ہدف قرار دے۔ لامذہبی یقیناً فضول اور بے معنی زندگی کا موجب بنتی ہے، لیکن ایک ہدف معین کرنا اور ایک منزل کے حصول کی کوشش کرنا اس زندگی کو بامعنی اور سمجھ میں آنے والی حقیقت بنا دیتا ہے۔ ہر ایسا انسان جو خودشناسی کی راہ میں گام شجاعت اٹھاتا ہے۔ بالآخر خداشناسی میں کامیاب ہو جاتا ہے، پھر اس کی آخری منزل (نفس کا کمال) اور اپنی ذات (فردیت) ہوتی ہے اور وہ اس تک پہنچ جاتا ہے۔[1]

خودشناسی

بڑے تعجب کا مقام ہے کہ کچھ نامور اہل قلم، اور اعلیٰ پائے کے شعراء خود اس غلط نظرئے کے قائل ہو گئے ہیں اور زندگی بے مقصد اور بے معنی خیال کرنے لگے ہیں۔ نیز اپنے اس باطل نظریئے کی تقویت بھی کرتے ہیں اور اس کو پختہ کرنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ اپنے سحرانگیز کلام کے ذریعے اس دنیا کو عبث اور بے ہدف ظاہر کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ ہاں بجائے اس کے کہ وہ نسل جوان میں روح امید زندہ کرتے وہ اپنی نظم اور نثر سے اس زندگی کو فضول ثابت کرنے اور لوگوں کی اذہان میں یہ زہر گھولنے میں مصروف رہتے ہیں۔ اس سے وہ گمراہ افراد کو مزید حیران و سرگردان کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور بہت جلد ان بے چاروں کو بدبختی و پستی کی گھاٹی میں دھکیل دیتے ہیں۔

دید مت، دید مت ولی افسوس
کہ تو دیگر نہ آنچنان بودی
(میں نے تجھے دیکھا، تجھے دیکھا لیکن افسوس کہ تو پھر اس طرح کا نہ تھا)

من خزاں دیدہ باغ درد انگیز
تو خزاں دیدہ باغبان بودی
(میں ایک دردانگیز خزان زدہ باغ کی مثال تھا اور تو اس باغبان کی مثل تھا جس کے باغ پر خزاں آئی ہو)

پنجہ غول سرکش ایام
زدہ بر روی تو شیاری چند
(سرکش دنوں کے غول کے پنجے نے تیرے چہرے پر چند خراشیں ماردی ہیں)

[1] روزنامہ کیہان شمارہ ۸۱۹۶

مخمل گیسوی سیاہ مرا
دوختہ باسپید تاری چند
(میرے سیاہ مخمل کی طرح کے خوبصورت بالوں میں چند ایک سفید تاریں بھی آ گئی ہیں)

رفتہ ایام، دیدۂ من و تو
ہمچنان سوی مقصدی نگران
(دن تو گزر گئے۔لیکن میری اور تیری آنکھیں اس طرح اپنے مقصد کے متعلق حیران ہیں)

وہ چہ مقصد کہ کس نجستہ ورا
زین تگاپو نہ ماونی دگران
(وہ کیا مقصد ہوا کہ جسے مکمل جستجو کے باوجود کوئی نہیں پا سکا۔نہ ہم اور نہ ہی دیگر لوگ)

ما کہ بودیم رہنوردی کور
درگزر گاہ راہ گم کردہ
(ہم ایک ایسے اندھے مسافر کی طرح تھے جس نے گزرگاہ میں اپنا راستہ گم کر دیا)

یابزندان عمر، محبوسی
گردش سال و ماہ گم کردہ
(یا ایسے عمر قید والے قیدی کی طرح تھے جو سال و ماہ کی گردش کو بھلا بیٹھا ہو)

ما کہ بودیم رود پر جوشی
پے دریا بجستجو رفتہ
(ہم تو ایک ایسے پر جوش دریا کے پانی کے مثل تھے جو سمندر کی جستجو میں نکلا ہوتا ہے)

لیک در کام ریگزاری خشک
نیمۂ رہ ناگہتہ ان فرو رفتہ
(لیکن نصف راہ ہی ناگہاں ایک خشک صحراء کے بیچ میں پھنس گئے)

ما کہ بودیم شمع پر نوری
شعلہ افگن بجان خاموشی
(ہم تو اس نورانی شمع کی مثل تھے جو خاموش رہ کر اپنی جان میں شعلہ زن رہتی ہے)

شب بپایان نرفتہ سوختہ پاک
خفتو در ظلمت فراموشی
(ابھی رات تمام نہ ہوئی تھی کہ شمع جل کرختم ہوگئی اورفراموشی کی تاریکی سوگئی)

سالہا رفت و سالہاری دگر
باز چوں ازکنا ہم گزریم
(کئی سال گزر گئے اورکئی ایک سال بھی کہ ہم ان کے قریب سے گزر گئے)

ہمچنان خستہ در طلب شاید
سوی مقصود خویش رہ نبریم
(لیکن شاید اپنے مقصودزندگی کو پانے میں کامیاب نہ ہوسکیں گے۔اسی طرح تھکتے رہیں گے اورراہ منزل تک نہیں پہنچ سکیں گے۔)

ان اشعار میں ایک سرگردان اور بے مقصد انسان کا طرز تفکر بخوبی نظر آرہا ہے، ان اشعار میں دل میں اتر جانے والی چند تشبیہات کے ساتھ زندگی کے بے مقصد ہونے کو ظاہر کیا گیا ہے۔اس سے یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ زندگی بالکل بے مقصد شئی ہے، اس کا کوئی ہدف نہیں اوراگر ہے تو کسی کی دسترس میں نہیں آسکا۔

نوجوان نسل کے قلوب پران اشعار کا جواثر مرتب ہوتا ہے۔وہ مایوسی،محرومی۔سرگردانی اورحیرانی کے علاوہ کچھ اورنہیں ہے کہ وہ اپنی زندگی کولغواوراپنی کوششوں کو بے مقصد خیال کرنے لگتے ہیں۔مختصر یہ کہ ان اشعار کے پڑھنے والے کو یہی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی یہ زندگی ایک پوچ اور بے معنی شئی ہے اوراس میں محنت وکوشش کا نتیجہ بالآخر شکست اورنابودی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ایک انسان اس دنیائے بے ہدف و ناشاختہ میں اس اندھے مسافر کی مثل ہے جو راہ گم کر بیٹھا ہو، حیران وسرگردان ادھرادھر بھاگا دوڑا پھرے، اپنی توانائیاں بے فائدہ خرچ کرتا رہے اورانجام کار کسی مقصد تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔

روشن دل افراد

لیکن مکتب اسلام کے پیروکار اور باایمان انسان اس دنیا کے بارے میں ہرگز اس نظرئے کے حامل نہیں ہوتے۔وہ اندھے دل والے نہیں ہوتے بلکہ روشن دل اور بابصیرت افراد ہوتے ہیں، وہ اسلام کے عظیم رہبر کی آسمانی ندا کو لبیک کہتے ہیں اور ابدی سعادت کے حصول کے لئے اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے صراط مستقیم پر مسلسل گامزن رہنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔

قُلۡ هٰذِهٖ سَبِيۡلِيۡۤ اَدۡعُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ ۚ عَلٰى بَصِيۡرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيۡ ؕ [1]

کہہ دو یہ ہے میرا راستہ۔ میں (لوگوں کو) اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیتا اور بصیرت سے بلاتا ہوں اور میرے پیروکار بھی اسی طرح بابصیرت ہیں۔

خدا کی طرف بازگشت

میرے پیروکار جو شیلے دریا کے پانی کی طرح ہیں جو حق وحقیقت کی راہ میں زیادہ سے زیادہ کوشش اور تلاش وجستجو کرتے ہیں۔ ان کا آغاز بھی خدا سے تھا اور ان کا انجام بھی خدا ہے۔ وہ کبھی بے راہ ہوکر نہیں چلتے کہ نصف راہ میں کسی صحرا میں راہ گم کر بیٹھیں۔ وہ بے خطر صراط مستقیم پر گامزن رہتے اور اطمینان کے ساتھ ترقی وکمال کی منزلیں طے کرتے ہوئے بالآخر بحر ابدیت سے متصل ہو جاتے ہیں اور اپنے اس خدا کے ہاں چلے جاتے ہیں کہ جہاں سے ان کا آغاز ہوا تھا۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ ؕ۝۱۵۶ [2]

ہم سب اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں اور ہم کو اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ جانا ہے

از رحمت آمد ندو برحمت روند خلق
من رحمة بدا والی رحمه یول
خلقان ہمه بفطرت توحید زاده اند
ایں است سر عشق که حیران کند عقول

یہ مخلوق رحمت سے آئی اور رحمت کی طرف جارہی ہے۔ رحمت سے آغاز ہوا اور رحمت کی طرف ہی انجام ہے۔ سب مخلوقات فطرت توحید پر پیدا ہوئی اور یہی وہ راز عشق ہے جو عقول کو حیران کئے ہوئے ہے۔

یہ اسلام کے پیروکار ہی وہ ہدایت وسعادت کی شمع فروزاں ہیں جن کی نورانی کرنوں سے سینکڑوں سیاہ تاریک قلوب روشن ہوجاتے ہیں۔ جب ان کی عمر تمام ہوتی ہے اور وہ اس دنیا سے سدھارتے ہیں تو عام لوگوں کے اذہان سے اتر جاتے ہیں اور وہ انہیں بھلا بیٹھتے ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ لوگ جہان غیب میں نہ خاموش ہیں اور نہ ہی فراموش شدہ بلکہ دربار الٰہی میں اپنی سچی خدمات کی نیک جزا حاصل کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔

قال علی علیه السلام: ا الدنیا دار صدق لمن صدقها ودار عافیة لمن فهم عنها ودار غنی لمن تزودمنها و دار موعظة لمن اتعظ بها مسجد احباء الله

---

[1] سورۂ یوسف آیت ۱۰۸

[2] سورۂ بقرہ آیت ۱۵۶

ومصلی ملائکہ اللہ ومھبط وحی اللہ ومتجر اولیاء اللہ اکتسبوا فیھا الرحمۃ ور بحوا فیھا الجنۃ[1]

الٰہی جزاء خیر

حضرت امام علی علیہ السلام نے فرمایا: یہ دنیا سچائی کا مرکز ہے اس شخص کے لئے جو یہاں سچائی اور حق کے لئے کام کرے۔ یہ عافیت وسلامتی کا گھر ہے اس شخص کے لئے جو اس کو صحیح طریقے سے سمجھ سکے۔ یہ تونگری کا گھر ہے اس شخص کے لئے جو اس سے زادراہ حاصل کرے۔ یہ نصیحت کی جگہ ہے اس شخص کے لئے جو اس سے نصیحت پائے۔ یہ دنیا دوستان خدا کی مسجد، ملائکہ الٰہی کو کسب کیا اور یہیں سے جنت جیسا نفع پانے میں کامیاب ہوئے۔

لیکن ایک مادی انسان جو نہ خدا کو مانتا اور نہ ہی بعد از موت نئے جہان کے وجود پر ایمان رکھتا ہے، ممکن ہے کہ وہ دنیوی زندگی کو ایک بے ہدف، لغو اور بے معنی چیز کہے۔ لیکن مکتب اسلام کے فرمانبردار اور مومن افراد کے لئے یہ زندگی عبث اور بے فائدہ نہیں ہے کیونکہ ان کی نگاہ میں یہ دنیا خودسازی اور کمال کے حصول کا مرکز ہے اور ایمان وفضیلت کمانے کی جگہ ہے۔ وحی کے نزول کا مقام اور پیغمبران خداوندی کا مدرسہ ہے۔ موت کے بعد کی زندگی کے لئے زاد وتوشہ یہیں سے ملتا ہے اور اسی کے ذریعے ابدی سعادت کا حصول ممکن ہوتا ہے۔ پس یہ دوسرا فرق ہے جو مادی گروہ کو الٰہی گروہ سے جدا کرتا ہے کہ جس سے ان کی زندگی اور طرز تفکر پر عملی طور پر اثر مرتب ہوتا ہے۔

---

[1] نہج البلاغہ کلمہ ۱۲۶

چھٹی تقریر

مسئلہ شفاعت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اذن خدا سے شفاعت

قال اللہ العظیم فی کتابہ:

مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَہٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِہٖ ؕ [۱]

کون ہے جو درگاہ الٰہی میں کسی کے حق میں شفاعت کرے بغیر اذن خدا اور اجازت الٰہی کے؟

شرک کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے اور انسان کو غیر خدا کی بندگی دینے کے لئے آیت الکرسی نے یہ درس دیا ہے کہ پرستش کے لائق تنہا و یکتا وہی خدا ہے جو زندہ اور قیوم ہے اور وہی انسانوں اور تمام ارضی وسماوی موجودات کا مالک ہے۔

انسان اپنی عقل کا صحیح استعمال کرتا ہے اور آزادی کفر سے کام لیتا ہے۔ وہ کبھی اس امر پر آمادہ نہیں ہوتا کہ ایک ناچیز مخلوق کو خالق قادر و توانا کا شریک قرار دے اور خداوند تعالیٰ کی بندگی کی بجائے ایک مخلوق کی پرستش کو صحیح سمجھے۔ یقیناً ہر عاقل اس فعل کو ناروا و نامناسب قرار دیتا ہے۔

موہوم شفیع

وہ تمام مشرکین جو پروردگار عالم کی خالقیت کے معترف تھے اور اسی کے سارے جہان کا خالق مانتے تھے۔ پھر بھی بت اور بت خانے کو تباہی سے محفوظ رکھنے کے لئے قابل قبول منطق سے بت پرستی کی توجیہ کرنے کی کوشش کرتے اور اس سلسلے میں وہ مسئلہ شفاعت کا سہارا لیا کرتے تھے۔ وہ کہتے کہ ہم ان بتوں کو درگاہ الٰہی میں اپنا شفیع بناتے ہیں۔

وَیَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مَا لَا یَضُرُّہُمۡ وَلَا یَنۡفَعُہُمۡ وَیَقُوۡلُوۡنَ ہٰۤؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنۡدَ اللّٰہِ ؕ [۲]

---

[۱] سورۂ بقرہ آیت ۲۵۵

[۲] سورۂ یونس آیت ۱۸

(مشرکین) اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ایسے بے اثر موجودات کی عبادت کرتے ہیں جو نہ انہیں نقصان پہنچانے پر قدرت رکھتے ہیں اور نہ ہی انہیں نفع پہنچا سکتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ بت اللہ تعالیٰ کے ہاں ہمارے شفاعت کرنے والے ہیں۔

مکہ میں آغاز بت پرستی

جب عمرو بن لحی بلوغ کو پہنچا تو خانہ کعبہ کی تولیت کے مسئلے میں حارث کے ساتھ جھگڑنے لگا، اس نے نبی اسماعیل کی مدد لے کر قبیلہ جرہم پر حملہ کیا، اس میں کامیاب ہو گیا اور انہیں کعبہ سے نکال دیا۔ پھر ان کو مکہ کے نواحی علاقے سے بھی دور بھگا دیا اور خانہ کعبہ کی دیکھ بھال اور انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''جس وقت عمر بن لحی ایک سنگین بیماری کا شکار ہوا تو اسے بتایا گیا کہ شام میں بلق ء نامی مقام پر گرم پانی کا ایک چشمہ ہے۔ اگر تم وہاں جا کر اس میں غسل کرو تو صحت پاؤ گے۔ تب وہ وہاں گیا، اس چشمے میں نہایا اور صحت مند ہو گیا''

اس نے بلقاء کے لوگوں کو دیکھا کہ بتوں کی پرستش کرتے ہیں، ان سے سوال کیا گیا کہ یہ کیا چیزیں ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ ہم ان کی شفاعت کے ذریعہ طلب باران کرتے ہیں اور انہیں کے توسل سے دشمن پر کامیاب ہوتے ہیں۔ اس نے ان درخواست کی کہ مجھے بھی چند ایک بت دے دو۔ انہوں نے اسے بت دیئے اور وہ لے کر مکہ آیا اور انہیں کعبہ پر نصب کر دیا۔ [1]

شفاعت خدا کے اختیار میں ہے

آیت الکرسی "من ذالذی یشفع عندہ الا باذنہ" کے ذریعے مشرکین کی اس موہوم اور خود ساختہ پناہ گاہ کو مسمار کر رہی ہے او پوری شدت وصراحت کے ساتھ فرما رہی ہے ''کون ہے جو درگاہ الٰہی میں اس کے اذن واجازت ک بغیر شفاعت کرنے کی قدرت رکھتا ہو''؟

آیت الکرسی نے جب یہ اعلان کیا کہ تمام ارضی وسماوی موجودات کا مالک خداوند اقدس ہے تو اس کے ساتھ ہی مسئلہ شفاعت کے متعلق گفتگو شروع کر دی۔ تاکہ یہ واضح کر دے کہ نہ فقط یہ کہ شفاعت کرنے والا اور جس کی شفاعت کی جا رہی ہے ہر دو اس خدا کی ملکیت ہیں، بلکہ خود امر شفاعت جو خالق ومخلوق کے مابین ایک قسم کا خصوصی رابطہ ہے، وہ بھی خداوند تعالیٰ کے اختیار میں ہے اور اسی مالک جہان کے اذن پر موقوف ہے۔ کسی کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی مخلوق کو کسی دوسری مخلوق کے لئے خالق کی درگاہ میں شفیع قرار دے دے اور کوئی بھی اس کی اجازت کے بغیر شفاعت کا حق نہیں رکھتا۔

اسی مختصر سے جملے سے ایک اور نکتہ بھی ظاہر ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اگر شفاعت باذن خدا کی جائے تو وہ صحیح اور مقبول درگاہ الٰہی ہو گی۔ بالفاظ دیگر "من ذالذی یشفع عندہ الا باذنہ" کا یہ جملہ نفی اثبات دونوں پر مشتمل ہے۔ ایک طرف سے تمام ایسے شفعاء

---

[1] کتاب الاصنام ص ٦

کی شفاعت کی نفی کر رہا ہے جو خود ساختہ اور انسان کی جہالت کی پیداوار ہوں، کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت نہیں ہے اس لئے ان کی شفاعت کی نفی کر دی ہے۔لیکن دوسری طرف سے یہ جملہ اس شفاعت کا اثبات بھی کر رہا ہے جو اللہ تعالیٰ کے اذن سے واقع ہو، ایسی شفاعت کو اسلام کے توحیدی نظریے میں صحیح اور درست قرار دیا گیا ہے۔

اسلام کے مقدس آئین کے اہم ترین مسائل میں سے ایک مسئلہ شفاعت ہے اور اس بارے میں قرآن شریف میں متعدد آیات وارد ہوئی ہیں، نیز شیعہ وسنی ہر دو کے اسناد سے بہت سی روایات بھی موجود ہیں۔

چنانچہ "من ذالذی یشفع عندہ الا باذنہ" کی مناسبت سے ضروری ہے کہ مسئلہ شفاعت پر گفتگو کی جائے اور اس بارے میں جو سوالات درپیش ہیں ان کے جوابات تحریر کئے جائیں۔

قیامت میں شفاعت

قرآن وسنت میں آیات وروایات کے لحاظ سے قیامت میں شفاعت کا ہونا ایک مسلم اور متفق علیہ مسئلہ ہے۔لیکن واضح ہے کہ بروز قیامت درگاہ الٰہی میں جو شفاعت ہوگی اس میں اور ہماری دنیا میں لوگوں کے دوسرے لوگوں کے ہاں شفاعت اور سفارش کرنے میں بہت زیادہ فرق ہے اور اس کی متعدد جہات ہیں۔

۱۔ دنیا میں شفیع کے لئے اپنی شفاعت کے اقدام میں فرمان روا سے اجازت لینا ضروری نہیں کہ جس کے ہاں شفاعت کرنا ہوتی ہے کہ وہ اس کی طرف سے باقاعدہ مجاز ہو۔لیکن بروز قیامت شفاعت کے لئے یہ قطعی اور لازمی شرط ہے کہ شفاعت کرنے والے کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت حاصل ہو۔لہٰذا فقط مجاز شفیع ہی درگاہ خداوندی میں شفاعت کا حق رکھتا ہے اور پروردگار کی اجازت کے بغیر کسی کو حق شفاعت نہ ہوگا۔

((من ذالذی یشفع عندہ الا باذنہ))

کون ہے جو دربار خداوندی میں کسی کی شفاعت کر سکے مگر اس کے اذن کے ساتھ؟

یَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ﴿۱۰۹﴾ [۱]

آج (روز قیامت) کسی کی شفاعت مفید نہ ہوگی مگر اسی کی جسے اس خداوند رحمن نے اذن شفاعت دیا ہوگا اور جس کی بات پر خدا راضی ہوگا۔

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ [۲]

اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی کی سفارش نافع نہیں ہوتی مگر اسی کی جسے اس نے اجازت دی ہے۔

---

[۱] سورۂ روم آیت ۱۰۹

[۲] سورۂ سباء آیت ۲۳

ناقابل معافی گناہ

۲۔ ممکن ہے کہ دنیا میں ہر قسم کے مجرموں اور گنا ہگاروں کی سفارش کرنے والوں کی سفارش فائدہ پہنچادے اور وہ لوگ حکام کی سزا سے نجات پا جائیں۔لیکن قیامت کے دن فقط وہی مجرم اور گنا ہگار شفاعت سے فائدہ اٹھا سکیں گے جو خداوند تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں اپنے شفعاء کے شفاعت کرنے پر راضی ہوگا۔لہٰذا جو لوگ اس دنیا سے حالت شرم میں اٹھے ہوں گے، ان کا گناہ ناقابل معافی ہے اور وہ کبھی بھی شفاعت کے قابل نہ بن سکیں گے۔

وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى [۱]

(مقربین الٰہی) دربار خدا میں فقط انہی کے حق میں شفاعت کریں گے کہ جن سے خداوند تعالیٰ راضی ہوگا۔

قال الحسين بن خالد فقلت للرضا عليه السلام يابن رسول الله فما معنى قول الله عزوجل ولا يشفعون الا لمن ارتضى قال: لا يشفعون لا لمن ارتضى دينه [۲]

حسین بن خالد کہتا ہے کہ میں نے حضرت امام رضا علیہ السلام کی خدمت میں عرض کی کہ اے فرزند رسولؐ! کلام خدا ''لا یشفعون الا لمن ارتضیٰ'' کا معنیٰ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا! مردان الٰہی شفاعت نہیں کریں گے مگر اس کی جس کے دین سے اللہ تعالیٰ راضی ہوگا۔

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى ﴿۲۶﴾ [۳]

کس قدر آسمانی فرشتے ہیں کہ ان کی شفاعت کچھ فائدہ نہیں دے سکتی مگر جب وہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بعد اس کے حق میں شفاعت کریں جسے خدا چاہتا ہے اور جس سے وہ راضی ہوتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ [۴]

اللہ تعالیٰ اس کو کبھی نہیں بخشے گا جس نے اس کے ساتھ شرک کیا ہوگا اور شرک سے کم تر جو گناہ ہیں ان کو ان افراد کے حق میں بخش دے گا جنہیں چاہے گا۔

---

[۱] سورۂ انبیاء آیت ۲۸

[۲] بحار الانوار، ج ۳ ص ۲۹۹

[۳] سورۂ نجم آیت ۲۶

[۴] سورۂ نساء آیت ۱۱۶

عدل کے مطابق شفاعت

۳۔ دنیا میں تو یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی سفارشی اپنے فرماں روا کو اپنی سفارش کے ذریع بڑھکائے اور اس سے ایک ظالمانہ اور ناحق اقدام کرنا ے۔ مثلاً کوئی اپنے دشمن سے انتقام لینے کے لئے حاکم کے ہاں سفارش کرائے اور اس ذریعے سے اپنے دشمن کو بے گناہ شکنجے اور عذاب کا شکار کرا دے۔ یا اگر وہ گناہ گار اور مجرم کی سزا میں اپنی سفارش کے ساتھ اضافہ کرا دے اور خلاف حق و انصاف اس کو زیادہ سزا دلوائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بذریعہ سفارش اپنے فائدے کے لئے کسی تیسرے آدمی کا حق ضائع کرا دے۔ لیکن بروز قیامت مردان خدا و مقربین الٰہی جو شفاعت کریں گے وہ عدل و انصاف کے مطابق اور حق پر پوری اترتی ہوگی۔ ان کی شفاعت سے گناہ گاروں کو جو عفو اور مغفرت حاصل ہوگی وہ کسی بھی دوسرے فرد کے معمولی سے معمولی حق کے ضائع ہونے کا باعث نہیں بنے گی۔

مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿٢٩﴾ [۱]

میرے ہاں بات تبدیل نہیں کی جاتی۔ (یعنی سزا کے بارے میں میرے جو قوانین لازم الاجراء ہوتے ہیں وہ کبھی بھی ادل بدل اور دگرگوں نہیں ہوتے) اور میں اپنے بندوں کے بارے میں ظالم اور ستم کار نہیں ہوں۔

آیات شفاعت اور اس کی خصوصیات میں چند ایک کے بارے میں جو گفتگو ہوئی ہے، اس کے بعد مناسب ہے کہ قیامت میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت اور دیگر شفعاء کی شفاعت کے بارے میں شیعہ و سنی علماء کی تحقیقات کا خلاصہ بیان کر دیا جائے۔ چنانچہ یہاں بعض ایسی روایات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جو فریقین کے سلسلہ اسناد سے روایت ہوئی ہیں:

قال العلامة قدس الله روحه فی شرحه علی التجرید:

انقت العلماء علی ثبوت الشفاعة للنبی صلی الله علیه وآله قوله تعالیٰ، عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿٧٩﴾ [۲]

علماء شیعہ اور شفاعت

علامہ حلی رضوان اللہ علیہ اپنی کتاب شرح تجرید میں رقمطراز ہیں:

تمام علماء کا اس اور پر اتفاق ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے حق شفاعت ثابت اور متحقق ہے۔ اس کے بعد آپ قرآن مجید کی اس آیت سے استفادہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کو نماز شب کا حکم دینے کے بعد فرمایا ہے'' ہوسکتا ہے کہ خداوند تعالیٰ اس کو کبھی بھی میری شفاعت سے بہرہ یاب نہیں فرمائے گا۔

---

[۱] سورۂ ق آیت ۲۹

[۲] سورۂ بنی اسرائیل آیت ۷۹

اہل بیت علیہم السلام سے کثیر روایات منقول ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کو حضرت رسول اکرمؐ کے علاوہ حضرت فاطمہ زہراؑ اور دیگر ائمہ طاہرین علیہم السلام، علماء، شہداء، مومنین اور فرشتوں کو بھی ذات شفاعت ہے اور وہ بروز قیامت شفاعت کریں گے۔

عن جعفر بن محمد عن آبائه عن علي عليهم السلام قال قال رسول الله (ص)
ثلثة يشفعون الى الله عزوجل فيشفعون الأنبيا ثم العلماء ثم الشهداء [۱]

شفعاء قیامت

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے اباء گرامی سے روایت کرتے ہیں، امام علی علیہ السلام نے بتایا کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: دربار الٰہی میں تین گروہوں کو شفاعت کا حق ہوگا اور ان کی شفاعت قبول ہوگی۔ انبیاء علماء اور ان کے بعد شہداء

قال الصدوق: اعتقادنا في الشفاعة انها لمن ارتضى دينه من اهل الكبائر و الصغائر فاما التائبون من الذنوب فغير محتاجين الى الشفاعة والشفاعة للانبياء والاوصياء وامومنين والمائكة [۲]

شیخ صدوق رضوان اللہ علیہ فرماتے ہیں: شفاعت کے بارے میں ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ شفاعت ان کے لئے ہوگی جن کا دین خداوند تعالیٰ کو پسند ہوگا، لیکن وہ گناہان کبیرہ وصغیرہ سے آلودہ ہوگئے ہوں گے۔ وہ لوگ جو موت سے قبل اپنے گناہوں کی توبہ کر لیں، انہیں بھی شفاعت کی ضرورت نہ ہوگی۔ اس کے بعد فرمایا: دربار خداوندی میں شفاعت کرنے کا حق انبیاء۔ اوصیاء۔ مومنین اور ملائکہ کے لئے ثابت ہے۔

علماء عامہ اور شفاعت

علماء خاصہ (اہل تشیع) میں سے اسی قدر نظریات کا بیان کافی ہے اور اب ہم شفاعت کے بارے میں علماء عامہ (اہل سنت) کا بیان نقل کرتے ہیں: [۳]

علماء عامہ میں سے ایک بہت بڑے عالم فخر الدین رازی، صاحب تفسیر کبیر فرماتے ہیں:۔ پوری امت مسلمہ اس امر پر اجماع رکھتی ہے کہ آخرت میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حق شفاعت حاصل ہے۔

---

[۱] بحارالانوار، ج ۳ ص ۲۹۹

[۲] بحارالانوار، ج ۳ ص ۲۹۹

[۳] اعتقادیہ شیخ صدوقؒ

عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: شفاعتی لا ھل الکبائر من امتی فمن کذب بھالم ینلھا[۱]

عامہ کی صحیح اسناد کے ساتھ کے مروی ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: میری شفاعت بروز قیامت میری امت میں سے ان افراد کے لئے ہوگی جو گناہان کبیرہ کے مرتکب ہوتے رہے اور جو میری شفاعت کی تکذیب کرے گا اس کو میری شفاعت کبھی نصیب نہ گی۔

قال ابن تیمیة فی رسالة زیادة القبور و اللہ سبحانہ لا یشفع عندہ احد حتی باذن ھو للشفع فلا یفعل الا ما شاء اللہ وشفاعة الشافع من اذنہ فالا مر کلمہ لہ[۲]

ابن تیمیہ ومحمد بن عبدالوہاب

ابن تیمیہ اپنے رسالہ زیارۃ القبور میں لکھتا ہے: درگاہ الٰہی میں کوئی بھی شفاعت نہیں کرسکتا جب تک اللہ تعالیٰ سے اذن نہ دے۔ پس کوئی شفاعت کرنے والا اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر کچھ نہیں کرسکتا اور اس کی شفاعت بھی اللہ تعالیٰ کے اذن کے ساتھ ہوتی ہے، کیونکہ تمام امور خداوند عالم کے اختیار میں ہیں۔

محمد بن عبدالوھاب فی الرسالة الثانیة من رسائل الھدیة السنیة ونثبت الشفاعة لنبینا محمد (ص) یوم القیامة ولسائر الانبیاء والملائکة والا ولیاء والاطفال حسما ورد[۳]

محمد بن عبدالوہاب اپنے رسائل ہدیۃ السنیۃ میں سے دوسرے رسالے میں لکھتا ہے: ہم اپنے نبی محمدؐ کے لئے روز قیامت میں حق شفاعت کو برحق مانتے ہیں اور اسی طرح تمام انبیاء۔ ملائکہ۔ اولیاء اور اطفال کے لئے بھی یہ حق تسلیم کرتے ہیں، جس طرح کہ روایات میں وارد ہوا ہے۔

وعنہ فی الرسالة الاولی من رسائل الھدة ووجب علی کل مسلم الایمان بشفاعه (ص) بن وغیرہ من الشفعاء[۴]

نیز محمد بن عبدالوہاب اپنے رسائل ہدیۃً السنیہ کے پہلے رسالے میں بھی لکھتا ہے ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ حضرت

---

[۱] تفسیر کبیر ج۱ ص ۵۰۳

[۲] تفسیر مراغی ج۱ ص ۱۱۰

[۳] کشف الارتیاب ص ۲۴۲۔۲۳۹۔۲۴۰

[۴] کشف الارتیاب ص ۲۴۲۔۲۳۹۔۲۴۰

رسول اکرمؐ کی شفاعت پر ایمان لائے بلکہ آپ کے علاوہ باقی شفعاء کی شفاعت پر بھی ایمان لائے۔

شفاعت اورامت مسلمہ

قرآن مجید کی ان آیات اور عامہ وخاصہ دونوں کی طرف سے جو روایات نقل ہوئی ہیں، نیز علماء عامہ وخاصہ ہر دو کے جو بیانات لکھے گئے ہیں۔ ان سب سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ قیامت میں شفاعت کا مسئلہ بطور اجمال ایک قطعی اور ناقابل انکار حقیقت ہے اور پر اسلامی امت کے نزدیک ایک تسلیم شدہ امر ہے۔

گزشتہ صدیوں میں شفاعت در قیامت کے مسئلہ پر بہت زیادہ بحث وتمحیص ہوئی اور کچھ لوگ اعتراضات کرتے رہے اور کچھ دوسرے ان کے جوابات دیتے رہے ہیں۔ اس گفتگو کے نتیجے میں شفاعت کے کم وکیف کے بارے میں اختلاف نظر قائم ہوتا رہا ہے، لیکن جہاں تک شفاعت کے وجود کا تعلق ہے تو یہ ایک ناقابل انکار حقیقت رہی ہے اور اس سے کسی نے انکار نہیں کیا۔

قیامت میں اصل شفاعت سے ہی انکار کردیں بلکہ اس اشکال کے لاجواب رہنے کو انہوں نے اپنے عجز وناتوانی کا نتیجہ قرار دیا۔

تفسیر المنار

یہاں ہم بطور نمونہ تفسیر المنار کے ایک مقام کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

الشفاعة المعروفة عند الناس هى يحمل الشافع المشعوع عنده على فعل اوترك كال اراد غيره حكم به ام لا فلا تتحق الشفاعةه الا بترك الا رادة و فسخها ال جل الشفيع

فاما الحاكم العادل انه لا يقبل الشفاعةالا اذاتفير علمه بما كان اراده او حكم به كان كان اخطا ثم عرف الصواب ورائى ان المصلحة والعدل فى خلاف ما كان يريدهٔ اوحكم به

واما الحاكم المستبد الظالم فانه يقبل شفاهة المقربين عنده فى الشيئى وهو عالم بأنه ظلم وان العدل فى خلافه ولكنه يفضل مصلحة ارتباطه بألشافع المقرب منه على العدالة وكل من انوعين محال على الله تعالىٰ لان ارادته تعالىٰ على حسب علمه وعلمه ازلى لا يتغير

قال سيخنا فما وردفى اثبات الشفاعة يكون على هذا من المتشابهاتيقضى مذهب السلف بألتفيض والتسليم وانها مزية يخص الله بها من يشاء يوم

القیامة عبر عنها بهذه العبارہ (الشفاعة) ولا نحیط بحقیقتها مع تنزیہ الله جل جلاله عن المعروف فی منی الشفاعة فی لسان التخاطب العرف واما مذهب الخلف فی التاویل قلنا ا ن لحمل الشفاعة فیه علی انها دعاء یستجیبه الله تعالیٰ بمثل هذا شیخ الاسلام ابن تیمیه وعزدة یعدوه تاویلا [1]

شفاعت عوام کی نگاہ میں

ترجمہ: عوام کی نگاہ میں جسے شفاعت خیال کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ شفاعت کنندہ ایک ''مشفوع عندہ'' یعنی حاکم کو آمادہ کرتا ہے کہ وہ اپنے سابقہ ارادہ کے خلاف کوئی کام کرے یا ترک کرے اس سے پہلے خواہ اس نے اپنے ارادہ کے مطابق حکم دے دیا ہو یا ابھی حکم نہ دیا ہو۔ پس شفاعت اس وقت متحقق نہیں ہوتی جب تک وہ صاحب اختیار حاکم اس شفیع کی خاطر اپنے ارادے کو ترک نہ کرے اور اپنے فیصلے میں تبدیلی نہ کر دے۔

پس اگر وہ حاکم عادل ہو تو وہ ہرگز کسی شفاعت کنندہ کی شفاعت کو قبول نہیں کرتا مگر جب کہ وہ اپنے اپنے ارادہ کردہ امر یا دیئے ہوئے حکم کے متعلق اپنے علم و آگاہی میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ گویا یہ بعینہ اس کی مثل ہوگا کہ جہاں اسے ابتداء حق کی تشخیص میں غلطی ہوگئی پھر اسے معلوم ہو جائے کہ حقیقت تو کچھ اور تھی اور واضح ہو جائے کہ مصلحت اندیشی یا انصاف کا تقاضا کچھ اور ہے کہ جس کے برعکس میں نے قبل ازیں سوچا یا اس کا ارادہ کیا اس کا حکم جاری کر دیا ہے۔ (پس جس طرح وہ حاکم اس صورت میں اپنا فیصلہ بدل کر نیا حکم جاری کر دیتا ہے اسی طرح شفاعت قبول کرنے کی صورت میں بھی سابقہ ارادہ یا فیصلہ بدل کر نیا فیصلہ اور حکم جاری کرتا ہے)۔

اگر وہ حاکم ایک خودسر، ظالم اور زبردستی کرنے والا شخص ہو تو وہ اپنے منظور نظر اور مقرب افراد کی سفارش کو قبول کر لیتا ہے حالانکہ وہ آگاہ ہوتا ہے کہ ان کی سفارش کا قبول کرنا حق کے خلاف ہے اور عدالت کا تقاضا تو یہ ہے کہ ان کی سفارش کو رد کر دیا جائے۔ لیکن ظالم حکمران ہمیشہ اپنے قریبی قریبی افراد سے تعلقات کو حق وعدالت کے تقاضوں پر ترجیح دیا کرتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ شفاعت کی یہ دونوں قسمیں پروردگار عالم کے حق میں ناممکن ہیں، کیونکہ اس کا ہر ارادہ ہمیشہ اس کے اپنے علم کی اساس پر ہوتا ہے اور اس کا علم ازلی اور ناقابل تغییر ہوتا ہے۔ (وہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا)۔

---

[1] تفسیر المنار، ج ا ص ۳۰۷

ایک اشکال

سید رشید رضا نے تفسیر المنار کی جلد اول میں سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۴۸ کے ذیل میں یہ اشکال نقل کیا اور پھر اس کو آیت الکرسی کے ذیل میں بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ گویا اس کی نظر میں یہ اشکال صحیح و درست ہے اور اس کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔ وہ اس اشکال کو نقل کرنے کے بعد مسئلہ شفاعت کی توجیہ کے لئے اپنے استاد عبدہ کی گفتگو دوہرانا شروع کر دیتا اور لکھتا ہے کہ میرے استاد محترم نے یوں فرمایا۔

اس اشکال کے پیش نظر ہمیں شفاعت کے اثبات میں وارد ہونے والی آیات و روایات کو متشابہات کی فہرست میں ڈال دینا ہوگا۔

علماء عامہ کی روش

اس مسئلے میں علماء متقدمین کی روش یہ رہی ہے کہ وہ اس کی بلا چوں و چرا تسلیم کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ حق شفاعت ایک امتیازی امر ہے اور بروز قیامت رب العزت جسے چاہے گا اسے یہ حق عطا کر دے گا۔ شرعی اصطلاح میں اس خصوصی نوازش کو لفظ ''شفاعت'' سے تعبیر کیا گیا ہے اور ہمیں اس کی حقیقت کا مکمل علم نہیں ہے۔ لیکن ہم خداوند تعالیٰ کی دنیوی شفاعت کے ان تمام نقائص سے پاک و پاکیزہ اور منزہ و مبریٰ جانتے ہیں جو ہمارے معاشرتی ماحول کی شفاعت میں پائے جاتے ہیں۔

لیکن اس مسئلے پر ہمارے متاخرین علماء کا انداز تاویلی ہے، یعنی وہ اس کی تاویل کرتے اور کہتے کہ ہم شفاعت کو دعا کے معنی پر حمل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ شفیع درگاہ الٰہی میں دعا کرتا ہے اور خداوند تعالیٰ اس کی دعا کو قبول کرتے ہوئے گناہ گار کو بخش دیتا ہے۔

اس کے بعد لکھتا ہے:۔ ابن تیمیہ اور بعض دیگر علماء بھی یہی کہتے ہیں اور شفاعت کو دعا کے معنی میں لیتے ہیں، لیکن وہ اسے تاویل میں شمار نہیں کرتے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اہل سنت میں سبھی علماء متقدین و متاخرین قیامت میں شفاعت کے مسئلے کو ایک ثابت اور اسلام میں تحقق یافتہ امر تسلیم کرتے ہیں۔ اس اشکال کے باوجود بھی کسی نے شفاعت کے انکار کی بات نہیں کی، بلکہ بعض حضرات نے اس کو متشابہات کی فہرست میں ڈالا ہے۔ یعنی انہوں نے اس کو سمجھنے سے اپنے عاجز ہونے کا اقرار کیا تو بعض دوسرے علماء نے شفاعت کو دعا کے ساتھ تاویل کیا ہے۔ نیز بعض علماء نے یوں کہہ دیا ہے کہ دراصل شفاعت کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک شفیع کی دعاء مستجاب ہے۔

اشکال کے بارے میں گفتگو

اس مقام کی مناسبت سے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس اشکال کے بارے میں مزید گفتگو کر لی جائے جو محمد عبدہ، سید رشید

رضا، مراغی اور دیگر علماء کی نگاہ میں مشتبہ بنا رہا ہے، ہم اس پر دو جہت سے بحث کریں گے۔

اول: یہ سب علماء شفاعت کے معنی کے بارے میں واقعی حقیقت تک پہنچنے سے قاصر رہے ہیں، حالانکہ اس واقعیت کی رو سے یہ اشکال بالکل بے اثر اور بنیاد ہی سے غلط قرار پاتا ہے۔

دوم: اگر ان کی نگاہ میں یہ اشکال وارد ہے تو بھی وہ ساری توجیہ جو وہ لوگ مسئلہ دعا میں ذکر کرتے ہیں وہ شفاعت کی توجیہ بھی بن سکتی ہے۔

پہلی جہت: شیخ محمد عبدہ کو قیامت میں مسئلہ شفاعت کو اس دنیا کی شفاعت پر قیاس کرنے میں جو اشتباہ اور غلطی لاحق ہوئی، اس کی بنیاد یہ ہے کہ وہ اس اشکال کے اصل موضوع یعنی وہ گناہ گار کہ جس کے حق میں شفاعت کی جاتی ہے۔ اس سے غافل رہ گئے ہیں اور اپنی ساری توجہ مشفوع عندہ یعنی خداوند علام کے علم و ارادہ کی طرف مرکوز کئے رہے ہیں۔

کسی مسلمان نے کبھی ایسا نہیں کہا اور نہ کوئی کہتا ہے کہ بروز قیامت پیغمبر اکرمؐ یا دیگر شفعاء کی شفاعت خداوند تعالیٰ پر اثر انداز ہوگی یا وہ علم الٰہی کو تبدیل کر دیں گے یا اس کے ارادے کو دگرگوں کر دیں گے۔ جناب عبدہ یا ان کے حامیوں کا یہ تصور کہ شفاعت کا تحقق حتمی طور پر مشفوع عندہ کے علم یا ارادے میں تبدیلی کو مستلزم ہے، دراصل اس میں انہوں نے خداوند تعالیٰ کا دنیا کے دیگر حکام پر مقائسہ کیا، اس لئے انہوں نے یہاں وہ اشکال وارد کر دیا ہے جو حقیقت میں کچھ بھی نہیں، لیکن ان کے خیال میں ناقابل حل رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شفیع کبھی بھی ذات اقدس الٰہی پر اثر انداز نہیں ہوتا اور وہ علم یا ارادہ خداوندی میں کوئی تبدیلی نہیں لاتا۔ بلکہ شفیع کا اثر انداز اس گناہ گار پر ہوتا ہے جو علم و ارادہ الٰہی کا موضوع قرار پایا ہوتا ہے پس وہ اس کی حالت اور کیفیت میں وہ تبدیلی کر دیتا جو باری تعالیٰ کے علم میں معلوم ہے۔

توبہ اور شفاعت

بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ ایک گناہ گار بغیر شفیع کے ہے اور اک گناہ گار کی شفیع اس کے ساتھ ہے، ان دونوں کی علیحدہ علیحدہ کیفیت ہے اور وہ ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ جب ایک شفیع کسی گناہ گار کے ساتھ ہو تو اس سے معلوم میں تبدیلی آتی ہے اور علم خدا میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ پس مراد خداوندی میں تبدیلی ہوتی ہے اور ارادۂ خداوند میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اس مطلب کو اچھی طرح واضح کرنے کے لئے ضروری ہوگا کہ ہم توبہ کے بارے میں بھی کچھ گفتگو کرتے چلیں۔ کیونکہ توبہ کرنے سے ایک تائب کی کیفیت اور اس کی پاکیزگی کے عمل میں جو تاثیر ظاہر ہوتی ہے، اس کی طرف توجہ کرنے سے اس تاثیر کی حقیقت بھی روشن ہو جائے گی جو شفیع کی طرح سے ایک گناہ گار مرتب ہوتی ہے۔

توبہ کا مطلب ہے ایک گناہ گار اپنے غلط راستے سے واپس پلٹ آئے اور اللہ تعالیٰ کی پسند کے خلاف جو کام کرتا رہا ہے اس پر پشیمان ہو جائے۔ وہ اپنے سابقہ کردار کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے عفو و درگزر کی درخواست کرے اور آئندہ کے لئے عزم مصمم

کرے کہ رضائے الٰہی کے مطابق اقدام کیا کرے گا۔

اگر کسی انسان کی اس طرح کی توبہ قبول ہوجائے تو وہ شخص گناہوں کی غلاظت سے پاک ہوجاتا ہے اور توبہ کی شفاعت کے ساتھ خدائی سزا سے خلاصی پالیتا ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ: لا شفیع انجح من التوبة [1]

رسول اکرمؐ نے فرمایا: توبہ سے بڑھ کر نجات دینے والا کوئی شفاعت کنندہ نہیں۔

ایک گناہ گار اپنی توبہ کے ساتھ علم خدا میں اور نہ ہی ارادہ خدا میں تبدیلی لاتا ہے بلکہ توبہ کے ذریعے وہ اپنے آپ کو اور اپنے صفات تبدیل کرلیتا ہے۔

توبہ اور گناہگار

توبہ سے قبل گناہ گار آدمی ایک خودسر اور گستاخ شخص ہوتا ہے جو اوامر الٰہی سے سرپیچی کئے رہتا ہے۔ اس نے سابق میں بھی گناہوں کا ارتکاب کیا ہوتا ہے اور آئندہ کے لئے بھی گناہوں پر برقرار رہنے کا عزم کئے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارادہ اس کے تمام برے اعمال اور اس کی بری نیت پر آگاہ ہوتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ کا ارادہ ایسے مجرم اور بدکردار فرد کو سزا دینے کا ہوتا ہے۔

لیکن توبہ کرنے کے بعد اس گناہ گار انسان کے اندر ایک تبدیلی آتی ہے تو اس کی نیت اور عمل بالکل بدل جاتے ہیں۔ وہ ذات اقدس الٰہی کا مطیع وفرمانبردار بندہ بن جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی حقیقت اور اس میں پیدا ہونے والی تبدیلی پر آگاہ ہوتا ہے۔ پس اس سے اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارادہ عفوورحمت کا ہوجاتا ہے۔

كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ ۙ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۴﴾ [2]

تمہارے رب تعالیٰ نے اپنے اوپر رحمت کو فرض کرلیا ہے کہ تم میں سے جو بھی جہالت ونادانی کی وجہ سے برائی کرے اور پھر توبہ کرلے اور صلاح وشائستگی کا راستہ اپنالے تو (وہ عفوودرگزر خداوند کے تحت آجائے گا) کہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

پس جس طرح موت سے قبل ایک گناہ گار کی توبہ ذات باری تعالیٰ پر اثر نہیں ڈالتی اور اس کے علم وارادہ کو دگرگوں نہیں کرتی۔ بلکہ خود اس گناہ گار میں تبدیلی لاتی ہے۔ جو علم وارادہ خداوندی کا موضوع بن رہا ہوتا ہے۔ وہ توبہ اس کی سزا کے مستحق ہونے کی طرح سے پروردگار کی رحمت کے استحقاق کی طرف کھینچ لے جاتی ہے۔ اسی طرح بروز قیامت ایک مجرم کے حق میں کسی شفیع کی شفاعت بھی اللہ کے علم وارادہ پر اثر انداز نہیں ہوتی، بلکہ گناہ گار کی کیفیت کو بدل دیتی ہے اور اس عفوورحمت الٰہی کے قابل بنا دیتی ہے۔

---

[1] بحارالانوار، ج ۳ ص ۳۰۶

[2] سورۂ انعام آیت ۵۴

بنابریں جناب شیخ محمد عبدہ کا یہ اشکال نادرست اور غیر موثر ہو جاتا ہے کہ شفیع کی شفاعت علم واراہ الٰہی پر اثر انداز ہوتی ہے، کیونکہ اس اشکال کی بنیاد کمزور اور نادرست ہے۔

دوسری جہت: دعا اور استغفار سے مراد درگاہ الٰہی میں بندے کا اقرار ذلت اور پروردگار عالم سے عفوو درگزر کی التجا کرنا ہے۔ گناہ گاروں کے لئے دعا کا اثر بھی توبہ کی طرح کا ہوتا ہے کہ دعا کرنے والا ذات اقدس الٰہی پر اثر انداز نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کے علم و ارادہ میں تبدیلی لاتا ہے۔ بلکہ گناہ گار کی حالت وصلاحیت میں انقلاب پیدا کرتا ہے اور اسے حق تعالیٰ کی رحمت کے لائق بنا دیتا ہے۔

دعا اور گناہگار

بالفاظ دیگر ایک گناہ گار انسان دعا و استغفار کے بغیر مورد فضل ورحمت الٰہی نہیں ہوتا۔ لیکن جب دعا و استغفار اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں تو علم خداوندی کا متعلق بدل جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں اب یہ موردعنایت خداوندی قرار پانے کا مستحق ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت واسعہ کو شامل ہو جاتی ہے۔

قُلۡ مَا يَعۡبَؤُاْ بِكُمۡ رَبِّي لَوۡلَا دُعَآؤُكُمۡۖ [1]

اے رسول گرامیؐ! کہہ دو کہ تمہاری دعا (تضرع وزاری) نہ ہوتی تو تم درگاہ خداوندی میں کوئی وزن اور کوئی قدر نہ رکھتے اور موردعنایت وشفقت حق تعالیٰ بھی واقع نہ ہو سکتے۔

اس آیت سے بخوبی استفادہ ہو رہا ہے کہ دعا لوگوں پر اثر دکھاتی ہے اور دربار خداوندی میں ان کی حیثیت کو تبدیل کر دیتی ہے۔ جو لوگ دعا و استغفار نہیں کرتے وہ موردعنایت خداوندی نہیں ہوتے اور اس درگاہ میں ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ لیکن یہی لوگ جب دعا کے ساتھ لب ہلاتے ہیں اور اس ذریعے سے اپنی عبودیت اور ذلت کے مقام کا اعتراف کرتے ہیں۔ تب وہ قدر و قیمت والے ہو جاتے ہیں اور باری تعالیٰ کی طرف سے عنایت ونوازشات کے قابل قرار پا جاتے ہیں۔

پس واضح ہوا کہ جناب محمد عبدہ، اور ان کے ہم خیال دیگر دانشور قیامت میں شفاعت کے مسئلے پر مشفوع لہ یعنی گناہ گار کی طرف سے غافل رہے ہیں اور انہوں نے اپنی ساری توجہ مشفوع عندہ یعنی خداوند تعالیٰ کی طرف مبذول کئے رکھی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دربار خداوندی میں قیامت کے دن کی شفاعت کو دنیا کے حکمرانوں کے ہاں سفارش پر قیاس کرنے لگے ہیں۔ پھر یہ نتیجہ نکال لائے ہیں کہ اس شفاعت کا اثر یہ ہوگا کہ شفیع ذات کردگار پر اثر اندار ہو جائے گا اور علم وارادہ خداوندی کا بدلنا لازم آجائے گا۔

پس اس امر کے پیش نظر کہ ذات واجب الوجود میں شفیع کا تاثیر کرنا ممکن نہیں اور ادھر بروز قیامت مسئلہ شفاعت کا وجود بھی ناقابل انکار ہے۔ وہ اس تاویل پر مجبور ہو گئے ہیں۔ کہ قیامت میں شفاعت کو شفیع کی دعا کے معنی میں تبدیلی کر دیں اور یوں کہیں:

---

[1] سورۂ فرقان آیت ۷۷

وليس في الشفاعة بهذا لا معنى ان الله سبحانه يرجع عن ارادة كان ارادها لاجل الشافع وانما هي اظهار كرامة للشافع بتنفيذ الازلية عقيب دعائه[۱]

شفاعت کی تاویل

شفاعت کی تاویل دعا سے اس معنی میں نہیں کہ پروردگار شفیع کے لئے اپنے ارادے سے عدول کر لیتا ہے اور اپنی تصمیم کو بدل دیتا ہے بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ شفیع کے احترام و اکرام کے مدنظر اس کے دعا کے بعد اپنے ارادے کو نافذ کرتا اور اپنے موقع پر اسے جاری کر دیتا ہے۔

ملاحظہ کیجیے کہ جناب عبدہ، شفاعت قیامت کی توجیہ میں کہہ رہے ہیں: اللہ کا ازلی ارادہ یہ رہا ہے کہ بروز قیامت مورد شفاعت قرار پانے والے گناہ گاروں کو بخش دے اور انہیں دائرہ عفو میں شامل کرے۔ لیکن اپنے شفعاء کے احترام و اکرام کے اظہار کے لیے اپنے اس ازلی ارادہ کو ان کی دعا کے بعد جاری فرمائے گا۔

ممکن ہے یہاں کوئی جناب عبدہ، سے کہے کہ آخر کیا مانع ہے کہ آپ شفعاء کی شفاعت کو بھی مشیت الٰہی کے متعلقات میں شامل کر لیں اور یوں کہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ازلی ارادہ یہ ہے کہ بروز قیامت لائق شفاعت گناہ گاروں کے بارے میں اپنے نیک اور پاک بندوں کی شفاعت کو قبولیت سے مشرف فرمائے اور انہیں مورد عفو و درگزر قرار دے۔ اس صورت میں آپ اس بات پر قادر ہو جائیں گے کہ ایک طرف سے ذات باری تعالیٰ میں شفیع کی تاثیر اور حق تعالیٰ کے ارادے میں تغیر کے لازم آنے والے اشکال سے چھٹکارا حاصل کر لیں۔ دوسری طرف آپ کے لیے بھی ضروری نہ رہے گا کہ شفاعت کے حقیقی معنی سے چشم پوشی کرتے ہوئے اس کی شفیع کی دعا کے معنی میں تاویل کریں۔

شفاعت اور ازلی ارادہ

پس حقیقت یوں ہے کہ بروز قیامت اذن یافتۂ شفعاء کی شفاعت خداوند تعالیٰ کے ازلی ارادہ کے طفیل میں ہے۔ جیسا کہ اس خالق قدیر نے رسول اکرمؐ کو مقام محمود پر فائز فرمانے کے ارادہ ازلی سے آگاہ فرماتے ہوئے قرآن شریف میں یوں ارشاد کیا:

وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿۷۹﴾[۲]

اگر قیامت میں پیغمبر اکرمؐ کی شفاعت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارادہ ازلی اور اجازہ خداوندی ثابت نہ ہوتا تو آپ کبھی بھی پوری صراحت کے ساتھ یوں نہ فرماتے:

---

[۱] تفسیر المنار ج ا ص ۳۰۸

[۲] سورۂ بنی اسرائیل آیت ۷۹

شفاعتی لاھل الکبائر من امتی [۱]

بروز قیامت میری شفاعت میری امت کے ان افراد کے لئے ہوگی جو گناہان کبیرہ کے مرتکب ہوں گے۔

اگر گناہ گاروں کے بارے میں اولیاءاللہ کی شفاعت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارادۂ زلی اور فیصلہ ثابت نہ ہوتا تو حضرت رسول خداؐ اپنی دختر نیک اختر حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کو یوں نہ فرماتے:

فاذا کان یوم القیامۃ تشفعین انت للنساء وانا اشفع للرجال [۲]

جب روز قیامت ہوگا تو اے زہراؑ آپ میری امت کی عورتوں کی شفاعت کریں گی اور میں مردوں کی شفاعت کروں گا۔

عن معاویۃ بن وھب قال سئلت اباعبداللہ علیہ السلام عن قول اللہ تبارك و تعالیٰ (لا یتکلمون الا من اذن لہ الرحمن وقال صوابا قال: نحن واللہ الماذونون لھم فی ذالك والقائلون صوابا جعلت فداك وما تقولون اذا کلمتم قال نمجد ربنا ونصلی علی نسبنا ونشفع لشیعتنا فلا یردتاربنا [۳]

معاویہ بن وہب سے مروی ہے کہ میں نے حضرت امام صادق علیہ السلام سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا۔

لَّا یَتَکَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴿۳۸﴾ [۴]

(بروز قیامت) کسی کو گفتگو کرنے کی طاقت نہ ہوگی مگر وہی جسے خداوند تعالیٰ نے اجازت دی ہوگی اور وہ صحیح اور درست بات کہے گا۔

امام علیہ السلام نے فرمایا: قسم بخدا! ہمیں ہی خداوند تعالیٰ کی طرف سے اذن ملا ہوا ہے اور ہم ہی اس روز درست بات کہیں گے۔ تو میں نے سوال کیا: آپ کیا کہیں گے؟ آپ نے فرمایا: ہم خداوند تعالیٰ کی بزرگی بیان کریں گے، رسول اکرمؐ پر درود پڑھیں گے، اپنے شیعوں کے حق میں شفاعت کریں گے اور اللہ تعالیٰ ہماری شفاعت کو رد نہیں فرمائے گا۔

قرآن مجید کی آیات اور شعیہ سنی روایات جو قیامت میں شفاعت کے بارے میں ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے ازلی ارادے اور الٰہی فیصلے کی خبر دیتی ہیں۔ یعنی نیک اور پاک لوگ بروز قیامت بمشیت ایزدی ماذون اور مجاز ہوں گے کہ ایسے گناہگاروں کے حق میں شفاعت کریں جن کے ایمان کو درگاہ اقدس الٰہی میں پسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ ہاں پروردگار عالم نے فرمایا ہے کہ ان کی شفاعت کو قبول فرمائے اور شفاعت کئے گئے افراد کو اپنی مغفرت ورحمت میں پناہ دے۔

---

[۱] جامع الاصول ج۱۱ ص ۱۲۴

[۲] بحار الانوار ج۱۰ ص ۱۶۷

[۳] بحار الانوار ج۳ ص ۳۰۱

[۴] سورۂ نباء آیت ۳۸

خلاصہ یہ ہوا کہ قیامت کے روز شفاعت کا تحقق اجمالی طور پر ایک یقینی امر ہے اور پوری امت اسلامیہ کا اس پر اتفاق ہے۔لیکن متقدمین ومتاخرین کے کلام میں جو اختلاف نظر پا تا پایا جاتا ہے وہ شفاعت کی خصوصیات اور کم وکیف وغیرہ سے مربوط ہے۔اصل شفاعت سے اس کا تعلق نہیں ہے۔اس موضوع کے بارے میں اتنی ہی بحث کافی ہے۔

شفاعت طلبی

اضافہ معلومات کے لئے ضروری ہے کہ دنیا میں استشفاع یا تشفع یعنی کسی کو شفیع بنانے یا کسی چیز سے اس دنیا میں شفاعت طلب کرنے کے بارے میں کچھ بحث وتمحیص کر لی جائے۔

اس بحث کے ضروری ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح گزشتہ بحث شفاعت در قیامت میں علماء اہل سنت اشتباہ سے دو چار ہوئے ہیں۔اسی طرح اس مسئلہ شفاعت در دنیا میں بھی وہ افراط وتفریط کا شکار ہوئے ہیں، اس سے نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان بزرگان، ان کے پیروکاران اور دیگر عامہ مسلمین کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔تا آنکہ مسلمانوں کا ایک گروہ اپنے موحد اور باایمان بھائی۔بہنوں کو مشرک اور کافر تک کہنے لگ گیا ہے۔سب سے بڑھ کر افسوسناک امر یہ ہے کہ یہ بد بینی اور غلط فکر اب بھی مسلمانوں میں موجود ہے۔

اس چیز کو مکمل طور پر واضح کرنے کے لئے ہم ابتداً صاحبان کی غلطی کی اساس اور بنیاد کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور حقیقی و غیر حقیقی شفعاء کے درمیان فرق کو واضح کرتے ہیں۔

جذبہ مشرکین

ناجائز پرستش اور شرک در عبادت کے بارے میں قرآن مجید کی متعدد آیات موجود ہیں۔لیکن دو آیتیں ایسی ہیں جن میں غیر خدا کی عبادت کی طرف مشرکین کو مائل کرنے والی چیز خود ان مشرکین کی زبان یہی در بار خدا میں شفاعت اور اس کے ہاں زیادہ قربت حاصل کرنے کا جذبہ ہے۔

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللهِ ۭ [1]

وہ (مشرکین) اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ایسی اشیاء کی عبادت کرتے ہیں جو نہ تو انہیں ضرر دے سکتی ہیں اور نہ ہی نفع پہنچا سکتی ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ یہ (بت) درگاہ الٰہی میں ہمارے شفعاء ہیں۔

اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ۭ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا

---

[1] سورۂ یونس آیت ۱۸

لِيُقَرِّبُونَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۭ[1]

آگاہ رہو کہ دین خالص از شرک اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ غیر کو اپنے اولیاء و (معبود) بنائے ہوئے ہیں (وہ کہتے ہیں) ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لئے کہ یہ ہمیں زیادہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے قریب کرتے ہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ ان کے درمیان ان امور کا فیصلہ کرے گا جن میں وہ باہم اختلاف کرتے ہیں۔

شرک کا معیار

اسلام کے مقدس دین اور سارے پیغمبران خدا کے توحیدی مکتب میں شرک درعبادت کا معیار غیر اللہ کی عبادت کرنا ہے۔ الٰہی رہبر توحید کی بنیاد کو مستحکم کرنے اور بندگی غیر خدا کی زنجیروں کو توڑنے کے لیے ہمیشہ غیر خدا کی عبادت کے خلاف جہاد کرتے اور قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق یہ کلمات استعمال کرتے تھے۔

اتعبدون، ماذا تعبدون، ولما تعبدون، ما تعبدون افتعبدون، انما تعبدون، و تعبدون،

لاریب کہ یہ دونو آیتیں بھی مشرکین کے بارے میں آنے والی دیگر آیات کی طرح شرک درعبادت کی بات کر رہی ہیں۔ ان کا بنیادی مقصد غیر خدا کی عبادت کو نابود کرنا ہے۔ اسی لئے ان کی ابتداء بھی ''ویعبدون'' اور ''مانعبدھم'' کے کلمات سے کی گئی ہے۔

البتہ ان دونوں آیات میں جو نکتہ قابل غور ہے وہ یہ کہ ان میں مشرکین کی غلط عبادت کے بیان کے ساتھ ساتھ اس ناجائز عبادت کے محرک کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ پہلی آیت میں مشرکین کی زبانی آیا ہے کہ ''یہ بت ہمارے شعفاء ہیں'' یعنی ان بتوں کی پرستش کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ یہ درگاہ الٰہی میں ہماری شفاعت کریں۔ دوسری آیات میں مشرکین کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ ''ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لئے کہ یہ ہمیں خداوند تعالیٰ کے زیادہ قریب کریں۔''

عبادت غیر خدا

واضح ہے کہ مشرکین کے شرک کی علت فقط غیر خدا کی عبادت ہے کہ جس کا تذکرہ ان دو آیات میں آیا ہے۔ اب یہ خیال کرنا کہ بتوں کو نزد خدا شفیع ماننے اور انکو خدا کے قرب کا ذریعہ تسلیم کرنے والے اعتقاد کو بھی ان کے شرک میں دخل ہے، لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ ان کا یہ احمقانہ اعتقاد تو ان کی نادانی اور فکری نارسائی کی دلیل ہے۔

واضح الفاظ میں یوں سمجھئے کہ مشرکین کا غیر خدا کی عبادت کرنا ایک نکتہ ہے اور اس غیر خدا کی عبادت کا محرک ایک دوسرا نکتہ ہے۔ جو چیز موجب شرک بنتی ہے، آدمی کو مشرکین کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے اور ابدی عذاب کا مستحق بنا دیتی ہے وہ غیر خدا کی عبادت

---

[1] سورۂ زمر آیت ۳

ہے نہ کہ اس کا وہ محرک جو اس شخص کو اس غلط عبادت پر آمادہ کرتا ہے۔

جو کوئی شفاعت کے حصول کے لئے بت کی پرستش کرتا ہے، وہ اس لحاظ سے مشرک ہے کہ اس نے غیر خدا کی پرستش کی ہے اور اس لحاظ سے احمق ہے کہ اس نے ایک جامد اور بے اثر موجود کو شفاعت کے لئے چن لیا ہے۔

جو کوئی بھی تقرب الٰہی کے لئے بت کی پرستش کرتا ہے، وہ اس لحاظ سے مشرک ہے کہ اس نے غیر خدا کی عبادت کی اور اس جہت سے نادان ہے کہ اس نے ایک بے اثر شئی کو تقرب خداوندی کے لئے منتخب کر لیا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم میں بیان کردہ ایک اور سبب کہ جس کی طرف اس میں کئی بار اشارہ ہوا، وہ یہ ہے کہ وہ لوگ اپنے آباء کی تقلید میں بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ اس میں بھی وہ لوگ اس لحاظ سے مشرک ہیں کہ بتوں کی عبادت کرتے ہیں اور اس لحاظ سے احمق ہیں کہ اس غلط روش میں اپنے آباؤ اجداد کی اندھی تقلید کرتے ہیں۔

شرک کی وجہ

مختصر یہ کہ ایک آدمی کو کسی ارضی یا سماوی شئی کی عبادت کی طرف تحریک کرنے والے عوامل متعدد ہو سکتے ہیں مثلاً تعصب۔ قومیت۔ تقلید۔ اقتباس عادت۔ خوف۔ طمع۔ شفاعت، تقرب اور اس کی مثل دیگر امور ہیں۔ پس جو کوئی بھی ان عوامل میں سے کسی ایک کی تاثیر میں آ کر غیر خدا کی عبادت اور پرستش کرتا ہے۔ نہ کہ وہ سبب اور عامل یا چند ایک اسباب وعوامل جن کی وجہ سے وہ ان ناروا عبادت کی طرف آیا ہے۔

ان ہر دو مذکورہ آیات میں مشرکین نے اپنی غلط عبادت کی توجیہ کی اور کہا کہ ہم بتوں کی عبادت نزد خدا شفاعت اور تقرب پروردگار کے لئے کرتے ہیں، مشرکین کی اس گفتگو نے بعض علماء عامہ کو اشتباہ میں ڈال دیا اور وہ یہ خیال کرنے لگے کہ جو ء کوئی کسی شخص یا شئی سے خدا کے ہاں شفاعت طلب کرے وہ مشرک ہے، اس لئے کہ ان مشرکین نے بھی اسی امر کو اپنے عمل کی علت قرار دیا ہے۔ لیکن وہ اس امر سے غافل رہے کہ مشرکین کے شرک کی علت بتوں سے شفاعت کوئی توقع کرنا نہیں۔ بلکہ ان کے شرک کا سبب غیر خدا کی عبادت اور بتوں کی پرستش کرنا ہے۔ جیسا کہ ان دونوں آیتوں میں ''ویعبدون'' اور ''مانعبدھم'' کے الفاظ کے ذریعے اس امر کی صراحت کی گئی ہے۔

محمد بن عبدالوہاب کا خط

محمد بن عبدالوہاب نے ۱۲۱۸ء میں ''شیخ الرکب المغربی'' کو ایک خط لکھا۔ اس خط اور اس کے ساتھ ملفوف کاغذات میں اس نے اپنے عقائد کی وضاحت کی اور پھر شیخ موصوف کو اپنے مذہب کی طرف دعوت دی۔ اس خط میں اس نے ان دونوں آیتوں کو بطور شاہد پیش کیا اور ان کو تفسیر وتوضیح میں خلاف واقع انداز اختیار کیا ہے۔ اس امر سے مکمل آگاہی کے لئے ہم ان دونوں آیتوں کے

بارے میں اس خط کی عبارت کو بعینہ نقل کئے دیتے ہیں:۔

لا نه سبحانه الاغنیاء عن الشرك ولا یقبل من المعل الا ما کان خالصا کما قال تعالی: فا عبدالله مخلصا له الدین، الخالص۔ والذین اتخذوا من دونه اولیاء مانعبدهم الا لیقر بونا الی الله زلفی فاخیر سبخانه انه لا یرضی من الذین الا ما کان خالصا لوجهه واخبران ان المشرکین یدعون الملئکة والا نیباء والصالحین لیقر بوهم الی الله زلفی ویشفعو الهم عندہ واخبر انه لا یهدی من هو کاذب کفار وقال تعالی: ویعبدون من دون الله مالا یضرهم ولا ینفعهم ویقولون هئولاء شععا نا عندالله الی قوله سبحانه و تعلیٰ عما یشرکون فاخبر انه من جعل بینه وبین الله وسائط یسالهم الشفاعة فقد عبدهم واشرك بهم و ذالك ان الشفاعة کلها الله[1]

ترجمہ: خداوند سبحانہ تعالیٰ شرک سے مکمل طور پر پاک و پاکیزہ ہے۔ اور کوئی بھی عمل اس کی درگاہ میں قبول نہیں ہوتا مگر وہ جو شرک سے پاک اور خالص ہو، جیسا کہ اس نے قرآن مجید نے فرمایا:

''خدا کی عبادت کرو اور دین کو اس کے لئے خالص کرلو۔ آگاہ رہو کہ دین خالص اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے۔ اور جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے غیر کو اولیاء بنالیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لئے کہ وہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے نزدیک تر کرتے ہیں۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو بتایا ہے کہ اس کی ذات اقدس کسی بھی دین و آئین کو پسند نہیں کرتی مگر اسی کو جو خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہو۔ اسی طرح اس سے بھی آگاہ کر دیا ہے کہ مشرکین ملائکہ، پیغمبران اور صالحین کو اس لیے پکارتے ہیں کہ وہ ان کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک لے جاتے اور درگاہ الٰہی میں ان کی شفاعت کرتے ہیں، نیز یہ بھی بتادیا ہے کہ خداوند عالم دروغ کو اور ناشکر گزار کو ہدایت نہیں کرتا۔

اسی طرح باری تعالیٰ نے فرمایا:

''مشرکین اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ایسے موجودات کی عبادت کرتے ہیں جو انہیں کوئی نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتے، وہ کہتے ہیں کہ ہمارے یہ معبود اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں ہمارے شفیع ہیں'' اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے آگاہ کر دیا ہے کہ جو شخص اپنے اور خدا کے درمیان واسطے تسلیم کرے اور ان واسطوں سے شفاعت کی درخواست کرے تو اس نے اپنے عمل کے ساتھ ان وسائل کی عبادت کی اور ان

---

[1] کشف الارتیاب ص ۲۱۷

کے ذریعے اس نے شرک کیا، کیونکہ ساری شفاعت خداوند تعالیٰ کے لئے ثابت ہے۔

محمد بن عبدالوہاب کی اس گفتگو پر محققانہ تبصرہ:۔

عبادت ودعوت

ا۔ قرآن مجید میں مشرکین کے عمل اوران کی کجروی کو دوکلمات اوردومادوں یعنی ''عبادت'' اور ''دعوت'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

غیر خدا کی عبادت اور پرستش جہاں ہو اوران کی جس شکل میں ہو شرک صریح ہے اور ناممکن ہے کہ غیر خدا کی عبادت متحقق ہو اور وہ مکتب اسلام یں شرک نہ قرار پائے۔ وہی انسان موحد ہے جو کبھی بھی غیر خدا کی پرستش نہ کرے اور اپنی عبادت میں کسی شخص یا کسی شئی کو خداوند تعالیٰ کا شریک نہ بنائے۔

وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿١١٠﴾[1]

دعوت کا متعلق

کلمہ توحید ''لا الہ الا اللہ'' نے مستحق عادت فقط اللہ تعالیٰ کو قرار دیا ہے، اس سے بھی یکتا پرستی اور توحید درعبادت کا سبق ملتا ہے۔

لیکن دعوت غیر خدا کو عبادت غیر خدا کی طرح ہر جگہ ہر شکل میں شرک صریح قرار نہیں دیا گیا، بلکہ یہ دعوت کے متعلق کے تابع ہے۔

پس اگر کوئی آدمی غیر خدا کو شریک خدا قرار دے اور پھر اس کو توحید کے مراتب میں ایک مرتبہ کے عنوان سے پکارے جب کہ ہر مرتبہ توحید اللہ تعالیٰ سے مختص ہے تو وہاں کہنا چاہئے کہ یہ دعوت اور یہ پکار ایک مشرکانہ عمل اور پکارنے والے کے شرک کی غماز ہے۔ لیکن اگر دعوت شان توحید سے مربوط نہ ہو تو پھر اس کے صحیح یا غلط ہونے کی تحقیق اس کے اپنے متعلقہ عنوان کے اعتبار سے انجام دی جائے گی۔

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ''دعوت'' کے مادے کو مختلف اشکال استعمال کیا گیا ہے، ان میں سے بعض دعوتیں مشرکانہ ہیں اور دعوت کنندہ یعنی دعا مانگنے والے کے شرک کا پتہ دیتی ہیں، لیکن بعض دیگر استعمالات بحث شرک وتوحید سے مکمل طور پر خارج ہیں۔ چنانچہ بطور نمونہ چند آیات پیش کی جاتی ہیں تاکہ دعوت کی یہ دونوں قسمیں سامنے آجائیں۔

اگر کوئی شخص غیر خدا کو ''الہ'' ماننے اور اس کو حق تعالیٰ کی الہیت میں شریک اور معبود تسلیم کرتے ہوئے پکارے تو یہ دعوت ''دعا'' مشرکانہ ہے اور دعا کرنے والا شرک درعبادت کے حکم میں آجاتا ہے۔ قرآن مجید میں متعدد آیات میں اس دعا کے مشرکانہ ہونے کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کو ممنوع اور قابل مذمت قرار دیا گیا ہے:

وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ

---

[1] سورۂ کہف آیت ۱۱۰

الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ [1]

اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرے معبود کو پکارتا ہے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں، سوائے اس کے نہیں اس کا حساب اس کے رب کے ہاں ہوگا بے شک کافر لوگ کبھی فلاح نہیں پائیں گے۔

قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ [2]

کہہ دو مجھے روکا گیا ہے کس سے کہ میں ان کی عبادت کروں جن کو تم اللہ تعالیٰ کے سوا پکارتے ہو۔

وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿۱۸﴾ [3]

اور بے شک سب مساجد اللہ تعالیٰ سے مختص ہیں پس تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو مت پکارو

وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ [4]

اور وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے۔

دعائے مشرکانہ

ان تمام آیات میں دو نکتے قابل توجہ ہیں،

اول: یہ کہ ان سب میں دعوت کے مادے کو مختلف شکلوں میں استعمال کیا ہے۔ غد۔ تدعون۔ تدعوا۔ یدعون۔

دوم: یہ کہ دعوت کا متعلق کسی کو معبود بنانا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے علاوہ بعض دیگر موجودات کو معبود بنانا اور عبادت کے لائق سمجھنا اس قسم کی دعوت اردعا شرک درعبادت ہے۔

اگر کوئی شخص غیر خدا کو خداوند عالم کے مقابلے میں اصلی قدرت کا مالک اور اس جہان کا نظام چلانے میں مستقل ارادہ رکھنے والا تسلیم کرے اور اس کو اس وحدہ لاشریک کی ربوبیت میں شریک مان کر پکارے تو یہ دعا اور یہ دعوت بھی مشرکانہ ہوگی اور یہ پکارنے والا۔ دعا مانگنے والا شرک افعالی کا مرتکب ہوگا۔ قرآن کریم نے اس قسم کی دعا کو بھی ممنوع مذموم اور مطرود قرار دیا ہے۔

وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا یَسْتَجِیْبُوْنَ لَهُمْ بِشَیْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّیْهِ اِلَی الْمَآءِ لِیَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ [5]

---

[1] سورۂ مومنون آیت ۱۱۷

[2] سورۂ انعام آیت ۵۶

[3] سورۂ جن آیت ۱۸

[4] سورۂ فرقان آیت ۶۸

[5] سورۂ رعد آیت ۱۴

اور جو لوگ غیر اللہ کو پکارتے ہیں تو وہ ان کی پکار کا کوئی مثبت جواب نہیں دے سکتے۔ مگر ان کی مثال اس شخص کی ہے جو پانی کی طرف اپنے دونوں ہاتھوں کو جدا جدا پھیلائے ہو کہ پانی اس منہ کے تک پہنچ جائے، حالانکہ وہ کبھی بھی اس تک نہیں پہنچے گا۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ؕ۝۱۳ [1]

وہ اللہ ہی تمہارا پروردگار ہے۔ اسی کے لئے (اس کائنات) کی بادشاہی ہے اور اس کے علاوہ تم جن کا پکارا کرتے ہو وہ تو ایک گٹھلی کے چھلکے کے بھی مالک نہیں ہیں،

وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ۝۱۹۷ [2]

اور جنہیں تم خداوند تعالیٰ کے سوا پکارا کرتے ہو وہ نہ تمہاری مدد کر سکتے ہیں اور نہ ہی وہ اپنی مدد کرنے پر قادر ہیں۔

''دعوت'' دعا مانگنا اور پکارنا غیر خدا کو کہ جن کا ان میں اور اس قسم کی دیگر آیات میں ذکر آیا ہے، یہ غیر خدا کی عبادت اور پرستش کی مثل ہے اور یہ شرک کا معنی دیتا ہے۔ فقط اس فرق کے ساتھ کہ غیر خدا کی عبادت فقط شرک در عبادت کا موجب بنتی ہے اور غیر خدا سے دعا مانگنا اور دعوت کرنا یہ ممکن ہے شرک عبادی ہو جائے اور ممکن ہے شرک افعالی بن جائے۔

عبادت غیر خدا

غیر خدا کی عبادت ہر جگہ شرک کی دلیل ہے، لیکن غیر خدا کی دعوت ہر جگہ شرک کے معنی میں نہیں، کیونکہ ''عبادت'' کا معنی ہے پرستش کرنا اور ذات اقدس الٰہی کے علاوہ کوئی شخص یا کوئی شئی قابل پرستش نہیں ہو سکتی لیکن ''دعوت'' کا معنی ہے پکارنا اور یہ فقط اس صورت میں شرک کی دلیل بنتی ہے جہاں اس کا تعلق توحید کی ضد سے ہو۔ اگر دعوت کا موضوع اور اسکا متعلق توحید کے خلاف نہ ہو تو وہ شرک و توحید سے خارج ہو جائے گی۔

لوگ اپنے اجتماعی رابطے میں ہمیشہ ایک دوسرے کو پکارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اور مدد کے لئے یہ بلانا اور پکارنا ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ چونکہ انسان کی اجتماعی زندگی کا سلسلہ اس کے بغیر نہیں چل سکتا، اس لئے اس کا شرک و توحید کے مسئلے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

دعوت غیر خدا

قرآن مجید میں کوئی ایک مقام بھی ایسا نہیں جہاں ''عبادت'' کی لفظیں غیر خدا کی پرستش کے معنی میں استعمال کی گئی ہوں اور اسلام نے اس کو اللہ تعالیٰ سے شرک قرار نہ دیا ہو۔ لیکن ''دعوت'' کی لفظیں غیر خدا کو پکارنے کے معنی میں مردان خدا کی زبان سے

---

[1] سورۂ فاطر آیت ۱۳

[2] سورۂ اعراف آیت ۱۹۷

مکرراً جاری ہوئی ہیں اور کسی شکل میں وہاں شرک وتوحید کی بحث کا عمل دخل نہیں ہوا ہے۔

قَالَتْ إِنَّ أَبِي يَدْعُوكَ لِيَجْزِيَكَ أَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا [1]

اس لڑکی نے کہا۔ تحقیق میرا باپ تجھے بلا رہا ہے تا کہ ہمیں سیراب کرنے کی اجرت عطا کردے۔

إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُونَ عَلَىٰ أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أُخْرَاكُمْ [2]

جب تم بلندی پر چڑھے جارہے تھے اور کسی ایک کو مڑکر نہیں دیکھتے تھے۔ اور رسول تمہیں تمہاری آخری (صفوں) میں کھڑا پکار رہا تھا۔

فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ [3]

پس جو تمہارے ساتھ اس بارے میں جھگڑا کرتا ہے بعد اس کے کہ تمہارے ہاں یقین آچکا ہے تو اس سے کہہ دو آؤ ہم اپنے بیٹوں اور تمہارے بیٹوں کو پکارتے ہیں۔

لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا [4]

اور تم رسولؐ کو کارنے کو آپس میں ایک دوسرے کو پکارنے کی مثل نہ بناؤ۔

ان چار آیات میں ''دعوت'' کے مادے سے یدعوک۔ یدعوکم ندع اور دعاء استعمال ہوئے ہیں، ان سب میں غیر خدا کو پکارنا مراد ہے اور اسی ایک مقام کا بھی شرک وتوحید سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہمارے مورد بحث دونوں آیات میں غیر خدا کی ''عبادت'' کو صریحاً شرک بنایا اور فرمایا کہ مشرکین غیر خدا کی پرستش کرتے ہیں

لیکن محمد بن عبدالوہاب نے شفاعت طلبی کو مسترد کرنے کے لئے ان دونوں آیات کی تفسیر میں ''دعوت'' اور ''سوال'' کو رکھ دیا اور اس سے ایک غلط تفسیر اور باطل نتیجہ برآمد کرلیا ہے۔

پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کا یہ قول نقل کیا ہے:

ما نعبدهم الا ليقربونا الى الله زلفى

محمد بن عبدالوہاب نے اس کی تفسیر میں یوں کہا:

---

[1] سورۂ قصص آیت ۲۵

[2] سورۂ آل عمران آیت ۱۵۳

[3] سورۂ آل عمران آیت ۶۱

[4] سورۂ نور آیت ۶۳

واخبران ان المشرکین یدعون الملائکة والانبیاء والصالحین لیقربو هم الی الله زلفی و یشفعوالهم عنده

اسی طرح دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کا فرمان یہ ہے۔

ویعبدون من دتون اله مالا یضرهم ولا ینفعهم و یقولون هٰؤلاء شفعاء نا عندالله

لیکن محمد بن عبدالوہاب اس کی تفسیر میں یوں گویا ہے:

فاخبرانه من جعل بینه وبین الله وسائط یسالهم الشفاعه فقد عبد هم واشرك

دراصل محمد بن عبدالوہاب نے یہ خیال کرلیا تھا کہ غیر خدا کو پکارنا سو فیصد غیر خدا کی عبادت کرنے کے مساوی ہے۔ اسی لئے وہ ''یعبدون'' کی تفسیر ''یدعون'' سے کرتا رہا اور آج بھی کئی لوگ انہیں افکار کے پیروکار ہیں۔ وہ اپنی غلط فکر کو قرآنی توحید خیال کرتے ہیں اور دوسروں کو کفر و شرک کے ارتکاب کی نسبت دیتے ہیں۔

ان لوگوں سے پوچھنا چاہئے کہ اگر تم کسی نکاسی کے گندے نالے میں گر جاؤ اور ابھی زندہ ہو یا اگر زلزلے میں تمہارے مکان کی چھت تم پر گر پڑے اور تم کسی ستون وغیرہ کے نیچے زندہ موجود ہو تو کیا وہاں فریاد نہیں کروں گے؟ اگر تم نے فریاد کی اور لوگ تمہاری مدد کو آن پہنچے تو کیا تم خود کو مشرک قرار دے دو گے؟ اگر تم نے لوگوں کو مدد کے لئے نہ پکارا اور اس گندے نالے کی تہ میں یا اس کھنڈر کے نیچے جان جان آفرین کے حوالے کر دی تو کیا درگاہ خداوندی میں خود کو خودکشی کا مجرم نہیں بناؤ گے۔؟

عبادت غیر خدا اور دعوت غیر خدا

غیر خدا کی عبادت اور غیر خدا کی دعوت میں باہم فرق ہے اور اسلام سے آگاہ مسلمان جانتا ہے کہ اگر وہ مکان کے ملبے کے نیچے یا کسی پرانے کنویں کی تہ میں چند گھنٹوں کے لئے مقید ہو جائے تو جب تک وہ زندہ اور باہوش ہے، اسے عبادت برائے خدا کے فریضے کو انجام دینا چاہئے، اگر ایسی گھٹائی میں بھی اس نے غیر خدا کی عبادت کی تو مشرک ہے۔ لیکن اگر اسی حالت میں وہ غیر خدا کو پکارے۔ فریاد کرے اور رہگذر افراد کو مدد کے لئے بلائے۔ تا کہ وہ اس کی کمک کریں اور اسے اس خطرے سے نکال لیں تو وہ جانتا ہے کہ یہ فریاد اور پکار نہ فقط شرک نہیں بلکہ اگر وہ لوگوں کو نہ پکارے اور خاموش رہے تا آنکہ مر جائے تو شرعاً عقلاً مستحق سزا و توبیخ ہے۔

یہ بھی بتا دیا جائے کہ ایک غیر مشرکانہ پکار و فریاد ممکن ہے صحیح اور عاقلانہ یا غیر صحیح و احمقانہ ہو۔ مثلاً ایک بیمار اپنے درد کی تسکین اور بیماری کے علاج کے لئے ماہر ڈاکٹر کو پکارتا ہے اور ایک دوسرا بیمار اپنے علاج کے لئے ایک فالگیر نجومی اور رمال کو دعوت دیتا ہے۔ اب یہ دونوں دعوتیں مشرکانہ نہیں کہ دونوں بیماروں نے طبیب یا رمال میں سے کسی کو خداوند تعالیٰ کی الٰہیت میں شریک نہیں مانا اور نہ ہی

ان کو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت میں شریک تسلیم کیا ہے۔ لیکن طبیب کو دعوت دینا اور پکارنا ایک صحیح اور عاقلانہ عمل ہے، جب کہ فالگیر نجومی اور رمال کو پکارنا ایک غیر صحیح اور احمقانہ اقدام ہے۔

۲ قرآن کی مدد سے آیت کریمہ سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ مشرکین اپنے باطن میں اس امر کی خواہش رکھتے تھے کہ خداوند تعالیٰ کے نزدیک ہوں، لیکن اس کے لئے انہوں نے یہ سوچا ہمارے اس ہدف کے حصول کا راستہ معبودوں (بتوں) کی عبادت کرنا ہے۔ ہاں تو بجائے اس کے کہ وہ خداوند تعالیٰ سے اپنے باطنی میلان کا اظہار بلاواسطہ دعا یا طلب کے ذریعے کرتے، انہوں نے ان خداؤں کی پرستش کا راستہ اختیار کرلیا۔ پھر کہنے لگے کہ ہماری ان بتوں کی عبادت کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ یہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے قریب کریں گے۔ گویا ان مشرکین کی نظر میں اس عبادت اور تسقرب خدا کے درمیان ایک خاص قسم کا حقیقی رابطہ موجود ہے۔ پس بقول ان کے اگر مشرکین عبادت کے فریضے کو انجام دیں تو یہ معبود ''بت'' بھی اپنے وظیفے کو انجام دیں گے اور ان کو خداوند تعالیٰ کے نزدیک کردیں گے۔

حقیقی راہ سے انحراف

محمد بن عبدالوہاب نے جو ''عبادت'' کا معنی ''دعوت'' کر کے ایک غلطی کو اپنایا تو اب ناگزیر ہو گیا کہ وہ آیت کی تفسیر میں حقیقی راہ سے انحراف کا شکار ہو جائے۔ چنانچہ اس نے کہا

واخبر ان المشرکین یدعون الملائکۃ ولانبیاء والصالحین لیقربوھم الی اللہ زلفی ویشفعولھم عندہ

کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بتایا ہے کہ کہ مشرکین فرشتوں۔ پیغمبروں اور صالحین سے دعا و درخواست کرتے تھے کہ وہ ان کو خداوند تعالیٰ کے نزدیک کریں اور درگاہ الٰہی میں ان کے لئے شفاعت کریں۔ حالانکہ آیت کریمہ میں تو اس دعوت۔ دعا اور درخواست وغیرہ کا کوئی تذکرہ ہی نہیں آیا ہے۔

۳ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو کوئی شئی یا شخص کو خداوند تعالیٰ کے سوا اپنا ولی تسلیم کرے اور پھر پروردگار عالم کا تقرب حاصل کرنے کی نیت سے اس شئی کی عبادت کرنے لگے تو وہ مشرک ہے، لیکن آیت کریمہ میں فرشتوں۔ انبیاء و صالحین کا نام نہیں لیا گیا۔

شفاعت طلبی کی مخالفت

مگر محمد بن عبدالوہاب چونکہ مردان خدا سے شفاعت کی درخواست کرنے کا مخالف ہے اور چاہتا ہے کہ اس آیت سے اپنے نظریئے کے اثبات کا فائدہ اٹھائے۔ اس لئے اس نے ایک طرف سے تو ''نعبدہم'' کا معنی ''یدعون'' بنا دیا اور دوسری طرف غیر خدا کے عنوان میں فقط ملائکہ۔ انبیاء اور صالحین کا نام لیا ہے۔ پھر اس سے نتیجہ نکالا ہے کہ اگر مسلمان پیغمبر اکرمؐ۔ دیگر انبیاء۔ ملائکہ اور صالحین

سے شفاعت کی درخواست کریں تو مشرکین کی روش کے پیروکار جاتے ہیں، کیونکہ قرآن کریم نے اس روش کو مذموم قرار دیا ہے۔
بالفرض اگر محمد بن عبدالوہاب کی بات کو تسلیم کرلیا جائے کہ اولاً تو آیت میں آنے والے ''عبادت'' کے لفظ کو ''دعوت'' کے معنی میں لیا جائے، ثانیاً غیر خدا سے مراد ملائکہ۔ پیغمبران اور صالحین مان لئے جائیں۔ لیکن پھر بھی محمد عبدالوہاب کا نظریہ ثابت نہیں ہو سکتا اور اس سے مقربین درگاہ خدا سے شفاعت طلبی کو ایک مشرکانہ عمل اور مشرکین کی روش کی پیروی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ قرآن مجید کی ایک دوسری آیت میں یوں ارشاد ہے۔

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٨٦﴾ [۱]

اور جن کو وہ لوگ خداوند تعالی کے سوا شفاعت کے لئے پکارتے ہیں وہ کوئی حق شفاعت نہیں رکھتے۔ مگر شفاعت کا حق اس کو حاصل ہے جو حق و توحید کی شہادت دے اور اس کا یہ اعتراف بصیرت و آگاہی کی اساس پر ہو۔

اس آیت میں وہ دونوں لفظ صراحتاً استعمال ہوئے ہیں جو محمد بن عبدلوہاب کے استدلال کی بنیاد ہیں۔ یعنی ''یدعون'' اور ''شفاعت'' ہاں واضح ہے کہ ملائکہ۔ انبیاء اور صالحین سبھی شہداحق ہے۔ (حق کی شہادت گہری بصیرت کے ساتھ دیتے ہیں۔ پس وہ اس آیت کا کامل مصداق ہیں)

محمد عبدالوہاب کی نگاہ میں جس قدر خصوصیات او جزئیات ملحوظ تھیں اور سابقہ آیت میں وہ صراحت کے ساتھ موجود نہ تھیں، وہ اس آیت میں بڑی صراحت کے ساتھ موجود ہیں۔ لیکن ان کا نتیجہ پہلی آیت کے اس نتیجے کے بالکل برعکس برآمد ہوا ہے جو محمد بن عبدلا وہاب نے برآمد کیا تھا۔ یہ آیات اپنے اندر دو مطالب رکھتی ہے۔ ایک لوگوں کا شفعاء سے شفاعت کی درخواست کرنا اور دوسرے شفعاء کا شفاعت کی صلاحیت رکھنا۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے شفاعت طلب کرنے کے مسئلے پر بلا واسطہ کوئی بات نہیں کی اور صریحاً نفی یا اثبات نہیں فرمایا، البتہ آیت میں شفعاء کی صلاحیت کے بارے میں گفتگو فرمائی ہے۔

شفعاء کی صلاحیت

اس آیت کا ارشاد ہے: غیر خدا سے شفاعت طلب کرنا اس جہت سے غیر صحیح ہے کہ مشرکین کے شفعاء بت درخت اور حیوان وغیرہ کی قسم سے ہیں جو شفاعت کا حق نہیں رکھتے اور شفاعت کے مالک نہیں ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ شہادت توحید دینے والوں اور اپنے اس اقرار میں معنوی بصیرت و آگاہی کو اساس بنانے والوں کو اس حکم سے مستثنیٰ کر رہا ہے۔ یعنی یہ گروہ حق شفاعت رکھتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ ان صفات کا عالی ترین مصداق ملائکہ۔ انبیاء اور صالحین ہیں۔ ہاں وہی ہیں جن کو محمد بن عبدالوہاب نے اس پچھلی آیت کے ذیل میں نامزد کیا اور اس شفاعت طلب کرنے کو مشرکانہ عمل قرار دیا ہے۔
باالفاظ دیگر قبل از اسلام کئی صدیوں تک لوگوں کی روش یہ تھی کہ وہ مختلف قسم کی اشیاء سے شفاعت طلبی کرتے اور انہیں

---

[۱] سورۂ زخرف آیت ۸۶

اپنا شفیع بناتے تھے۔ کچھ لوگ بت، درخت یا حیوان کو شفیع بناتے اور کچھ حضرت عیسیٰؑ۔ حضرت عزیر اور ملائکہ کو شفیع بناتے اور ان سے شفاعت کی درخواست کرتے۔

ان کا یہ عمل مکتب توحیدی اور اسلامی تربیتی نظام میں دو لحاظ سے قابل تحقیق تھا، ایک یہ کہ کیا غیر خدا سے شفاعت طلبی صحیح ہے یا نہیں؟

دوسرا یہ کہ لوگوں نے جنہیں شفیع بنا رکھا ہے وہ شفاعت کی صلاحیت رکھتے ہیں یا نہیں؟

چونکہ پہلا سوال دوسرے سوال سے مربوط تھا، یعنی شفاعت طلبی کی صحت و عدم صحت شفیع کی صیلاحیت و عدم صلاحیت سے مربوط ہے، اس لئے قرآن شریف نے اس آیت میں سیدھا شفاعت طلبی پر تبصرہ نہیں کیا۔ بلکہ دوسرے سوال کا جواب دیا ہے اور لوگوں کی شفعاء کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے، ایک گروہ شفاعت کی صلاحیت رکھنے والا اور دوسرا صلاحیت نہ رکھنے والا۔ چنانچہ اس انداز سے قرآن مجید نے پہلے سوال کا بھی جواب دے دیا ہے۔

پہلے گروہ کے بارے میں فرمایا:

ولا یملك الذین یدعون من دونه الشفاعة

وہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ جنہیں شفاعت کے لئے پکارتے ہیں، وہ شفاعت کے مالک نہیں ہیں اور حق شفاعت نہیں رکھتے۔

جو مالک شفاعت نہیں

آیت کا یہ جملہ مکمل وضاحت اور صراحت کے ساتھ لوگوں کو سمجھا رہا ہے کہ تمہارے منتخب کردہ یہ شفعاء جو جمادات۔ نباتات۔ حیوانات اور انسان ہیں، یہ شفاعت کے مالک نہیں اور نہ ہی درگاہ الٰہی میں شفاعت کر سکتے ہیں۔ نیز بالواسطہ انہیں یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ اس قسم کے موجودات سے شفاعت طلب کرنا ایک لغو اور بے ہودہ عمل ہے، یہ ایسے ہی ہے کہ ایک آدمی کسی جاہل اور عام شخص سے درخواست کرے کہ وہ اسے اعلیٰ ریاضی کا درس پڑھائے۔ یا کوئی کسی بھوکے نادار اور بے حال فقیر سے مطالبہ کرے کہ وہ اسے دولت کے انبار عنایت کرے یا اس سے درخواست کرے کہ فلاں عظیم ترین محل کو میرے حق میں واگزار کر دے۔

لیکن دوسرے گروہ کا تذکرہ استثناء کی شکل میں کیا گیا ہے۔

الا من شهد بالحق وهم یعلمون

مگر وہ کہ جو حق کی شہادت دے اور اس کا آگاہ و عالم ضمیر اس کی شہادت ک ساتھ ہم آہنگ ہو۔ (یعنی ظاہر و باطن ایک ہو)۔

جو شفاعت کے مالک ہیں

آیت کا یہ جملہ بھی بلاواسطہ اور پوری صراحت کے ساتھ یہ بات سمجھا رہا ہے کہ مقربین درگاہ الٰہی شفاعت کے مالک ہیں

اور حق شفاعت بھی رکھتے ہیں۔ اس سے بالواسطہ یہ نکتہ بھی کھل جاتا ہے کہ لوگوں کا ان ہستیوں سے شفاعت کی درخواست کرنا۔ ناجائز اور بے ہودہ نہیں ہے۔ پس اگر محمد بن عبدالوہاب کے نظریئے کے مطابق اولیاء اللہ سے شفاعت طلبی کرنا خدا سے شرک ہوتا تو اب مناسب مقام تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے شہداء حق کو مالک شفاعت بتا دیا تو لوگوں کو ان سے شفاعت طلب کرنے سے منع کر دیتا اور صریحاً کہہ دیتا کہ تمہارا اور تمہارے بزرگان کا ان مقرب درگاہ خدا ہستیوں سے شفاعت طلبی کرنا ایک ناروا اور مشرکانہ عمل ہے۔ نہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کے برعکس ان کے حق شفاعت رکھنے کی تائید کر دے اور شفاعت طلبی کے بارے میں سکوت اختیار کرے۔ جب کہ آیت کے متن میں ''یدعون'' کے آجانے سے معلوم ہو رہا ہے کہ شفاعت کے حکم کی ضرورت اس معاشرے کی ایک اہم ترین ضرورت ہے۔ البتہ یہ امر یاد رہے کہ مردان خدا اور شہداء حق کی شفاعت میں بھی محل شفاعت کا قابل شفاعت ہونا شرط ہے۔

وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى [1]

اور شفاعت نہیں کرتے مگر انہیں کے لئے جن کو اللہ (تعالیٰ) نے پسند کیا ہو۔

قابلیت شفاعت

یعنی وہ لوگ جو معنوی اعتبار سے موحد اور یکتا پرست ہیں اور ان کا ایمان اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، ان میں صرف یہی نقص ہے کہ وہ گناہوں سے آلودہ رہے۔ اگر وہ شفاعت کی درخواست کریں تو ممکن ہے کہ قبول ہو جائے اور یہ لوگ مردان الٰہی کی شفاعت کے سائے تلے آجائیں۔ اور عذاب خداوندی سے نجات پالیں۔ ورنہ جو مشرک ہیں اور حضرت عیسیٰ یا دیگر مقربان الٰہی بزرگان کو معبود مانتے اور ان کی عبادت کرتے ہیں، وہ اس قابل نہیں ہیں کو حضرت عیسیٰ یا دیگر مردان خدا ان کی شفاعت کریں، کیونکہ اللہ تعالیٰ سے شرک کرنا ناقابل عفو گناہ ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ [2]

۴ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔ مشرکین اللہ تعالیٰ کے سوا ایسی اشیاء کی عادت کرتے ہیں جو ان کے نفع یا نقصان پر قادر نہیں ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ بت درگاہ خداوندی میں ہمارے شفیع ہیں۔ یہ آیت بھی دو مطالب پر مشتمل ہے۔ ایک یہ کہ مشرکین چند خود ساختہ اور بے اثر معبودوں کی عبادت کرتے ہیں۔ دوسرے ان مشرکین کی زبانی یہ بات نقل کی ہے کہ یہ معبود اللہ تعالیٰ کے ہاں ہمارا شفیع ہیں۔

سابق میں ہم نے واضح کیا ہے کہ ان لوگوں کے شرک کا سبب اس آیت کے پہلے حصے میں بیان ہوا جو غیر خدا کی عبادت کرنا ہے۔ آیت کے دوسرے حصے میں ان کا ان معبودوں کو شفیع سمجھنا، ان کے شرک در عبادت کے تحقق میں بنیادی دخل نہیں رکھتا، بلکہ یہ تو

---

[1] سورۂ انبیاء آیت ۲۸

[2] سورۂ نساء آیت ۴۸

ان کی مشرکانہ عبادت کے محرکات میں سے ایک محرک ہے۔

شرک کا سبب

اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں مشرکین کے بارے میں آنے والی متعدد آیات میں غیر خدا کی عبادت کا شرک کے اصل سبب کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔یعنی آیت کے پہلے حصے کا بیان بکثرت دہرایا گیا ہے۔لیکن دوسرے حصے کا بیان کہ جس کا ان بتوں سے شفاعت طلبی سے تعلق ہے، ان تمام آیات میں اس کا نام تک نہیں لیا گیا۔

قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ۭ وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ؀[1]

(مشرکین سے کہو):۔کیا تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہو جو نہ تمہارے ضرر کی مالک ہیں اور نہ نفع کی۔اور اللہ تعالیٰ ہی سننے والا اور جاننے والا ہے۔(یعنی فقط اللہ تعالیٰ ہی قابل عبادت ہیں)۔

قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـــًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ؀ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ؀[2]

(حضرت ابراہیمؑ نے مشرکین سے) کہا! کیا تم غیر خدا میں سے ایسی اشیاء (بتوں) کی عبادت کرتے ہو جو نہ تمہیں کچھ فائدہ دے سکتے ہیں اور نہ تمہیں ضرر پہنچا سکتے ہیں۔افسوس ہے تم پر! اور ان پر جن کی تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو، کیا تم اپنی عقل سے کام نہیں لیتے ہو؟ کیا اپنے کام میں قوت فکر سے فائدہ نہیں اٹھاتے ہو؟

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ ۭ وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰي رَبِّهٖ ظَهِيْرًا ؀[3]

مشرکین اللہ تعالیٰ کے سوا ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ انہیں نفع دے سکتی ہیں اور نہ نقصان پہنچا سکتی ہیں۔یہ (نادان) کافر ہے جو خداوند تعالیٰ سے روگردانی کر چکا ہے اور حکم خدا کو پیٹھ دکھا چکا ہے۔

غیر خدا کی عبادت موجب شرک ہے

ان آیات اور ان کی مثل دیگر آیات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شرک در عبادت کی اصل غیر خدا کی پرستش کرنا ہے۔جو شخص اس

---

[1] سورۂ مائدہ آیت ۷٦

[2] سورۂ انبیاء آیت ٦٦۔٦٧

[3] سورۂ فرقان آیت ۵۵

ناجائز عمل کو انجام دے اور غیر خدا کی عبادت کرے وہ مشرک ہے۔خواہ اس کے اس عمل کا محرک شفاعت کی طمع ہو یا تقرب خدا کی خواہش یا کوئی بھی دوسرا انفسیاتی عامل ہو۔خلاصہ یہ کہ دوسری آیت میں بیان کردہ مشرکین کا شرک ان کے غیر خدا کی عبادت کرنے کی وجہ سے ہے نہ اس وجہ سے کہ وہ اپنے معبودوں سے شفاعت کی توقع رکھتے تھے۔

لیکن جب محمد بن عبدالوہاب نے چاہا کہ غیر خدا سے شفاعت طلبی کو شرک ثابت کرے اور اس کی درخواست کرنے والے کو مشرک کہتے تو اس دوسری آیت کو یوں تفسیر کی:۔

فاخبرانه من جعل بينه وبين الله وسائط يسئلهم الشفاعة فقد عبدهم واشرك بهم و ذالك ان الشفاعة كلها لله

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ جو کوئی بھی اپنے اللہ تعالیٰ کے درمیان ایسے واسطے قرار دے گا جن سے وہ شفاعت کی درخواست کرے گا تو اس نے ان وسائط کی عبادت کی اور اس طرح سے خدا کے ساتھ شرک کیا اور شفاعت مکمل طور پر اللہ تعالیٰ سے مختص ہے۔

تفسیر بالرائے

مقام تعجب ہے کہ محمد بن عبدالوہاب نے یہ جرائت کیونکر کی اور اس طرح اپنے آپ کو اس پر آمادہ کیا کہ اپنی رائے کے مطابق آیت کی تفسیر کر ڈالے اور اللہ تعالیٰ کی طرف ایسے مطالب کو منسوب کر دے جو اس نے نہیں فرمائے۔

جو بات اس آیت کی تیز دھار نوک کا نشانہ ہے اور جس کی اللہ تعالیٰ نے صریحاً اطلاع بھی دی، وہ یہ ہے کہ مشرکین غیر خدا کی عبادت کرتے ہیں۔اس کے بعد ذات الٰہی نے مشرکین کے ایک قول کی خبر بھی دے دی، یعنی وہ کہتے ہیں کہ یہ ہمارے شفیع ہیں۔گویا مشرکین اپنے معبودوں کے بارے میں اپنے دلوں میں ایک وہم پالے ہوئے تھے کہ ان کی عبادت کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ بت درگاہ الٰہی میں ان کی شفاعت کریں گے۔لیکن محمد بن عبدالوہاب نے آیت کریمہ کو اپنے اصلی راستے سے تبدیل کر دیا اور غیر خدا کی عبادت کرنا جو آیت کا حساس ترین نکتہ اور اس کی تیز دھار نوک کا اصلی نشانہ تھا، اس کی طرف بالکل دیکھا ہی نہیں اور اپنی گفتار کا سارا زور شفاعت پر صرف کرتے ہوئے یوں کہہ دیا:۔ جو کوئی بھی وسائط سے شفاعت کی درخواست کرے گا اس نے اپنے اس عمل سے ان وسائط کی پرستش کی ہے اور وہ خدا سے شرک کرتا رہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا محمد بن عبدلا وہاب کی نظر میں غیر خدا کی جو عبادت مشرکین کے شرک کا سبب ہے، کیا وہ یہی ان سے شفاعت کا طلب کرنا ہے؟ حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ مسئلہ شفاعت کو جو مشرکین کا ایک مقولہ ہے۔کبھی بھی ان کی عبادت پر عطف نہ کرتا، کیونکہ ادبی لحاظ سے ہر معطوف۔معطوف علیہ کا غیر ہوتا ہے۔نیز جیسا کہ عرض کیا گیا کہ قرآن مجید نے اپنی ان متعدد آیات میں جو مشرکین کے بارے میں آئی ہیں، غیر خدا کی عبادت کا نام تو لیا ہے لیکن شفاعت کا نام تک بھی نہیں لیا۔

محمد بن عبدالوہاب اپنے ''ویسئلھم'' کے جملے میں کہتا ہے:۔اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ خبر دی ہے کہ مشرکین ان وسائط سے شفاعت کی درخواست کرتے تھے،لیکن یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ اس نے یہ سوال اور درخواست کرنا آیت کے کس مقام سے نکال لیا ہے؟ کیا اس کے خیال میں شفاعت کے بارے میں سوچنا اس کے لئے درخواست کرنا ہوتا ہے یا پھر جس طرح اس سے پہلی آیت میں اس نے ''یعبدون'' کا معنی ''یدعون'' کیا ہے،اس نے اس آیت میں بھی اسی قسم کی غلطی کو دوہرایا ہے۔

محمد بن عبدالوہاب کا کہنا ہے:۔اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ جو کوئی اپنے اور خداوند تعالیٰ کے درمیان وسائط قرار دے اور ان سے شفاعت کی درخواست کرے اس نے اپنے عمل سے شفیع کی پرستش کی اور خداوند تعالیٰ سے شرک کیا۔

(اب سوال یہ ہے کہ اس شرک کی علت ان کی نظر میں کیا ہے!)

ذاتی نظریہ

ممکن ہے شرک کی علت شفیع بنانا ہو یا اس جعلی شفیع سے شفاعت کی درخواست کرنا ہو یا شفیع بنانا اور اس سے شفاعت کی درخواست کرنا یہ دونوں مل کر مجموعی طور پر شرک کا سبب ہوں۔اگر محمد بن عبدالوہاب ان تین صورتوں میں سے کسی ایک کو بھی مستقل طور پر شرک کا موجب قرار دے تو ہم اس کے لئے ایک اور چوتھی صورت فرض کر کے بھی درمیان میں لا سکتے ہیں۔وہ یہ ہے کہ اگر شفیع اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنایا ہوا ہو اور اس کی شفاعت باذن خدا ہو تو کیا ایسی ہستی سے شفاعت کی درخواست کرنا بھی شرک قرار پائے گا، جب کہ شفاعت طلب کرنے والا موحد ہو۔کیا ایک قائل توحید مرد مومن اگر خدا کے بنائے ہوئے کسی شفیع سے شفاعت کی درخواست کرے تو اسے اس شفیع کی پرستش قرار دیا جا سکتا ہے؟ اگر محمد بن عبدالوہاب کا جواب یہاں بھی مثبت ہو تو ہمارا سوال یہ ہوگا کہ اس کے نظریئے پر آیت کا کون سا حصہ دلالت کرتا ہے۔؟ محمد بن عبدالوہاب کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے ایک ذاتی نظریے کو اس صراحت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت دے دے۔

آخر میں محمد بن عبدالوہاب اپنی گفتگو کے اثبات کے لئے کہتا ہے (شفاعت ساری اللہ تعالیٰ سے خاص ہے، یہاں وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف اشارہ کر رہا ہے)

قُلْ لِلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ط [1]

غلط نتیجہ گیری

جبکہ یہ جملہ قرآن مجید میں ان لوگوں کے عقائد کا رد کرنے کے لئے آیا ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ درگاہ الٰہی میں شفاعت کرنا ایک بے قاعدہ اور غیر منظم معاملہ ہے۔یعنی ہر ایک اپنی طبعی خواہش کے مطابق جسے چاہے شفیع بنا لے کہ اگر چاہے تو ایک

---

[1] سورۂ زمر آیت ۴۴

بے اثر اور غیر مستحق کو اپنا شفیع بنا لے۔ یہ جملہ ان لوگوں کے رد میں نہیں کہ جو ان ہستیوں سے شفاعت چاہتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے منتخب فرمایا اور انہیں اپنی درگاہ میں شفاعت کرنے کا اذن دے رکھا ہے۔ کیونکہ ایسی شفاعت طلبی اس آیت کے منافی نہیں، بلکہ وہ تو اس آیت کا حقیقی مصداق ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہوا کہ ہماری ان توضیحات کے بعد واضح ہو گیا کہ ان زیر بحث آنے والی ہر دو آیات میں مشرکین کی جو گفتگو ذکر ہوئی ہے، اس کو سمجھنے میں بعض علماء عامہ نے غلط در غلط راستہ اختیار کیا ہے۔ انہوں ے اس کی غلط تفسیر کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ غیر خدا سے شفاعت کی درخواست کرنا اس شفیع کی عبادت کرنا ہے اور جو کوئی بھی کسی سے شفاعت کی درخواست کرے، اس نے اس کی عبادت کی ہے اور اپنے اس عمل سے خدا کے ساتھ شرک کیا ہے۔ خواہ وہ شفیع ملائکہ۔ انبیاء اور صالحین ومقربین درگاہ الٰہی ہی کیوں نہ ہوں کہ جنہیں رب العزت کی طرف سے شفاعت کرنے کی اجازت بھی ملی ہوئی ہے۔ یہ امر واضح ہے کہ ان کی یہ نتیجہ گیری ایک فاش غلطی ہے اور یہی غلطی اہل اسلام کے مابین اختلاف وتفرقہ پیدا کرنے کا باعث بنی ہے۔

ساتویں تقریر

علم الٰہی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال اللہ العظیم کف کتابہ

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ [1]

''وہ جانتا ہے سب کچھ جو انکے سامنے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے''

گزشتہ توضیحات سے روشن ہو گیا ہے کہ آیت الکرسی نے بشر کی ہدایت کے لئے توحید در عبادت اللہ تعالیٰ کی حیات، قیومیت اور مالکیت کے بارے میں گفتگو فرمائی اور اس کے بعد بتایا کہ شفعاء میں سے کوئی بھی ذات اقدس الٰہی کے اذن و اجازہ کے بغیر شفاعت کی قدرت نہیں رکھتا۔

علم الٰہی

اب ''یعلم مابین ایدیھم ولا خلفھم'' کے جملے کے ساتھ باری تعالیٰ کے علم کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا:۔قابل عبادت خداوئی ہو سکتا ہے جو تمام ارضی و سماوی موجودات کا عالم ہو، جو کچھ او پر گزر چکا ہے یا مستقبل میں ان پر گزرنے والا ہے، اس سے آگاہ و دانا ہو۔دریافت طلب بات یہ ہے کہ علم الٰہی اور ذات شفاعت کے مابین کیا ربط ہے؟ اللہ تعالیٰ نے آیت الکرسی میں کیوں مسئلہ شفاعت کے بعد علم الٰہی کے بارے میں گفتگو فرمائی ہے؟

اس سوال کے جواب میں ابتداء علم الٰہی کے شفاعت کے ساتھ ارتباط کو واضح کیا جائے گا، بعد ازاں یہ گفتگو ہو گی کہ معبود برحق خداوند تعالیٰ کے علم پر اعتقاد رکھنا بھی اسلام کے بنیاد ارکان تربیت میں سے ایک رکن ہے اور صحیح عبادت اور صالح اعمال کا اجراء کا ضامن ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آیت الکرسی میں مسئلہ شفاعت کی طرف اشارہ کرنے کے بعد اپنی ذات کے جامع اور کامل علم کے بارے میں سخن پردازی فرمائی:۔

من ذالذی یشفع عندہ الا باذنہ یعلم ما بین ایدیھم وما خلفھم

---

[1] سورۂ بقرہ آیت ۲۵۵

شفاعت اور علم الٰہی کا ربط

آیت الکرسی کی مثل ایک اور آیت بھی ہے جس میں اسی طرح خداوند تعالیٰ نے مسئلہ شفاعت کے متعلق مشرکین کا قول نقل فرمایا اور پھر استفہام انکاری کی شکل میں اپنے علم کے متعلق فرمایا ہے۔

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّـُٔونَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿۱۸﴾ [۱]

مشرکین خداوند تعالیٰ کے سوا ایسے (بتوں وغیرہ) کی عبادت کرتے ہیں جو نہ تو انہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی فائدہ دے سکتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہ بت درگاہ الٰہی میں ہمارے شفعاء ہیں۔ اے رسولؐ! ان لوگوں سے کہہ دو۔ کیا تم اپنے اس عمل کے ذریعے اللہ تعالیٰ کو آسمان و زمین کے امور میں سے ان کی اطلاع دینا چاہتے ہو جنہیں وہ نہیں جانتا۔؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ اس سے پاک و برتر ہے جس کو وہ اس کا شریک بناتے ہیں۔

علم باری تعالیٰ کے ساتھ شفاعت کا ربط دو جہت سے قابل توضیح اور لائق توجیہ ہے۔ ایک شفعاء کا انتخاب اور شفاعت کے لئے ان کی صلاحیت، دوسرے مشفوع لہم کی جہت سے کہ وہ کون ہیں جو اس لائق ہیں کہ فیض شفاعت انہیں شامل ہو سکے۔

اول: مشرکین اپنے مخلوق ہونے کے معتقد تھے اور اللہ تعالیٰ کو اس جہان کا خالق مانتے تھے۔ لیکن اپنے بتوں کو نابودی سے محفوظ رکھنے اور بت پرستی کی وجہ جواز پیدا کرنے کے لئے کہتے تھے کہ یہ بت درگاہ الٰہی میں ہمارے شفیع ہیں، درحقیقت یہ کہنا چاہتے تھے کہ پروردگار عالم کا حریم کبریائی ہمارے نزدیک محترم اور مقدس ہے اور ہماری نگاہ میں کوئی شئی بھی خداوند عالم کے برابر کی نہیں ہے۔ یہ بت دراصل ہمارے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان واسطہ ہونے کا نقش رکھتے ہیں اور اس کے ہاں شفیع بنتے ہیں۔ آیت الکرسی نے ان کے اس عقیدے کی رد میں فرمایا:۔

درگاہ خداوندی میں اس کی اجازت کے بغیر کوئی بھی شفاعت کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ یعنی شفیع کا انتخاب تمہارے اختیار کی بات نہیں اور کسی کو حق حاصل نہیں کہ وہ خودسرانہ طور پر اپنی خواہش سے کسی کو اپنے اور خدا کے درمیان شفیع بنا ڈالے، کیونکہ شفاعت کا مکمل اختیار خود ذات اقدس الٰہی کے ہاتھ میں ہے۔

قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ؕ [۲]

اس ذات اقدس کو اختیار ہے جسے شفیع کے طور منتخب فرمائے، یہ قابل فخر منصب وہ جسے چاہے عطا کرے اور اسے شفاعت

---

[۱] سورۂ یونس آیت ۱۸

[۲] سورۂ زمر آیت ۴۴

کرنے کا اذن مرحمت فرمادے۔

لوگوں کو یہ بات سمجھانے کے لئے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے اس خصوصیت کا ثابت ہونا بھی بلا دلیل نہیں، آیت الکرسی میں فرماتا ہے:۔ وہی شفاعت کی اجازت بخشتا ہے جو ان ارضی و سماوی تمام موجودات کی صلاحیتوں اور لیاقتوں سے مکمل طور پر آگاہ ہے، جب کہ شفعاء تو خود انہیں ارضی و سماوی موجودات کا حصہ ہیں۔ غرنیز وہ خدا اذن شفاعت عطا فرمانے والا ہے جو ظاہر و باطن۔ گزشتہ و آئندہ۔ آغاز و انجام۔ مشہود و غیر مشہود اور آگے پیچھے۔ غرض یہ کہ شفعاء اور مشفوع کے پورے اوضاع و احوال سے آشنا اور پوری طرح آگاہ ہے۔

دوسری آیت میں استفہام انکاری کے انداز اور ذرا سخت پیرائے میں فرماتا ہے:۔ یہ جو تم خود سرانہ انداز میں کچھ چیزوں کو شفیع بنا لیتے ہو اور ان کی عبادت بھی کرنے لگتے ہو، کیا تم سمجھتے ہو کہ زمین و آسمان کی کوئی شئی اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ ہے۔ اب چاہتے ہو کہ اپنی اس غلط روش کے ذریعے اپنے پروردگار کو کچھ اطلاعات بہم پہنچاؤ؟ یعنی اگر تمہارے منتخب کردہ شفعاء شفاعت کے لائق ہوتے تو خداوند کریم انہیں ضرور شفاعت کے لئے منتخب کر لیتا۔

شفیع ہدایت

قرآن مجید میں شفاعت کا ایک نمونہ اور شفاعت کے علم الٰہی سے ارتباط کا ایک شاہکار خود رسول اکرمؐ کی ذات ہے کہ آنحضرتؐ ایک برگزیدہ شفیع اور لوگوں کی ہدایت و مغفرت کے لئے ماذون الٰہی ہستی ہیں۔ خداوند تعالیٰ نے رسالت کے لئے آپؐ کی صلاحیت کو جو دراصل شفاعت ہدایت ہے، اسے خود اپنے علم کی طرف منسوب کیا اور فرمایا۔

اَللّٰہُ اَعۡلَمُ حَیۡثُ یَجۡعَلُ رِسَالَتَہٗ ؕ [1]

اللہ تعالیٰ خود زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کو کہاں رکھے۔

شفعاء تکوینی ہوں یا تشریفی وہ خداوند حکیم کی طرف سے مقام شفاعت کے لئے تبھی منتخب کئے جاتے ہیں جب علم الٰہی میں ان کا اس مرتبے کے لائق و صالح ہونا یقینی اور ثابت ہو چکا ہوتا ہے۔

عن الفضل قال سمعت الرضا علی بن موسی علیہ السلام یقول فی دعائہ سبحان من خلق الخلق بقدورتہ و اتقن ما خلق بحکمتہ ووضع کل شیئی منہ موضعہ بعلمہ [2]

فضل کہتا ہے: میں نے حضرت امام علی رضا علیہ السلام سے سنا کہ آپ اپنی ایک دعا میں یوں عرض گزار تھے۔ پاک ہے وہ

[1] سورۂ انعام آیت ۱۲۵

[2] بحار الانوار ج ۲ ص ۱۲۹

ذات جس نے ساری مخلوق کو اپنی قدرت کے ساتھ خلق فرمایا اور اپنی حکمت کے ساتھ اس نظام آفرینش کو محکم اور متقن بنایا اور ہرشئی کو اپنے علم کے ساتھ ٹھیک اس کے مناسب مقام پر مقرر فرمایا۔

شفیع کی صلاحیت کی شناخت

ممکن ہے علم الٰہی سے مسئلہ شفاعت کا ارتباط اس لحاظ سے ہو کہ شفعاء کی صلاحیت کی شناخت اور شفیع کا انتخاب اسی کے تحت ہوتا ہے۔ یہ جہان ہستی خداوند تعالی کے حکیمانہ فیصلے کے تحت انتہائی دقیق اور باریک نظم وحساب کے مطابق خلق کیا گیا ہے اور اس عالم وجود میں کوئی بھی چیز ناموزوں و بے حساب نہیں ہے۔

اِنَّا كُلَّ شَیۡءٍ خَلَقۡنٰهُ بِقَدَرٍ ﴿۴۹﴾ [۱]

ہم نے ہرشئی کو ایک خاص اندازے کے ساتھ خلق کیا ہے۔

شفاعت دراصل خالق ومخلوق کے درمیان ایک خاص قسم کا رابطہ ہے۔ پس شفیع کا انتخاب کرنا اور اسے اذن شفاعت دینا فقط اسی خداوند عالم کے لئے ہی مناسب ہے جو تمام ارضی وسماوی موجودات کا علم ہے اور شفعاء ومشفوع لہم کی پوری وجودی خصوصیات سے بھی آگاہ ہے۔

وَرَبُّكَ اَعۡلَمُ بِمَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ [۲]

اور تیرا پروردگار آسمانوں اور زمین کے ہر شخص کو سب سے زیادہ جانتا ہے۔

دوم: ممکن ہے کہ اذن شفاعت سے علم الٰہی کا ربط مشفوع لہم کی کیفیت کے اعتبار سے ہو، کیونکہ بعض گناہ گار جو شرک کے مرتکب ہوتے ہیں، ان کے بارے میں شفعاء کی شفاعت بالکل بے اثر ہوتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالی کا قطعی فیصلہ ہے کہ وہ مشرک کو کبھی بھی معاف نہیں کرے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَكَ بِهٖ [۳]

تحقیق اللہ تعالیٰ نہیں بخشے گا اس کو کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے۔

پس اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ شفعا فقط انہیں افراد کے حق میں شفاعت کریں گے جن کے ارکان ایمان صحیح ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کو پسند ہوں گے۔

---

[۱] سورۂ قمر آیت ۴۹

[۲] سورۂ بنی اسرائیل آیت ۵۵

[۳] سورۂ نساء آیت ۴۸

وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَى [1]

اور وہ نہیں شفاعت کریں گے مگر اسی کو جو پسندیدۂ خدا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ وہ ہستی ہے جو مشرکین کے شرک اور ایمان سے انحراف کو جانتا ہے اور ان کے آغاز وانجام سے پوری طرح آگاہ ہے۔

یعلم ما بین ایدیهم وما خلفهم

اللہ تعالیٰ اپنے منتخب شفعاء کو کبھی بھی اجازت نہیں دیتا کہ وہ ایسے مشرک گروہ کے بارے میں شفاعت کریں۔

من ذالذی یشفع عندہ الا باذنه

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ زمین میں کوئی فرد بے گناہ ہوتا ہے، وہ خاص حالات میں گھر جاتا ہے اور ملزم سمجھا جاتا ہے۔ اب اس کے سفارشی یہ کوشش کرنے لگتے ہیں کہ مشفوع عندہ کے ہاں اس کی بے گناہی کو ثابت کریں تاکہ اسے سزا سے بچا سکیں۔ لیکن پروردگار عالم کی عدالت میں اس قسم کے واقعہ کا پیش آنا بالکل ناممکن ہے۔ اور نہ ہی وہاں اس قسم کی شفاعت اور اس کے اجازے کی کوئی ضرورت لاحق ہوسکتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر ایک ظاہر و باطن اور مشہود وغیر مشہود ہر چیز سے پوری طرح آگاہ ہے۔ "یعلم ما بین ایدیهم وما خلفهم" لہٰذا وہاں غلطی سے کسی بے گناہ کو مجرم قرار دیئے جانے کا کوئی امکان نہیں۔ اذن شفاعت کا علم الٰہی کے ساتھ ربط ان دو احتمالوں کی حد تک تو واضح ہوگیا ہے۔ اب ہم یہ نکتہ زیر بحث لاتے ہیں کہ علم الٰہی پر اعتقاد رکھنا کس طرح اسلام کے بنیادی ارکان تربیت میں سے ہے؟ اور یہ عقیدہ کیونکر صحیح عبادات اور درست اعمال کے اجرا کا ضامن قرار پاتا ہے؟

اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس تمام صفات کمال کی جامع ہے، ان صفات میں سے ایک صفت علم ہے۔ قرآن مجید اور اسلامی روایات میں بار بار اس کا تذکرہ آیا ہے۔ آیت الکرسی لوگوں کو ایک ایسے خدا کی عبادت کی طرف دعوت دیتی ہے جو اس جہان ہستی کے تمام حقائق سے پوری طرح آگاہ ہے، ان ارضی وسماوی موجودات کے ماضی۔ حال اور مستقبل کو مکمل طور پر جانتا ہے اور اس کے علم مقدس سے کوئی بھی شئی پوشیدہ اور پنہاں نہیں ہے۔

یعلم ما بین ایدیهم وما خلفهم

انسان کی حالت یہ ہے کہ جب بطن مادر سے متولد ہوتا ہے تو علم ودانش سے بالکل بے بہرہ ہوتا ہے:۔

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا [2]

اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں تمہاری مادران کے بطن سے نکالا تو تم کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔

یہ انسان پوری زندگی ماں باپ سے۔ گھر کے ماحول سے۔ گلی کوچے اور محلے سے۔ درسگاہ سے اپنی ظرفیت کے مطابق

---

[1] سورۂ انبیاء آیت ۲۸

[2] سورۂ نحل آیت ۷۸

علم حاصل کرتا رہتا ہے،مطالب ومفاہیم سے آگاہی پاتا اور کئی علوم حاصل کر لیتا ہے۔ بنا بریں علم ذات انسان کا جزو نہیں ہے، کیونکہ ایک دن انسان نوازادکی صورت میں تھا اور علم سے یکسر عاری تھا۔لیکن باری تعالیٰ کا علم اس کی عین ذات ہے کہ نہ کبھی علم اس سے جدا تھا اور نہ ہوگا۔

علم الٰہی عین ذات ہے

اسلام کے آسمانی مکتب نے اپنے پیروکاروں کو یہ تعلیم دی ہے کہ علم الٰہی اس جہان کی آفرینش سے شروع نہیں ہوا یا بالفاظ دیگر علم خداوندی کی بنیاد اس کے معلوم کا وجود میں آنا نہیں، بلکہ علم تو اس کے عین ذات ہے اور قبل اسکے کہ وہ اس جہان کو خلق فرمائے، وہ ہر اس چیز سے عالم اور آگاہ تھا جو علم سے تعلق پذیر ہوسکتی ہے۔

عن ابی بصیر قال: سمعت ابا عبدالله علیه السلام یقول: لم یزل الله عزوجل ربنا والعلم ذاته ولا معلوم والسمع ذاته ولا مسموع والبصر ذاته وا مبصر والقدرة ذاته ولا مقدور فلما احدث الشیاء وکان المعلوم وقع العلم منه علی العلوم والسمع علی المسموع وابصر علی البصر والقدرة علی المقدور[۱]

ابوبصیر کہتا ہے: میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کو سنا کہ فرما رہے تھے: ہمارا پروردگار لایزال ہے(یعنی ہمیشہ سے ہے)اور اس کا علم اس کی عین ذات ہے۔اس کا علم تھا جب کہ ابھی معلوم خلق نہ ہوا تھا۔سماعت بھی اس کی عین ذات تھی جب کہ مسموع موجود نہ ہوتا تھا۔ بصارت بھی اس کی عین ذات تھی جب کہ کوئی قابل رؤیت شئی پیدا نہ ہوئی تھی۔قدرت بھی اس کی عین ذات تھی جب کہ اس کی قدرت کا متعلق وموضوع نہیں بنا تھا۔پھر جب اللہ تعالیٰ ے اس عالم کو خلق فرمایا تو معلوم تحقق پذیر ہوا اور اللہ تعالیٰ کا علم ازلی اس معلوم نوموجود پر منطبق ہوا۔اس طرح سماعت مسموع پر۔بصارت مبصور پر اور قدرت مقدور پر منطبق ہوئی۔

عن ایوب بن نوح انه کتب الی ابی الحس علیه السلام یسئله عن الله عزوجل کان یعلم الا شیاء قبل ان خلق الاشیاء و کونها ولم یعلم ذالك حتی خلقها وارادخلقها وتکونیها فعلم ما خلق عندما خلق وما کون عندما کون؟

فوقع بخطه: لم یزل الله عالم بالا شیاء قبل ان خلق الا شیاء کعلمه بالاشیاء بعدما خلق الاشیاء[۲]

---

[۱] الکافی ج ۱ ص ۱۰۷

[۲] الکافی ج ۱ ص ۱۰۷

اللہ تعالیٰ کا علم ازلی

ایوب بن نوح سے مروی ہے کہ اس نے حضرت امام ابوالحسن علی رضا علیہ السلام کی خدمت میں خط لکھا اور پوچھا:

کیا خداوند تعالیٰ ان اشیاء کو خلق کرنے سے پہلے ان کا علا تھا یا نہیں جانتا تھا۔ تا آنکہ اس نے ان کو خلق فرمایا تو اس وقت اپنی مخلوقات کا علم ہو گیا اور ان سے آگاہی پا گیا؟۔ حضرت کے اپنے خط مبارک سے لکھا ہوا جواب آیا:

اللہ تعالیٰ اشیاء کو خلق کرنے سے قبل ازل سے ان کا اس طرح عالم تھا جس طرح ان کو خلق کرنے کے بعد ان کا علم ہے۔

(اس کا علم ازلی علم بعداز آفرینش کی مثل ہے) خداشناسی کی بحث میں اللہ تعالیٰ کا علم اسلام کے اساسی اعتقادات میں سے ہے۔ قرآن شریف میں علم باری تعالیٰ کے بارے میں کثیر آیات موجود ہیں اور ان سب میں یہ ذکر آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جہان ہستی کی تمام کلیات و جزئیات کا عالم ہے۔ بطور نمونہ چند ایک آیات پیش خدمت ہیں:

أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ط وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ﴿١٤﴾ [1]

کیا وہ جس نے خلق کیا ہے وہ نہیں جانتا؟ حالانکہ وہ تو تمام لطائف ودقائق سے بھی آگاہ اور باخبر ہے۔

فتح بن یزید جرجانی نے حضرت امام رضا علیہ السلام کو یہ پڑھتے سنا: ''**وهو الطيف الخبير**'، تو اس نے حضرت سے درخواست کی کہ لطیف وخبیر کی تفسیر فرمائیں!

فقال یا فتح انما قلنا الطیف للخلق اللطیف ولعلمه بالشیئ الطیف اولا تری وفقك الله وثبتك الی اثر صنعة فی البنات الطیف و غیر الطیف و من اخلق اللطیف ومن الحیوان الصغار ومن البعوض والجر جس وما هو اصغر منها مالا یکادتستبینه العیون بل لا یکاد یستبان لصغره الذکر من الانثی والحدث المولود من القدیم [2]

غیر مرئی زندہ موجودات

حضرت امام رضا علیہ السلام نے فرمایا: اے فتح! ہم جو اللہ تعالیٰ کو لطیف وخبیر کہتے ہیں تو اس لئے کہ باری تعالیٰ لطیف موجودات کا خالق ہے اور اس لطیف مخلوق کا علم وخبیر ہے۔ (اس کے بعد فرمایا) کیا تم اس کی کاردانی کے اثرات لطیف وغیر لطیف نباتات میں نہیں دیکھتے؟ کیا اللہ تعالیٰ کے لطیف مخلوقات کو نہیں دیکھتے؟ چھوٹے چھوٹے حیوانات مثلاً مچھر، اس سے بھی صغیر مچھر یا

---

[1] سورۂ ملک آیت ۱۴

[2] الکافی ج ۱ ص ۱۱۹

ایسے زندہ موجودات جوان سے بھی چھوٹے ہوتے ہیں، اتنے چھوٹے کہ آنکھ ان کو دیکھنے پر قادر نہیں اور ان کے نر و مادہ کو پہچان نہیں سکتی یا ان کے نومولود کو بڑے افراد سے ممتاز نہیں کر سکتی۔

ان ارضی وسماوی موجودات بلکہ تمام موجودات عالم کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے وسیع اور جامع علم رکھنے کے بارے میں کہ خواہ وہ جامد ہوں یا زندہ، فرشتے ہوں یا انسان، نباتات ہوں یا حیوان، عاقل ہو یا غیر عاقل، قرآن مجید یہ ارشاد فرماتا ہے۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۶﴾ [۱]

آسمانوں میں پائے جانے والے موجودات اور زمین میں پائی جانے والی تمام اشیاء کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور اللہ ہر شئی سے مکمل طور پر آگاہ ہے۔

وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ [۲]

اور تیرا پروردگار آسمانوں اور زمین میں رہنے والی ہر عاقل مخلوق کو سب سے زیادہ جانتا ہے۔

باشعور اور بے شعور مخلوق

اس جہان کی باشعور اور بے شعور تمام موجودات کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے لامحدود علم رکھنے اور ان سب کا ذات اقدس کے لئے بمنزلہ لشکر اور قوت مجریہ ہونے کے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں یوں فرماتا ہے۔

وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ؕ [۳]

اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی بھی تیرے رب کے لشکر سے آگاہ نہیں ہے۔

اس کرۂ زمین اور اس کے دائرے میں موجود ہر شئی اور اس میں ہونے والے تمام حوادث وواقعات پر اللہ تعالیٰ کے آگاہ ہونے کے بارے میں قرآن شریف فرماتا ہے:

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۹﴾ [۴]

خزائن غیب کی کنجیاں اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں۔ ان سے سوائے خدا کے کوئی آگاہ نہیں۔ اور (اس طرح) اللہ تعالیٰ

---

[۱] سورۂ حجرات آیت ۱۶

[۲] سورۂ بنی اسرائیل آیت ۵۵

[۳] سورۂ مدثر آیت ۳۱

[۴] سورۂ انعام آیت ۵۹

تمام چیزوں سے جوخشکی میں ہیں اورسمندروں میں ہیں باخبر ہے۔اورکوئی بھی پتا کسی درخت سےنہیں گرتا مگراللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہےاورکوئی بھی دانہ زمین کی تاریکیوں میں نہیں اور نہ کوئی تر یا خشک شئی ہےمگروہ ایک کھلی کتاب میں موجود ہے(جواللہ تعالیٰ کےعلم کا خزانہ ہے)۔

يَعۡلَمُ مَا يَلِجُ فِي ٱلۡأَرۡضِ وَمَا يَخۡرُجُ مِنۡهَا وَمَا يَنزِلُ مِنَ ٱلسَّمَآءِ وَمَا يَعۡرُجُ فِيهَا ۖ [۱]

اللہ تعالیٰ جانتا ہےاس کوجوزمین میں اترتا ہےاوراس کوجوزمین سے باہرنکلتا ہےاور ہراس چیزکوجوآسمان سے اترتی ہے اوراس کوبھی جوآسمان کی طرف اٹھتی ہے۔

تفسیرتبیان میں اس آیت کےذیل میں اس طرح توضیح کی گئی ہے:وہ تمام چیزیں جوزمین میں داخل ہوتی ہیں اوراس میں پنہاں ہوجاتی ہیں،(مثلاً دانہ اور گٹھلی)اور ہروہ شئی جوزمین سے باہرنکلتی ہے''مثلاً نباتات اور جمادات''وہ سب ذات اقدس الٰہی سے پوشیدہ نہیں ہیں اوراللہ تعالیٰ ان سب سے باخبر ہے۔اس طرح ہروہ شئی جوآسمان سے اترتی ہے''مثلاً بارش وغیرہ''اور ہروہ چیز جو آسمان کی طرف اٹھتی ہے(مثلاً ملائکہ اورلوگوں کےاعمال'اللہ تعالیٰ ان سب کا عالم اورجاننے والا ہے۔

سئل علی بن الحسین علیہما السلام عن التوحید فقال: اللہ عزوجل علم انہ یکون فی آخر الزمان اقوام متعمقون فانزل اللہ (قل ھو اللہ ھو احد)) والآیات من سورۃ الحدید الی قولہ ((وھو علیم بذات الصدور)) [۲]

آخری زمانے میں علمی ترقی

حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام سےتوحید کے بارےسوال ہواتوآپ نےفرمایا:خداوندتعالیٰ کوعلم تھا کہ آخری زمانے میں ایسےلوگ آئیں گےجوبڑے باریک بین اورگہری تحقیق کرنے والے ہوں گے،اس لئےاللہ تعالیٰ نےسورۃ''قل ھواللہ احد''اورسورۂ حدید کی چندآیات''وھو علیم بذات الصدور''تک نازل فرمادیں۔

"ومایںزل من السمائوما یعرج فیھا"یہ سورہ حدید سے"علیم بذات الصدور"سےقبل والی ان آیات میں سےایک آیت ہے کہ جن کا حوالہ حضرت امام علی بن الحسین علیہا السلام کی حدیث بالا میں آیا ہے یہ جوامام سجادعلیہ السلام نےاس آیت کوسمجھنے کے بارے میں آخری زمانے کےافراد کی باریک بینی اورگہری دانش کی طرف اشارہ فرمایا ہےشایداس سےمقصود وہی تحقیق ہےجس کی طرف آج کی دنیااپنی نئی کاوشوں میں متوجہ ہوئی ہے

---

[۱] سورۂ حدید آیت ۴

[۲] تفسیر البرہان ص ۱۲۲۸

علم حیات شناسی میں ذکر آیا ہے:

ہمارے اس کرۂ زمین کو جس ہوا نے گھیر رکھا ہے، اس کا قطرہ ۸۰۰ کیلومیٹر ہے اور وہ زمین کی حرکت کے ساتھ ایک لاکھ کیلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے حرکت کررہی ہے۔ یہ ہوا ان اسباب میں سے ایک بہت بڑا سبب ہے جو کئی ایک جہات سے اس کرۂ زمین کے زندہ موجودات کی زندگی کی حفاظت کی ضامن ہے۔ ان میں سے حفاظت کی ایک جہت یہ ہے کہ یہ ہوا ان پتھروں کو جلا دیتی ہے اور ذرہ ذرہ کردیتی ہے جو دور دور سے ٹوٹ کر مسلسل زمین کے اس ماحول میں وارد ہوتے رہتے ہیں۔

نگہبان فضا

علم حیاتیات کا ایک پروفیسر فرانک آلین کہتا ہے: اس کرۂ ارض کے گرداگرد زندگی کی محافظت کے لئے گیسوں سے بھری ہوئی فضا موجود ہے وہ ۸۰۰ کیلومیٹر کی حدود میں پھیلی ہوئی ہے اور اتنی موٹی اور سخت ہے کہ اس کو زمین کی زرہ سے تشبیہ دی جاتی ہے، وہ اس کو آسمان سے ہر روز برسنے والے ان دو کروڑ بھاری پتھروں کی مار سے بچاتی ہے تقریباً ۵۰ کیلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے زمین کی اس قریبی ہوا میں داخل ہوتے ہیں۔ [1]

سورج اور زمین کے اطراف میں کروڑوں بلکہ اربوں کی تعداد میں ایسے شہاب ثاقب "سنگہائے شہابی" موجود ہیں جو زمین کی طرح سورج کے گرد گھومتے رہتے ہیں، چونکہ وہ سرد اور منجمد ہیں اس لئے صرف سورج کی موجود روشنی میں موجود چمکتے ہیں لیکن اس قدر چھوٹے چھوٹے ہیں کہ ان سے منعکس ہونے والی آفتاب کی روشنی اتنی زیادہ نہیں ہوتی کہ ہم انہیں دیکھ سکیں۔

"زمین اپنی قوت جاذبہ سے ہر روز آفتاب کے گرد گھومتے ہوئے ان کروڑوں آسمانی پتھروں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ یعنی وہ سورج سے ایک جانب ہٹ کر زمین کی طرف آجاتے ہیں۔ ان پتھروں کی رفتار اسقدر تیز ہوتی ہے کہ کبھی کبھی ۷۰ کیلومیٹر فی سیکنڈ تک بھی جا پہنچتی ہے۔ وہ اپنی اس تیز رفتار کے ساتھ ہوا سے ٹکراتے ہیں تو سخت گرم ہوجاتے ہیں، بلکہ حرارت سے سفید ہوجاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ (رات کے وقت) ہم ان کو آگ سے ایک شعلہ کی شکل میں دیکھتے ہیں"

آسمانی پتھر

"یہ آسمانی پتھر اپنی اس غیر ارادی حرکت کی حالت میں ناگہانی طور پر ایک نئی کیفیت سے دوچار ہوجاتے ہیں۔ جب ہوا میں موجود گیس ان کی سطح پر سے ایک لاکھ کیلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے گزرتی ہے تو یہ سخت گرم ہوجاتے ہیں۔ تب ان کی تیز اور سخت نوکیں ختم ہوجاتی ہیں اور انہیں پتہ ہی نہیں ہوتا کہ ہم زمین کے ماحول میں داخل ہوچکے ہیں۔"

"اگر آپ ذرا غور فرمائیں تو سمجھ لیں گے کہ جب بے چارہ انسان ایک سو کیلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار میں چلنے والی ہوا کے

---

[1] اثبات وجود خدا ص ۱۹

مقابلے میں اپنی جگہ پر ٹھہر نہیں سکتا تو پھر یہ بھی تعجب کی بات نہیں کہ شہابی پتھر سرگردان ہو کر گیس کی رگڑ اتپش سے سفید ہو جاتے ہیں اور پھر ذرہ ذرہ ہو کر بکھرتے جاتے ہیں۔

''یہ پتھر زمین کے ماحول سے ٹکرانے سے قبل جو چند سیکنڈ اس فضا میں گزارتے ہیں، اس وقت ان میں شدید حرارت اور سرعت ہوتی ہے، ہماری خوش بختی یہ ہے کہ ان کی اکثریت زمین تک پہنچنے سے قبل ہی مکمل طور پر جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔ البتہ کبھی کبھار ایسا بھی دیکھا گیا ہے۔ کہ ان میں کوئی ایک بڑا آسمانی پتھر اپنی اصل حالت میں زمین تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا اور یہاں آ کر پھٹ پڑتا ہے کہ جس سے ہمارے کانوں میں ایک ہیبت ناک دھماکے کی آواز آتی ہے۔

''میکسول رائڈ کہتا ہے: آج سے بیس سال قبل سائبیریا میں اس قسم کے چھوٹے بڑے آسمانی پتھر زمین سے آن ٹکرائے تھے۔ خوش قسمتی سے ان کے گرنے کی جگہ پر کوئی انسانی آبادی نہ تھی، ہماری اطلاعات کے مطابق اس حادثے سے فقط گھاس اور درخت وغیرہ ہی متاثر ہوئے تھے''

''ایک روسی مشین جو اس واقعہ کی تحقیقات کے لئے محل وقوع پر گیا تھا، وہ یوں رقمطراز ہے:

''جہاں یہ پتھر گرے تھے اس کی اطراف میں ۲۵ کیلومیٹر تک پھیلا ہوا ایک جنگل تھا۔ لیکن اب وہ سارے درخت پتھر گرنے کی جگہ سے دور اپنی چھال اور شاخوں کے بغیر گرے پڑے ہیں اور اطراف کی بلندیوں کی طرف سے ہوا کا دباؤ بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔

ان تمام نباتات میں ان کے یکدم جل جانے کے علامات ہیں جو جنگل کی آتش زدگی سے کوئی شباہت نہیں رکھتے (بلکہ ان کی سوختگی ایک علیحدہ قسم کی ہے) اس سوختگی کے اثرات درختوں کی طرح ٹیلوں، کانٹوں اور تنکوں پر بھی واضح طور پر دکھائی دے رہے ہیں۔ بعض مقامات پر تو ان کی وسعت ۱۸ کیلومیٹر تک بھی پھیل گئی ہے۔ ادھر پتھر گرنے کے اصل مقام پر ایک گڑھا بھی پیدا ہو گیا ہے کہ جس کا قطرہ ۵۰ میٹر تک ہے۔

آج کل نئے عجائب گھر میں ان ''اسیر مہمانوں'' کو سجایا گیا ہے جو ہماری فضاؤں سے دور کہیں سے آئے اور ہماری زمین کے ماحول میں آ کر قیدی ہو گئے۔ ان پتھروں کا وجود لوہے یا پتھر یلے کوئلے سے بنا ہوا ہے، ان میں سے بعض کا وزن چند کلومیٹر ہے تو بعض کا وزن کئی ٹن بھی ہے۔[1]

درۂ حدید کی اولیں آیات

حضرت امام سجاد علیہ السلام نے توحید کے بارے میں کئے گئے سوال کے جواب میں سورۂ حدید کی اولین آیات کی طرف اشارہ فرمایا اور پھر آخری زمانے کے نکتہ سنج اور عمیق فکر رکھنے والے افراد کا تذکرہ کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ ان آیات میں کتاب آفرینش

---

[1] نجوم برای ہمہ ص ۷۴ تا ۷۷

کے بڑے بڑے نکات کا ذکر موجود ہے۔ ان آیات میں آسمان کی خلقت، ارضی وسماوی موجودات، زندگی وموت، آغاز وآسمان شناسی، زمین شناسی، نباتات شناسی، حیوان شناسی کیمسٹری، طبیعات اور اس قسم کے دیگر علوم کے موضوعات ہیں جو ہماری یونیورسٹیوں کے اساسی موضواعات کہلاتے ہیں۔ آج بہت سے ایسے محقق اور دانشور افراد موجود ہیں جو اس قسم کے مسائل میں سے کسی ایک مسئلے پر خصوصی ریسرچ کرنے کے بعد خالق کائنات کے وجود پر ایمان لانے پر مجبور ہوئے اور مومن بن گئے ہیں،

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے اس کے حکمت والا، زندگی عطا کرنے والا، موت دینے ولا، قادر۔ عالم اور دانا ہونے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

چنانچہ علم باری کے متعلق یوں فرمایا:

یعلم ما یلج فی الارض وما یخرج منھا وما ینزل من السماء وما یعرج فیھا

کل تک علماء آسمان سے نازل ہونے والی اشیاء کے لئے مثال یوں پیش کرتے تھے، مثلاً بادلوں سے نازل ہونے والی باران، نیز روایتوں اور دعاؤں میں بھی یہ ذکر ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بارش کے قطروں کی تعداد سے بھی آگاہ ہے۔ لیکن آج امام سجاد علیہ السلام کی یہ روایت بھی سامنے ہے اور آسمان سے ان پتھروں کے زمین کی طرف آنے اور جل کر راکھ ہو جانے والی توضیحات بھی ہمارے سامنے ہیں۔ لہٰذا اب اس مثال کو بدل کر یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آسمان سے نازل ہونے والی سب چیزوں کو جانتا ہے مثلاً وہ ان شہابی پتھروں کی بارش سے بھی آگاہ ہے جو زمین کی فضا میں بارش کی طرح آتے ہیں اور جل کر ادھر ادھر بکھر جاتے ہیں۔

سائنس دانوں کا کہنا ہے: ہر روز بقریباً دو کروڑ چھوٹے بڑے آسمانی پتھر زمین کی طرف آتے ہیں، یہ تعداد تو صرف ایک اندازہ ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ ان کی حقیقی تعداد سے آگاہ اور شناسا ہے۔

((وما ینزل من السماء))

آج کی سائنس کہتی ہے کہ کبھی کبھار بڑے آسمانی پتھر زمین کی فضا میں وارد ہوتے ہیں تو ان کا کچھ حصہ ہوا سے ٹکراؤ میں جل جاتا ہے اور ان کا باقی ماندہ حصہ زمین کے کسی خشک حصے یا سمندر میں آن گرتا ہے۔ لیکن کوئی شخص ان کی تعداد یا ان کے گرنے کے مقامات سے آگاہی نہیں رکھتا مگر اللہ تعالیٰ ان سب کی حقیقی تعداد اور ان کے گرنے کے مقامات کی مکمل تفاصیل کو جانتا ہے۔

((وما ینزل من السماء))

علم الٰہی ذرات پر حاوی ہے

ایک اور عجیب نکتہ بھی ہے کہ یہ جلے ہوئے پتھر راکھ کے چھوٹے چھوٹے ذرات کی شکل میں اس زمین کی فضاؤں میں بکھر جاتے ہیں اور ان میں سے کچھ زمین تک آن پہنچتے ہیں اور کچھ فضا میں اڑتے رہتے ہیں، ان ذرات کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ کوئی بھی اس پر آگاہ نہیں ہوسکتا، لیکن اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جو ان تمام ذرات کی تعداد کو بھی پوری طرح جانتا ہے۔

((وما ینزل من السماء))

آج کی سائنس کہتی ہے: زمین اپنی وقت جاذبہ کے ساتھ ان چھوٹے بڑے اجسام کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ یہ بھی اسی قوت جاذبہ کا کرشمہ ہے کہ تمام اشیاء اور تمام ذرات اس زمین کی سطح پر یا اس کی فضا میں محفوظ رہتے ہیں، کیونکہ یہ ساری فضا اس کی قوت جاذبہ کا میدان ہے۔ لیکن کبھی کبھار ایسا بھی ہوجاتا ہے کہ کچھ ناشناختہ اسباب کے تحت اور مخصوص کیفیت و حالت کے باعث چند ایک ذرات زمین کی قوت جاذبہ کے دائرے سے باہر فرار کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں، اور آسمان کی لامحدود فضاؤں میں چلے جاتے ہیں،

ذرات کا کشش زمین سے فرار

مرحوم شیخ طوسی رضوان اللہ علیہ ''**ومایعرج فیھا**'' کی تفسیر کرتے ہوئے اس کی مثال میں فرشتوں کے آسمان کی طرف چڑھنے اور لوگوں کے اعمال کے وہاں لے جائے جانے کا ذکر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سب سے مکمل طور پر آگاہ ہے۔ پھر اس بات کے پیش نظر کہ اس تکوین میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچھ ذرات نامعلوم اسباب کی وجہ سے زمین کی قوت جاذبہ اور کشش ثقل سے باہر نکل جاتے ہیں، اس سے ہمارے لئے ممکن ہوجاتا ہے کہ آج ہم اس مثال میں ان ذرات کے عروج کا اضافہ کریں اور اس نکتے کو ایک دوسری مثال کے طور پر پیش کریں۔ یعنی ہم کہیں کہ فقط اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات ہے جو اس امر سے آگاہ ہے کہ کس قدر ذرات کن اسباب سے اور کن حالات میں زمین کی کشش سے نکل گئے اور آسمانی خلاؤں میں چلے گئے ہیں۔

اگر ہم مان لیں کہ ایک گولی گیارہ کیلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے فضا میں پھینکیں تو پھر وہ ہرگز زمین کی طرف واپس نہیں آ گے گی۔ اس سے ہمیں بآسانی یہ یقین حاصل ہوجاتا ہے کہ اگر کوئی ایٹم (ذرہ) اسی سرعت کے ساتھ فضا میں حرکت کرے تو وہ بھی زمین کی طرف واپس نہیں آئے گا، پس اگر ہماری بالائی فضا کے کسی حصے میں ۲۳۰ کیلومیٹر دور لاکھوں گناہ دھماکے کے نتیجے میں کوئی ذرہ حرکت کرے تو ممکن ہے کہ وہ اس مذکورہ رفتار سے حرکت کرنے لگے اور زمین کی قوت جاذبہ اسے روکنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ پس ایسی صورت میں ممکن ہے کہ یہ ایٹمی ذرہ آفتاب کی فضا میں چلا جائے اور سورج کے گرد چکر لگانے لگے یا ستاروں کے مابین پائی جانے والی تاریک فضاؤں میں سرگردان ہوجائے۔ پھر یہ امکان بھی ہے کہ چند سال نہ گزرنے پائیں کہ وہی ذرہ دوبارہ زمین کی قوت جاذبہ کے جادو کا اسیر بن کر اس کی فضا میں پلٹ آئے اور اس کا جزء بن کر رہ جائے۔ [1]

حضرت امام سجاد علیہ السلام نے جو نوید سنائی ہے اس سے یہ امید بندھنے لگتی ہے کہ مستقبل کی تیز رفتار علمی ترقی کے بسبب انسان چند ایک دیگر حقائق اور واقعات کا ادراک کرنے میں کامیاب ہوجائے گا اور بہت سے پوشیدہ اور ناشناختہ مسائل معلوم کرلے گا۔ اس وقت کے علماء و دانشور ''ومایںزل من السمآء فیھا'' کے جملے کو ایک وسیع تر زاوئے سے دیکھیں گے۔ اس کے نتیجے میں وہ اس

---

[1] نجوم برای ہمہ ص ۵۴

ذات اقدس الٰہی کے سامنے اپنی عبودیت اور بندگی کے اظہار میں پہلے سے کئی گنا کا اضافہ کر دیں گے۔

اللہ تعالیٰ انسانوں کے ابدان کی طبیعی شناخت اور ان کے مابین پائے جانے والے گونا گون اختلافات سے مکمل طور پر آگاہ ہے۔ مثلاً انسان۔ عقل۔ ہوش، حافظہ، جسمانیت، سرشت، اور روش وغیرہ میں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتے ہیں اور ان اختلافات کی بنیاد رحم مادر ہی میں پڑ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام امور کا عالم ہے اور اس کا علم ان سب پر حاوی ہے، چنانچہ وہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن مجید میں فرماتا ہے:

اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ؕ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ۝۸ [1]

جنین اور علم الٰہی

اللہ تعالیٰ جانتا ہے اس کو جو ہر حاملہ خاتون اپنے شکم کے اندر اٹھائے ہوتی ہے اور وہ اس سے بھی آگاہ ہے جس کی ارحام کمی کر دیتے ہیں یا اضافہ کر دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر شئی کی ایک مقدار معین ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ؕ [2]

تحقیق قیام قیامت کی گھڑی کا علم فقط اللہ تعالیٰ کو ہے۔ اور وہی بارش برساتا ہے اور رحموں کے اندر جو کچھ ہو رہا ہے وہی جانتا ہے کہ (کس قسم کا بچہ کن صفات کے ساتھ پرورش پا رہا ہے)

اعمال مردم اور علم الٰہی

اس بارے میں کہ اللہ تمام نیک و بد اعمال اور جائز و ناجائز حرکات سے مکمل طور پر آگاہ ہے، قرآن مجید کا ارشاد یوں ہے:

اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝۸ [3]

بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ وہ لوگ کرتے ہیں۔

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝۲۸۳ [4]

جو کچھ تم لوگ کرتے ہو اس کو اللہ تعالیٰ پورے طور پر جانتا ہے۔

---

[1] سورۂ رعد آیت ۸

[2] سورۂ لقمان آیت ۳۴

[3] سورۂ فاطر آیت ۸

[4] سورۂ بقرہ آیت ۲۸۳

اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں کے بھیدوں کو جانتا ہے اور ان کی نیتوں، ارادوں افکار کو بھی جانتا ہے، اس بارے میں قرآن شریف میں متعدد آیات موجود ہیں:

يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ ۝١٩ [1]

اللہ تعالیٰ جانتا ہے آنکھوں کی بری حرکات کو اور جو کچھ سینوں کے اندر چھپا رکھا ہوتا ہے (وہ سب پر آگاہ ہے)

سئلت ابا عبدالله عليه السلام عن قوله عزوجل (يعلم خائنة الا عين) فقال الم ترالی الرجل ينظر الى الشيئ و كانه لا ينظر اليه فذالك خائنة الا عين [2]

راوی کہتا ہے: میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے بارے میں پوچھا کہ ''حائنتہ الاعین'' سے مراد کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: کیا تو نے نہیں دیکھا کہ کبھی کوئی شخص کسی شئی کی طرف اس طرح نگاہ کرتا ہے کہ گویا وہ اس کو نہیں دیکھ رہا اور یہی ''خائنۃ الاعین'' (آنکھوں کی خیانت ہے)

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ [3]

اے رسولؐ! کہہ دو کہ اگر تم چھپائے رکھو اس کو جو تمہارے سینوں میں ہے یا اس کو تم ظاہر کر دو، اللہ تعالیٰ اس سے پوری طرح آگاہ ہے

وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ۝٧ [4]

اور اگر تم بلند آواز سے بات کرو تو بہر حال اللہ تعالیٰ دل کے راز اور سب سے زیادہ مخفی بات کو بھی جانتا ہے۔

عن محمد بن مسلم قال سئلت ابا عبدالله عليه السلام عن قول الله عزوجل (يعلم السر واخفى) قال السر ما كتمته فى نفسك واخفى ما خطر ببالك ثم انسيته [5]

محمد بن مسلم نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ''یعلم السر واخفی'' کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا: سر سے مراد وہ چیز ہے جو تیرے دل میں موجود ہو اور تو اسے چھپائے ہوئے ہو۔ اخفیٰ سے مراد یہ ہے کہ ایک مرتبہ تیرے دل میں اس کا خیال آئے اور پھر تو اسے بھول جائے۔

[1] سورۂ مومن آیت ۱۹

[2] معانی الاخبار ص ۱۴۷

[3] سورۂ آل عمران آیت ۲۹

[4] سورۂ طٰہٰ آیت ۷

[5] بحار الانوار ج ۳ ص ۱۲۸

قرآن مجید میں لوگوں کے قلوب اور ان کے اذہان میں موجود خیالات، تصورات اور معلومات کے بارے میں مختلف تعبیرات استعمال ہوئی ہیں، ان سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب سے مکمل طور پر آگاہ ہے۔

جدید علم نفسیات کی تحقیقات میں ماہرین نے انسان کے ضمیر کے متعلق بہت زیادہ بحث کی ہے اور اس بارے میں کئی کتب لکھی ہیں۔ ہم ان آیات اور روایات کے مفاہیم کو کچھ زیادہ واضح کرنے کے لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ یہاں انسان کے ضمیر کے بارے میں جدید دور کے ماہرین کے نکتہ نگاہ کو پیش کریں اور اس پر مختصراً گفتگو کریں:۔

ضمیر یا ذہنی ذخیرہ

ایک آدمی کے ضمیر سے مراد اس کے ذہنی خیالات اور نفسانی صورتوں کا وہ مجموعہ ہے جو انسان کے باطن میں موروثی بطور پر پوری زندگی کے اکتساب کے بسبب مجتمع اور مرتکز ہو جاتا ہے۔ انسان کے ذہن کے خزانے میں ذخیرہ شدہ یہی خیالات اور تصورات وغیرہ ہی اس امر کا باعث بنتے ہیں کہ وہ ارادہ کرتا ہے۔ پھر یہی ارادہ انسان کے کسی روا یا ناروا، مطلوب یا نامطلوب عمل کے انجام دینے کا سبب قرار پاتا ہے۔

ذہن کے دائرے میں آنے والے یہ خیالات و معلومات چونکہ روشنی و تاریکی یا وضوع و ابہام کے اعتبار سے باہم فرق رکھتے ہیں اور انسان اپنے باطن میں پائے جانے والے اس تفاوت کو خود بخود محسوس بھی کرتا ہے۔ اس لئے دور حاضر کا علم نفسیات آدمی کے ضمیر کو دو بنیادی حصوں پر تقسیم کرتا ہے اور ان دونوں حصوں کے علیحدہ علیحدہ نام بھی تجویز کئے ہیں مثلاً آشکار اور پنہاں یا مستشعر (باشعور) اور غیر مستشعر (بے شعور)، یا خود آگاہ اور ناخود آگاہ پھر انہوں نے ہر ایک کے لئے مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ ہم یہاں پنہاں اور آشکار ضمیر کی شناخت کے لئے ایک ایسی جامع مثال پیش کرتے ہیں جو اسلامی تربیت کی شان کے لائق بھی ہو گی۔

ہر انسان جو اپنی ماں کے بطن سے متولد ہوتا ہے، وہ اپنے خلق و روش کے لحاظ سے بالفعل حیوان اور بالقوہ انسان ہوتا ہے۔ یعنی وہ تمام صفات اور سارے اخلاق و عادات جو طبیعی طور پر اس کے اندر موجود ہوتے ہیں اور اس کی نشو و نما کے ساتھ تدریجاً بروز وظہور کرتے جاتے ہیں وہ سب حیوانی غرائز ہوتے ہیں۔ مثلاً کھانا، پینا، شہوت، غضب،، حب ذات، کھیل کود، انتقام جوئی، تفوق طلبی، اور اس قسم کے جو حیوانی صفات ہیں۔ لیکن انہیں نومولود انسانی بچوں کے اندر انسانی صفات اور عمدہ اخلاق و عادات کو قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے اور ایک لائق مربی انہیں ایک اچھا انسان بنا سکتا ہے۔ وہ مربی یہ قدرت رکھتا ہے کہ اس نومولود کے وجود میں انسانی صفات کی پرورش کرے اور اسے مکارم اخلاق کا حامل بنا دے۔

حیوانی غرائز اندھے اور بہرے ہوتے ہیں، نہ انہیں حق و عدالت کی سمجھ ہوتی ہے اور نہ ہی انصاف وفضیلت کا شعور ہوتا ہے۔ یہ غرائز ہر صورت اور ہر حالت میں اپنی سیرابی اور پیٹ پوجا کا تقاضا کرتے رہتے ہیں۔ لیکن انسانی صفات عدل وانصاف اور قانون کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتی ہیں، انسان کی تربیت اس کے بے لگام غرائز کو قابو کرنے کا باعث بنتی ہے۔ یہ تربیت فردی

سعادت اور اجتماعی مصلحت کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے ان غرائز کو بروئے کار لانے کی اجازت دیتی ہے۔ یہ تربیت ہی ہے جو ناجائز تمناؤں اور غرائز کی خلاف مصلحت نمود کو روکتی اور ان پر غلبہ پا لیتی ہے۔

تربیت

بشر کے پہلے ضمیر کی بنیاد حیوانی غرائز وصفات کے ذریعے رکھی جاتی ہے۔ اور اس کے دوسرے ضمیر کی اساس اسلامی تربیت اور انسانی اخلاق پر قائم ہوتی ہے۔ اگر ایک انسان کو بالکل صحیح طریقے کے مطابق تربیت دی جائے، اس کی طبیعت میں انسانی صفات پوری طاقت کے ساتھ قائم ہو جائیں اور اس کی رگ وجان میں اخلاق حسنہ گہرائی تک اتر جائیں، یہاں تک کہ ان کو اس کے حیوانی صفات پر غلبہ حاصل ہو جائے۔ اس وقت تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے باطن سے درندگی کو خو بو بالکل ختم ہو جاتی ہے اور اس کے حیوانی ضمیر کی مکمل طور پر نابودی ہو جاتی ہے۔ بلکہ ہوتا یہ ہے کہ حیوانی صفات انسانی تربیت کے پردے کے پیچھے چھپ جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ گویا انسان کے وجود میں جو کچھ ظاہر میں دکھائی دیتا ہے وہ اس کے صفات انسانی ہوتے ہیں، ہاں ایسے تربیت شدہ فرد کے بارے میں ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ اس کا آشکار ضمیر انسانی خلق ہے اور اس کا مخفی ضمیر اور حیوانی خود خلق ہے۔

آدمی اپنے حیوانی غریزہ کے تحت غصے اور جوس کی حالت میں چاہتا ہے کہ اپنے غصے کے تحت کسی مورد غضب شخص سے انتقام لے۔ لیکن اسلامی مکتب اپنے پیروکاروں کو تربیت دیتا ہے کہ اپنے غصے پر قابو پائیں، دوسرے لوگوں کی لغزشوں سے چشم پوشی کریں اور ان کے ساتھ نیکی اور احسان کا سلوک کریں۔

وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۱۳۴ [1]

غرائز پر تربیت کا غلبہ

یعنی ایک حقیقی مسلمان جس کا آشکار ضمیر اسلامی تعلیمات سے آراستہ ہو جاتا ہے وہ ایک ایسا شخص ہوتا ہے جو اپنے غصے کے وقت مورد غضب شخص کو بخش دیتا ہے اور اس پر احسان کرتا ہے۔ لیکن اس بخش اور چشم پوشی کا یہ مطلب نہیں کہ حیوانی خو اور انتقام جوئی کی حس اس مسلمان انسان میں بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس کے وجود کے اندر حیوانی خو کو قیدی بنا دیا گیا ہے اور اسلامی وانسانی خو نے اس کے آشکار اور تربیت یافتہ ضمیری کی تعلیم کے مطابق اس کے ارادوں اور ان کو استعمال میں لانے کی باگ دوڑ اپنے ہاتھ میں لے لی۔

اسی لئے تو بعض شریف مسلمان افراد کہ جو انسانی اخلاق سے آراستہ ہو جاتے ہیں اور ان کا آشکار ضمیر اسلام کی اعلیٰ تعلیمات سے پیراستہ ہو چکا ہوتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی وہ کچھ اس طرح سے حالات وواقعات کے اثر میں آجاتے ہیں کہ آپے سے باہر ہو

---

[1] سورۂ آل عمران آیت ۱۳۴

جاتے ہیں۔ تب عنان صبران کے ہاتھوں سے چھوٹ جاتی ہے اور حیوان خواور درندگی کی کیفیت راکھ کے ڈھیر سے نکل کر کچھ اس طرح شعلہ ور ہو جاتی ہے کہ وہ شخص ایک ہی لمحے میں بھڑک اٹھتا ہے۔ اس وقت یہی انسان شریف ہونے کے باوجود وحشیانہ انداز اختیار کر لیتا ہے اور انسانی انداز کے خلاف کام کرنے لگتا ہے۔

قال علی علیه السلام: الشر کا من فی طبیعة کل احد فان غلبه صاحبه بطن وان لم یغلبه ظهر [۱]

بشر کی طبیعت

امام علی علیہ السلام کا فرمان ہے: بدی اور بدخواہی کے جو بشر کی ہوائے نفس اور درندگی کی پیداوار ہے، وہ تمام انسانوں کی سرشت میں پنہاں ہو کر موجود رہتی ہے۔ پس اگر کوئی شخص اپنی ایمانی طاقت اور صفات کے ذریعے اس پر غلبہ پا لے تو یہ بدی کے میلانات ضمیر باطن کی طرف چلے جاتے ہیں اور وہاں چھپے رہتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنی حیوانی کشش پر غلبہ پانے میں کامیاب نہ ہو سکے تو اس کے بدی کے میلانات اور ظاہر اور پردہ خفا سے باہر آ جاتے ہیں۔

وعنه علیه السلام: النفس مجبولة علی سوء الادب والعبد مامور لملازمة حسن الادب والنفس تجری بطبعها فی میدان المخالفة والعبد یجهد بردها عن سوء المطالبة فمتی اطلق عنانها فهو شریك فی فسادها ومن اعان نفسه هوی نفسه فقد اشرك نفسه فی قتل نفسه [۲]

ہمارے فریضے اور طبیعت کے تقاضے کا تقابل

حضرت امام علی علیہ السلام نے ہی فرمایا: نفس امارہ کا رجحان طبعی طور پر ناپسندیدہ کاموں اور بداخلاقی کی طرف ہے، لیکن انسان کا فریضہ ہے کہ وہ حسن کردار پر عمل کرے۔ پس آدمی کا نفس اپنی طبیعت کے مطابق بدی کا راستہ اپناتا ہے اور مخالفانہ اقدام کرتا ہے، لیکن اچھا انسان وہ ہے جو جدوجہد کرتا ہے اور اپنے نفس کی غلط خواہشات کو رد کر دیتا ہے۔ پس اگر کوئی شخص اپنے سرکش نفس کی لگام آزاد چھوڑ دیتا ہے اور اسے اپنی مرضی پوری کرنے دیتا ہے تو یہ آدمی اپنی تباہی اور اپنے نفس کے فساد میں خود اس کے ساتھ شریک ہو گیا اور اگر اس نے اپنے نفس کی مرضیوں کے حصول میں اس کے ساتھ تعاون کیا تو آدمی اپنے نفس کے قتل میں اس کا ساتھی اور شریک بن گیا۔

---

[۱] فہرست غرر ص ۱۷۳

[۲] مستدرک ج ۲ ص ۲۷۰

خلاصہ یہ ہوا کہ اس مثال میں دینی تعلیمات، مکارم اخلاق، انسانی صفات اور اجتماعی قوانین سب مل کر ایک انسان کے ذہن کے جس حصے کو روشن کرتے اور اسے تربیت دیتے ہیں، وہ اس کا آشکار ضمیر ہوتا ہے جو اس سے آراستہ و پیراستہ ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں درندہ خوئی۔ انتقام جوئی، فساد و تباہی، تجاوز و دست درازی وغیرہ جیسے برے اخلاق انسان کے ذہن کے جس حصے کو تاریک کرتے ہیں وہ اس انسان کا پنہاں ضمیر ہوتا ہے۔ اس پنہاں ضمیر اور آشکار ضمیر کی توضیح کے لئے سینکڑوں مثالیں موجود ہیں جو مختلف موارد میں پیش کی جا سکتی ہیں۔

اس سے پہلے جو دو روایتیں ذکر ہوئی ہیں اور دیگر روایات جو اس بارے میں ملتی ہیں، ان سب سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ آدمی کے اندر ایک پنہاں ضمیر بھی موجود ہوتا ہے، بلکہ یہ ضمیر اس حد تک طاقتور ہوتا ہے کہ اگر قابو میں نہ رہے تو آشکار ہو جاتا ہے اور آدمی کو ناجائز اقدامات کرنے پر آمادہ کر لیتا ہے۔

ایک مرموز قوت

اسٹیفن ٹسویک کہتا ہے: فرائیڈ سے قبل کے ماہر نفسیات اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ انسان کی روحانی طاقت اور توانائی مکمل طور پر عقلی اور منطقی استدلالات سے متاثر نہیں ہوتی، بلکہ علت و عقل کے قانون کے پس پردہ ایک ایسی مرموز توانائی اور انتہائی اہم طاقت مستور ہے جو فکر و تصور کے برخلاف اپنے مخصوص تقاضوں کے مطابق عمل کرتی ہے۔ لیکن چونکہ ماہرین نفسیات نے ان استنباطات کو ظاہر نہ کیا اور ان کے حل کے درپے نہ ہوئے تھے، اس لئے ان کو تحلیل و تجزیہ سے قاصر رہے ہیں۔

درحقیقت ان سے خطا سرزد ہوئی وہ یہ تھی کہ وہ ایک غیر متشعر (لاشعور) چیز کو اپنی تحقیق و مطالعہ کا مورد قرار دینے سے عاجز تھے، اس لئے انہوں نے اپنی ساری روحانی تحقیقات کا دائرہ مستشعر مسائل تک محدود رکھا۔ یعنی انہوں نے ایسے تظاہرات و استنباطات کے سلسلے کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے رکھا جو انہیں متشعرات کے نور میں روشن اور قابل تمیز نظر آئے، لیکن جو کچھ ان حدود سے باہر تھا، انہوں نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی۔

فرائڈ نے اس نظریے کے خلاف کمر باندھی اور اس نے نہ فقط غیر مستشعر کو اپنی روحانی تحلیل کے علم کی تحقیقات میں داخل کیا، بلکہ بہت سی ایسی تاویلات و تفسیرات جو اس زمانے میں روحانی مسائل کے بارے میں ایک مروجہ فلسفہ کی حیثیت اختیار کر چکی تھیں اور سب لوگوں کے ہاں مقبول و معمول بن چکی تھیں، اس نے ان کو بھی چیلنج کیا اور ان میں تبدیلیاں لایا۔

ایک غیر مستشعر وادی

فرائڈ کا عقیدہ یہ ہے کہ عوامی تصور کے برخلاف فقط مستشعر ہی میں روحانی تظاہر نہیں ہے بلکہ انسان کی روح میں ایک غیر مستشعر وادی بھی موجود ہے۔ مگر قطع نظر اس کے کہ جو ہمارے شعور میں آ سکتا ہے، وہ اس سے کمتر نہیں ہے بلکہ تمام روحانی تظاہرات

بھی ابتدائی مرحلے میں اس غیر مستشعر وادی میں پیدا ہوتے ہیں، پس فرائڈ نے اپنے اس عقیدے سے اس نکتے کو واضح کیا کہ کسی شئی کا غیر مستشعر ہونا (سمجھ میں نہ آنا) اس کے معدوم ہونے کی دلیل نہیں ہے، اس بنیاد پر علم نفسیات میں ایک نئی طرح ڈال دی گئی اور نئی فکری اساس قائم ہوگئی۔[۱]

ایک چھوٹا بچہ اپنی طبعی کشش اور بنیادی اور اپنے غریزی رجحان کی وجہ سے چاہتا ہے کہ وہ ہر طرف سے مکمل طور پر آزاد ہو۔ لیکن اس کی یہ بلا قید و شرط اور مطلق آزادی دائماً برقرار نہیں رہ سکتی، کیونکہ ایسی آزادی نہ تو ان انسانی فضائل اور اخلاق حسنہ کے ساتھ موافقت رکھتی ہے جو پیغمبران خدا کی تربیت کا ہدف ہیں اور نہ ہی یہ مطلق آزادی، تمدن اور معقول معاشرتی زندگی کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکتی ہے، حالانکہ انسان کے لئے اس قسم کی متمدن زندگی ایک ضروری اور ناقابل اجتناب حقیقت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ والدین کا دینی اور علمی وظیفہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے فرزند کو ناجائز اور نامناسب کاموں سے منع کریں اور اسے مذہبی اور اجتماعی مقررات و قوانین کے مطابق زندگی گزارنے کی تربیت دیں۔

مغلوب رجحانات

پس زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ وہ بچہ سمجھ لیتا ہے کہ اسے اپنی بہت سی نفسیاتی خواہشات سے چشم پوشی کرنا ہے اور اسی طرح اپنی بہت سی قلبی ترجیحات کو دبا دینا ہے۔ پس اس کے یہ مغلوبہ رجحانات بالکل نابود تو نہیں ہو سکتے لیکن آہستہ آہستہ ضمیر آگاہ و آشکار اسے ذہن کی پنہاں وادی کی طرف اتر جاتے ہیں اور مخفی و پنہاں ضمیر کے اندر ذخیرہ ہو جاتے ہیں۔

طبیعی ''من'' اور اجتماعی ''من''

ایک تربیت یافتہ انسان جس نے مذہبی اور اجتماعی قوانین و مقررات کو قبول کر لیا ہو، وہ جب لوگوں میں زندگی گزارتا ہے تو اپنے اندر دو قسم کے ''من'' پاتا ہے۔ اول ''من'' طبیعی دوم ''من'' اجتماعی اس کا طبیعی ''من'' چاہتا ہے کہ وہ بلا قید و شرط اپنے تمام حیوانی غرائز اور حیوانی خلق و خو کو سیر کرے اور اس پر کوئی پابندی نہ ہو۔ لیکن اجتماعی ''من' کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے معاشرے میں ایک متدین اور متمدن انسان کے طور پر پہچانا جائے۔ پس اپنے اس مقصد کو پانے کے لئے اس کا اجتماعی وجدان باقاعدہ طور پر اس کے طبیعی ''من'' کی خواہشات کو پابند کرنے لگتا ہے۔ پھر جوں ہی اس کی غریزی کشش اسے تدین یا تمدن کی حدود کو پھلانگنے پر مائل کرتی ہے تو اس کا یہ اجتماعی ''من'' سد راہ بن جاتا ہے، وہ اپنے پنہاں اور مخفی ضمیر کی وادی میں پلٹنے پر مجبور کر دیتا ہے اور اس کو ظاہر ہونے سے روک دیتا ہے۔

---

[۱] فرائڈ و فرائڈازم ص ۲۹

ضمیر مخفی اور ضمیر آشکار

فلی سین شالے کہتا ہے: کہ فرائڈ اپنی کتاب ''پسیکا نالیز پر ایک مقدمہ'' میں ایک خصوصی جائزہ ترتیب دیتے ہوئے لکھتا ہے۔ ہماری نظر میں اس قاعدے کو سمجھانے کے لئے بہترین اور آسان ترین اسلوب یہ ہے کہ اس کو ایک مکانی تجسم کی شکل میں واضح کیا جائے۔ چنانچہ ہم ''ضمیر مخفی'' کے نظام کو ایک انتظام گاہ سے تشبیہ دیتے ہیں، اس میں نفسیاتی رجحانات اس قدر کثیر تعداد میں بھر ہوئے ہیں جس طرح کسی کمرے میں زندہ اور جاندار افراد کو بہت زیادہ تعداد میں ٹھونس دیا جاتا ہے۔ پھر اس انتظام گاہ کے متصل ایک بہت ہی تنگ سا کمرہ ہے کہ اس میں ضمایر آشکار نے رہائش رکھی ہوئی ہے۔ اس کمرے کے اندر داخل ہونے والے دروازے پر ایک ہوشیار محافظ بیٹھا ہوا ہے جو نفسیاتی میلانات میں ہر اک کی چھان پھٹک کرتا ہے۔ اگر وہ اس کے میلان کے مخالف ہو تو اسے اس ملحقہ کمرے میں داخل ہونے سے روک دیتا ہے۔ لہٰذا وہ تمام میلانات جو ضمیر مخفی سے مختص کمرے کے اندر موجود ہیں، وہ پڑوسی کمرے میں رہائش پذیر ضمیر آشکار دید سے مخفی اور پنہاں ہیں۔ اس دروازے پر آنے کے بعد جب پڑتال کرنے والا محافظ ان کو پیچھے دھکیل دیتا ہے تو یہ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ وہ تا حال خود کو ضمیر آشکار کے ساتھ تبدیل کر دینے والی ضروری طاقت سے محروم ہیں۔''[1]

دینی وجدان

جو لوگ حقیقی مسلمان ہیں اور دین اسلام کے حقیقی کمال کے باعث اس کی طرف جھکے ہیں، ان کا ضمیر آشکار قرآن مجید کی اعلیٰ تعلیمات سے بھرا ہوا ہے۔ اس گروہ کا اسلامی وجدان خلوت وجلوت ہر حالت میں اپنے ضمیر باطن کا نگران رہتا ہے اور جونہی ان کے اندر کوئی میلان سر اٹھاتا ہے تو وہ فوراً زیر تفتیش قرار پا جاتا ہے۔ پھر اگر وہ سلامی موازین کے مطابق ہوتا ہے تو ضمیر آشکار کے دائرے میں وارد ہو جاتا ہے اور عمل کے حدود میں آ جاتا ہے۔ اگر وہ خداوندی قانون اور اسلامی معیار پر پورا نہیں اترتا تو اسے ضمیر باطن کی طرف دھکیل دیا جاتا ہے اور وہی اوندھے منہ پڑا رہتا ہے۔

قال علی بن الحسین علیه السلام: الرجل کل الرجل نعم الرجل هو الذی جعل هواه تبعا لامر الله[2]

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام نے فرمایا: ایک واقعی مرد، ایک کامل مرد، ایک اچھا اور شائستہ مرد وہ ہے جو اپنی ہوائے نفس کو حکم الٰہی کے تابع رکھے اور اپنے سارے غرائز کو رضائے خداوندی کے مطابق سیر کرے۔

---

[1] فرائڈ و فرائڈ ازم ص ۲۴

[2] مجموعہ ورام ج ۲ ص ۱۰۰

منافقین کی روش

وہ منافق لوگ جو واقعی ایمان والے نہیں ہوتے بلکہ بظاہر اسلام کو کلمہ پڑھتے اور نام کے مسلمان ہوتے ہیں، وہ اپنے آپ کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں کہ پکے مسلمان ہیں اور ان کا ضمیر آشکار اسلامی تعلیمات پر ہے، حالانکہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہوتے ہیں، ان کا عقیدہ وہ نہیں ہوتا،

يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ [1]

وہ اپنی زبانی باتوں کے ساتھ تمہیں خوش کرتے ہیں حالانکہ ان کا ضمیر ان کی باتوں کا منکر ہوتا ہے۔

یہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنی غیر مشروع خواہشات سے چشم پوشی نہیں کرتے ہیں۔لیکن اپنی اجتماعی حیثیت کے تحفظ کے لئے لوگوں کے سامنے خداوندی نظام کی باتیں کرتے ہیں اور جوں ہی خلوت میں جاتے ہیں تو وہی خود سیر اور بے لگام انسان ثابت ہوتے ہیں اور اپنی غلط خواہشات کی عملی اطاعت کر رہے ہوتے ہیں۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ښ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۝۱۴ [2]

اور جب وہ اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اور جب اپنے شیاطین کی خلوت میں جاتے ہیں تو انہیں کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، (مسلمانوں سے) تو ہم فقط مسخرگی کرتے ہیں۔

علم الٰہی

اللہ تعالیٰ کے علمی دائرہ کی وسعت کے متعلق قرآن مجید یوں تعلیم دیتا ہے کہ وہ سب کچھ جو لوگوں کی فکر و عقل میں آتا ہے، بالفاظ دیگر جو کچھ ضمیر آشکار اور ضمیر مخفی میں موجود ہے اللہ تعالیٰ اس سے آگاہ آشنا ہے۔

خداوند عالم جانتا ہے کہ کس انسان نے الٰہی تعلیمات کے حقیقی کمالات سے متاثر ہو کر ان کو قبول کیا اور غیر مشروع رجحانات کو دبا کر رکھا ہے۔اسی طرح وہ یہ بھی جانتا ہے کہ کس شخص نے لوگوں کو دکھلانے کے لئے بظاہر مسلمانی کا دعویٰ کیا ہوا ہے اور وہ خلوت میں اپنی اسلام دشمن اور مخالفت انسانیت خواہشات کا پیروکار رہتا ہے۔

اس حقیقی مسلمان کہ جس کا ضمیر آشکار الٰہی تعلیمات سے آراستہ ہوتا ہے، اگر کبھی خاص حالات میں مجبور ہو جائے اور ناچار ہو کر اسے اسلام کی نفی کرنا پڑے تو ایسی حالت میں بھی اللہ تعالیٰ اس کے حقیقی ایمان اور اسلامی ذہن سے آشنا و آگاہ ہوتا ہے۔

---

[1] سورۂ توبہ آیت ۸

[2] سورۂ بقرہ آیت ۱۴

اِلَّا مَنْ اُکْرِہَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِیْمَانِ [1]

مگر وہ کہ جو مجبور کر دیا جائے اور اس کا دل ایمان پر اطمینان رکھنے والا ہو۔

اگر کوئی منافق شخص ایمان کا مدعی بنے اور اپنے مخالف اسلام خیالات کو مسلسل چھپائے رکھے اور خلوتوں میں فقط اپنے رفقاء پر ظاہر کرے، تاہم اللہ تعالیٰ اس کے ضمیر اور اس کے باطن سے خوب آگاہ ہے۔

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِیْ صُدُوْرِکُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ یَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ [2]

کہہ دو! جو کچھ تمہارے سینے میں ہے تم اسے چھپائے رکھو یا ظاہر کرو اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے۔

ضمیر نیم روشن

ضمیر باطن کے اندر پائے جانے والے معلومات درجہ خفاء کے لحاظ سے باہم فرق رکھتے ہیں، چنانچہ بعض سوالات یا رجحانات کو پیچھے دھکیل دیا جاتا ہے، وہ ضمیر پنہاں کے نیم روشن حصے میں جگہ بنا لیتے ہیں اور پھر معمولی سی توجہ کے ساتھ ضمیر آشکار کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے موارد میں ضمیر پنہاں کا معنی یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص اپنے ضمیر کے اندرونی مطالبات سے آگاہ ہونے کے باوجود اس کوشش میں لگا ہوتا ہے کہ ان کو مخفی رکھے۔ مثلاً ایک فرد کسی دوسرے فرد کا دشمن ہوتا ہے، لیکن معاملات کی کسی مصلحت کے مدنظر اس کے دشمنی کے خیال کو پیچھے دھکیل دیتا ہے، اسے اپنے ضمیر باطن میں چھپائے رکھتا ہے اور ظاہر میں اس فرد کے ساتھ محبت اور دوستی کا مظاہرہ کرتا رہتا ہے۔

ضمیر ناخودآگاہ

ضمیر مخفی کے چند ایک امور ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں پیچھے دھکیل دیا جاتا ہے اور وہ اس قدر پنہاں ہو جاتے ہیں کہ آدمی خود بھی ان سے ناآگاہ اور غافل ہو جاتا ہے۔ پھر ان میں سے کچھ ایسے امور ہوتے ہیں کہ سخت توجہ کرنے اور اپنی طاقت صرف کرنے کے بعد ان کا ناخودآگاہ ضمیر سے خود ضمیر کی طرف منتقل ہو جانا ممکن ہوتا ہے۔ لیکن دوسرے امور ایسے بھی ہوتے ہیں کہ پردہ نسیان کے نیچے اس طرح پوشیدہ ہو جاتے ہیں کہ سخت توجہ اور بہت زیادہ طاقت کے صرف کرنے کے باوجود وہ خودآگاہ ضمیر کی طرف منتقل نہیں ہو سکتے۔

ناخودآگاہی کے درجات

امریکہ کا ماہر نفسیات پروفیسر کہتا ہے:

---

[1] سورۂ نحل آیت ۱۰۶

[2] سورۂ آل عمران آیت ۲۹

ایک آدمی کے بس میں یہ بات نہیں کہ وہ بچپن کے زمانے میں اپنی زبان کے تکامل سے قبل کے تمام مشاہدات اور تجربات کو واضح طور یاد کر سکے۔لیکن باوجود اسکے کہ ایک شخص اپنے اولیہ تجربات اومشاہدات کی یادآوری پر قادر نہیں ہوتا پھر بھی یہ سارے اموراس کی شخصیت کی ترقی میں اہم عوامل کا مقام رکھتے ہیں۔

فراڈ کہتا ہے: ناخودآ گاہ ضمیر کے دو مختلف حصے ہیں ایک نیم خودآ گاہ اور دوسرا ناخودآ گاہ مطلق۔ان دونوں کے درمیان فرق ہے۔پہلا یعنی نیمہ خودآ گاہ قسم کا واقعہ ایسا ہوتا ہے کہ بڑی آسانی کے ساتھ خودآ گاہ حصے میں وارد ہوجاتا ہے۔کیونکہ اس کے مقابل اس کی طاقت بہت ہی صعیف ہوتی ہے۔لیکن بعض ناخودآ گاہ قسم کے واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں خودآ گاہ حصے کے میدان میں وارد ہونے کے لئے بہت زیادہ کوشش اور کافی وقت کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس کی مخالف قوت انتہائی سخت ہوتی ہے۔اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ درحقیقت ناخودآ گاہی کے مختلف درجات ہیں، ایک طرف تو ایسے ایسے خیالات دل میں موجود ہیں کہ اسباب تحرک کے غیر موجود ہونے کی وجہ سے کبھی بھی خودآ گاہ مرحلے کی طرف منتقل نہیں ہوتے، دوسری طرف ایسے خیالات بھی ہوتے ہیں کہ گویا نوک زبان پر آئے ہوئے ہیں۔چونکہ کسی بھی روحی معاملے کا خودآ گاہ حصے میں اتر آنا وہاں بہت زیادہ قوت کے جمع کرنے کی حاجت رکھتا ہے، اس لئے ضروری ہوجاتا ہے کہ یہ قوت مہیا کرنے کے لئے دیگر روحی واقعات وجریانات کی طاقت کو ادھر منتقل کیا جائے۔" [1]

ضمیر مخفی کی واقعی ماہیت ہمارے لئے اس طرح ہے مبہم اور مجہول ہے جس طرح اس جہان خارج کی حقیقت ہمیں معلوم نہیں ہے۔ہمارا ضمیر آشکار ہمارے ضمیر مخفی کے بارے میں اس طرح اطلاعات رکھتا ہے جس طرح ہماری روح کی اصلیت اپنے اس جہان خارج کی شناسائی کے بارے میں انتہائی کم معلومات رکھتی ہے۔"

ضمیر مجاور

کچھ حالات ایسے ہوتے ہیں کہ انتہائی محدود وقت میں، بڑے مخفی طریقے سے کم وبیش بعید زمانے میں ضمیر آشکارا کی نظر میں آتے ہیں۔اس لئے ممکن ہے کہ وہ بڑی آسانی کے ساتھ دوبارہ ضمیر آشکاری کی طرف پلٹ آئیں۔انہیں ضمیر آشکار کی طرف واپس آنے کے لئے اتنا ہی کافی ہوتا ہے کہ وہ چند ایک مقررات کی پیروی کریں اور اپنے آپ کو زیر نگرانی لے آئیں۔فرائڈ اس قسم کے نفسانی حالات کو "ضمیر مجاور" کا نام دیتا ہے۔

کچھ حالات ایسے ہیں جو زمانہ حال واستقبال ہر دور میں ضمیر مخفی میں مکمل طور پر مخفی رہتے ہیں، چنانچہ فرائڈ فقط اسی قسم کے حالات پر ضمیر مخفی کا اطلاق کرتا ہے۔ان حالات کے لئے ممکن ہے کہ وہ کبھی بھی ضمیر آشکار کی نگاہ تلے نہ آئیں، کیونکہ ایسا حافظہ بھی موجود ہے جو ضمیر مجاور کے حالات کو اپنے اندر محفوظ رکھے بغیر بھی کام کرتا ہے اور ضمیر مخفی کے تمام حوادث اسی کے اندر اپنا نقش جماتے ہیں۔

---

[1] روانشناسی فرائڈ ص ۸۸

حقیقی تفتیش

یا ممکن ہے کہ مندرجہ بالا حالات ضمیر آشکار کی نظر سے گزر کر بالآخر اس طرح ایک حقیقی تحقیق کے تحت واقع ہوں کہ پھر واپسی کے قابل ہی نہ رہیں۔ اس صورت میں مذکورہ حالات وواقعات واپس دھکیلے جا چکے ہوتے ہیں اور وہ قادر نہیں رہتے کہ دوبارہ ضمیر آشکار کی طرف پلیٹیں، بنابریں معلوم ہوا کہ وہ نفسانی حالات جو وقتی طور پر پنہاں ہوتے ہیں وہ (اصلی ضمیر مخفی) کے ساتھ یکساں نہیں ہیں۔"[1]

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ضمیر مخفی یا ضمیر ناخود آگاہ کا حقیقی اور مکمل مفہوم آج کے علم نفسیات میں یہ ہے کہ اس دائرے میں آنے والے تمام اسرار اور معلومات ایک مخصوص حافظے میں محفوظ ہو جاتے ہیں جو بہت حد تک مستور اور مخفی ہوتے ہیں اور ضمیر آشکاری کی طرف کبھی بھی منتقل نہیں ہوتے۔ لیکن ایسے تمام اسرار جو انسان کے ضمیر میں پنہاں ہوں اور بعض اسباب یا کچھ توانائی صرف کرنے سے وہ ضمیر آشکار کی طرف منتقل ہو سکتے ہوں تو ایسے ضمیر کو "ضمیر نیم آگاہ" یا "ضمیر مجاور" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

آج سے چودہ صدیاں قبل جب قرآن مجید علمی دائرے کی وضاحت کے درپے ہوا تو اس نے 'سر' اور 'اخفی' کے دو کلمات استعمال کئے اور ان سے اس دقیق فرق کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ نیز حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے اس تفاوت کو بڑی صراحت کے ساتھ بیان فرمایا

السر ما كتمته في نفسك واخفى ما خطر ببالك ثم از [2]

سر اور اخفی

یعنی سر وہ ہے کہ جسے تو اپنے اختیار کے ساتھ اپنے ضمیر میں چھپا لے اور مخفی وہ ہے کہ کبھی تیرے دل میں اس کی یاد آئے اور پھر تو اسے بھلا دے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجموعہ کائنات، ارضی وسماوی، ارحام مادران میں پنپنے والے فرزندان، بشر کے اعمال وافعال، انسانوں کے مخفی اور آشکار افکار واسرار مختصر یہ کہ اس عالم ہستی کے تارے کلیات وجزئیات علم الٰہی کے دائرے میں موجود ہیں اور اللہ تعالیٰ ان سے مکمل طور پر آگاہ اور ان کا عالم ہے۔

قال علی علیه السلام: یعلم عجیج الوحوش فی الفلوات، ومعاصی العباد فی الخلوات، واختلاف النیان فی البحار الغامرات وتلاطم الماء بالریاح

---

[1] فرائڈ وفرائڈازم ص ۲۳

[2] معانی الاخبار ص ۱۴۳

العاصفات[۱]

(ایک خطبہ کہ جس میں آپ اللہ تعالی کے علم کی طرف اشارہ فرمارہے تھے) امام علی علیہ السلام نے فرمایا: اللہ تعالی جنگلی حیوانات کی آوازوں کو جانتا ہے، اپنے بندوں کی ان نافرمانیوں کو جو وہ خلوت گاہوں میں کرتے ہیں، مچھلیوں کی امدورفت کو جو وہ سمندروں کی گہرائیوں میں کرتی ہیں اور پانی کی امواج اوران لہروں کو جو تیز وتند ہواؤں اور طوفانوں سے وجود میں آتی ہیں۔ اللہ تعالی ان سب چیزوں سے بخوبی آشنا وآگاہ ہے۔

اسلام کا مقدس آئین اپنے پیروکاروں سے یہی خواہش کرتا ہے کہ وہ سب پورے خلوص کے ساتھ اپنے پروردگار کی عبادت کریں۔ وہ اپنے خدا کی عبادت اُسے خدا سمجھ کر کریں اوراس مولی کی درگاہ میں وہی عبادت قابل قبول قرار پاتی ہے۔ جو خلوص عبادت ہوتی ہے، ہمارے ہاں اس بارے میں بہت سی روایات موجود ہیں۔

قالا علی علیه السلام: الا خلاص ملاك العباد[۲]

امام علی علیہ السلام نے فرمایا: عبادت کا دارومدار خلوص نیت پر ہے۔

وعنه علیه السلام: انك لن يتقبل من عملك الا ما احلصلت فيه[۳]

نیز امیرالمومنین امام علی علیہ السلام ہی نے فرمایا: تیرا کوئی بھی عمل درگاہ الٰہی میں قابل قبول نہیں مگر یہ کہ تو نے اسے خلوص کے ساتھ انجام دیا ہو۔

خلوص عمل

خلوص کا تعلق انسان کے نفسانی کیفیات او ضمیر سے ہے اور یہ عقیدہ کہ اللہ تعالیٰ ہر شئی کا عالم ہے۔ اسلام کے قانون خلوص کے اجرا کا ضامن ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ انسان کے تمام اسرار اور رازوں پر آگاہ ہے تو وہ حتما اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ اس کی ساری عبادت پاک و پاکیزہ اور ہر قسم کی آلائشوں سے مبریٰ ہونا چاہئیں اوران کو مخفی یا آشکار شرک سے آلودہ نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ اسے علم ہے کہ آلودہ اور ناخالص عبادت نہ فقط یہ کہ موجب نجات وسعادت نہیں ہوسکتی، بلکہ انسان کو مشرکین کی صف میں کھڑا کردیتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مستوجب سزا قرار پاجاتا ہے۔

عن رسول الله صلى الله عليه واله: انه ستل فيما النجاة غدا فقال, انما النجاه فى ان لا تخادعو الله فيخدعكم فانه من يخادع الله يخده ويخلع من الايمان ونفسه

---

[۱] نہج البلاغہ خطبہ ۱۸۹

[۲] فہرست غررص ۹۱۔ ۹۲

[۳] فہرست غررص ۹۱۔ ۹۲

يخدع من الايمان ونفسه يخدع لو يشعر فقيل له و كيف يخادع الله قال يعمل بما امر الله به ثم يريد به غيره فاتقوا الله واجتنبوا الرئآء فانه شرك بالله المرآئى يدعى يوم القيامة باربعة اسماء: يا كافر يا فاجر يا غادر يا خاسر حبط عملك وبطل اجرك[1]

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ کل بروز قیامت نجات کس چیز سے ہے؟

آنحضرتؐ نے جواب میں فرمایا: نجات فقط اس میں ہے کہ اپنے اللہ کے ساتھ دھوکہ اور فریب نہ کرو کہ پھر اللہ تعالیٰ بھی تمہیں دھوکے میں ڈال دے گا۔ جو کوئی اللہ تعالیٰ سے دھوکہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے دھوکے میں مبتلا کر دیتا ہے اور اس کا ایمان سلب کر لیتا ہے۔

دھوکہ سے پرہیز

جو کوئی اللہ تعالیٰ سے دھوکا کرتا ہے اگر وہ اسے صحیح طور سے سمجھے تو درحقیقت اپنے آپ کو دھوکہ دیتا ہے۔ اس پر حضرت رسول اکرمؐ سے پوچھا گیا، کوئی خدا سے کس طرح دھوکہ کر سکتا ہے؟ فرمایا: اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو فریضہ انجام دینے کا امر فرمایا ہے، اس کو انجام تو دے لیکن دل میں نیت غیر خدا کی کرے۔ اس کے بعد فرمایا: راہ تقویٰ اختیار کرو اور ریا سے پرہیز کرو کیونکہ ریا اللہ تعالیٰ سے شرک کرنے کے مترادف ہے اور بروز قیامت ریا کار کو چار ناموں سے پکارا جائے گا، اسے کافر، اے فاجر اے مکار، اے اپنے نقصان کرنے والے! تیرے اعمال غارت اور تیرا اجر ضائع ہوا۔

عن ابی عبدالله عليه السلام قال: الرجل يعمل شيئا من الثوات لا يطلب به وجه الله انما يطلب تزكية الناس يشتهى ان يسميع به الناس فهذا الذى اشرك بعبادة ربه[2]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: ایک آدمی ایک عبادت انجام دیتا ہے لیکن اس میں رضائے الٰہی کا مطلب کار نہیں ہوتا بلکہ چاہتا ہے کہ لوگ مجھے اچھائی اور نیکی سے یاد کریں۔ اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ لوگ اس کی عبادت کا حال سنیں سنائیں تو وہ آدمی اس طرز تفکر کے ساتھ اپنے رب کی عبادت میں شرک کرتا ہے۔

---

[1] سفینۃ البحار ج ا ''رای'' ص ۴۹۹

[2] سفینۃ البحار ج ا ''رای'' ص ۴۹۹

اخلاق کے اجراء کا ضامن

اچھے اور برے اخلاق ہوں یا روا و ناروا اعمال، علم الٰہی کا احاطہ ان میں بھی دینی قانون کے اجراء کا بہترین ضامن ہوتا ہے۔ جس کسی کا عقیدہ ہو کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے تمام اعمال سے آگاہ ہے، جو کوئی ہمیشہ خود کو ذات الٰہی کے حضور میں دیکھتا ہے اور جزاء و سزا پر یقین رکھتا ہے، وہ اپنے آپ کو گناہ سے آلودہ نہیں ہونے دیتا۔ اگر کبھی کسی گناہ کا مرتکب ہو بھی جائے تو فوراً متوجہ ہو کر توبہ کرتا ہے اور اپنے پروردگار کی درگاہ میں پشیمان ہو جاتا ہے، چنانچہ یہ توبہ و ندامت اور خو کو زیر نظر الٰہی سمجھنا انسانی معاشرے کے لئے پیغمبران الٰہی کی مقدس تعلیمات میں سے ایک ممتاز چیز ہے۔

اعمال پر ایمان کا اثر

عموماً انسانی معاشروں میں قوانین کے نفاذ و اجراء کے ضامن ان کے عدالتی نظام کے تعزیری قوانین ہوتے ہیں۔ لیکن الٰہی قوانین کے نفاذ و اجرا کا ضامن تعزیری قوانین کے علاوہ ایمان بخدا۔ ایمان بہ علم خدا اور روز جزاء میں ثواب و عقاب پر اعتقاد رکھنا بھی ہے۔

عام بشری معاشروں میں عموماً دیکھنے میں آتا ہے کہ لوگ اپنے قانونی فرائض کو انجام دینے سے گریز کرنے کے لئے ضرور راہ فرار ڈھونڈ لیتے ہیں۔ یا پھر قانونی خلاف ورزیوں کے مرتکب ہو کر ان جرائم کے چھوٹے سے چھوٹے نشانات کو بھی مٹا دیتے ہیں تا کہ سزا سے بچ سکیں۔ نیز عدالتی ادارے بھی واضح ثبوت مہیا نہ ہو سکنے کی بنا پر انہیں سزا نہیں دے سکتے، پھر اس طرح عملی طور پر قانون معطل ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور مجرمین دندناتے پھرا کرتے ہیں۔ لیکن الٰہی معاشرے میں لوگوں کا خدا اور اس کے وسیع علم پر ایمان ہوتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کو اپنے تمام اچھے یا برے اعمال پر حاکم مانتے ہیں۔ اس لئے وہ لوگ ہمیشہ اور ہر جگہ اپنے اعمال و کردار پر نگران رہتے ہیں، کیونکہ وہ یقین رکھتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ ہر چیز سے آگاہ اور اس کا عالم ہے "**یعلم مابین ایدیھم وما خلفھم**" ان کو یقین ہوتا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے حقائق کو مسخ نہیں کر سکتے، اپنے غلط اعمال اس سے چھپا نہیں سکتے اور پھر خود کو اس کے حساب اور سزا سے بھی نہیں بچا سکتے۔

خرج اعرابی باللیل فاذا بجاریة جمیلة فراودھا فقالت امالك زاجر من عقلك
اذالم یکن لك واعظ من دینك فقال واللہ ما یرانا الا الکواکب فقالت به یا
ھذا واین مکوکبھا؟ فاخجله کلامها فقال لھا انما کنت مازحا [1]

ایک شب کوئی عرب باہر نکلا تو (راستے میں) ایک حسینہ پر نگاہ پڑی اور وہ اسے ورغلانے لگا۔ اس خانون نے کہا: اگر

---

[1] المستطرف ج۲ ص۲۳۱

تیرے دل میں دین کی نصیحت کرنے والی باتیں نہیں تو کیا تیری عقل بھی تجھے اس بری حرکت سے نہیں روکتی؟ وہ مرد بولا قسم بخدا کہ اس وقت ہمیں اس آسمان کے ستاروں کے علاوہ اور کوئی نہیں دیکھ رہا۔ خاتون بولی: پھر ان ستاروں کا وہ خالق یعنی خداوند تعالیٰ کہاں ہے؟ یہ سن کر وہ مرد شرم سار ہوا کہنے لگا: میں نے تم سے ویسے ہی مذاق کیا تھا۔

پاکیزہ اور صاف کردار کی مالکہ اس مسلمان خاتون کی یہ گفتگو اس حقیقت کو روشن کر رہی ہے کہ ایمان بخدا اور اس کے علمی احاطہ پر اعتقاد رکھنا، الٰہی قانون کے اجراء کی کس طرح ضمانت دیتا ہے؟ اور کس طرح اپنے اندر یہ قدرت رکھتا ہے کہ ایک تاریک رات میں خلوت کے ماحول میں بھی ایک ایماندار فرد کو منافی عفت عمل رنے سے روک لے۔

اسلام کے مقدس دین میں کچھ ایسے قوانین اور ضابطے موجود ہیں کہ دور حاضر کے ترقی یافتہ ترین دور میں بھی پوری دنیا میں کسی جگہ ان کی نظیر موجود نہیں ہے۔ ایسے تمام اسلامی قوانین کی بنیاد لوگوں کے اللہ تعالیٰ اور اس کے علم پر ایمان لانے پر قائم ہے۔ بطور نمونہ دو مقامات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

سر بازی اور جان نثاری اقوام عالم کے اجتماعی مسائل میں سے ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ فوج کے وسیع وعریض محکمے اپنے سپاہیوں کو حاضر کرنے اور اپنے قوانین پر اچھی طرح عمل درآمد کرنے کے لئے تمام وسائل سے لیس ہیں۔ انہوں نے اپنے پیشہ ورانہ قوانین کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے انتہائی سنگین قوانین وضع کر رکھے ہیں۔ کیونکہ سپاہی کا کام جان نثاری اور سر بازی ہے اور اس لفظ کے معنی سے یہ بات واضح ہے کہ اپنی جان سے گزرنا اور سر قربان کرنا مشکل ترین کام ہے۔ پس اس قانون کا اجراء سخت اور سنگین ضابطوں کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔

اسلام اور سر بازی

یہی وجہ ہے کہ جو سپاہی بیماری یا دیگر اسباب کے تحت اپنے سر بازی کے فریضے سے معافی کے مستحق قرار پاتے ہیں ان کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ محکمے کے سامنے اپنی معذوریت کو ثابت کریں۔ جب تک وہ اس کا ثبوت نہ لائیں انہیں معافی اور رخصت کا پروانہ نہیں دیا جاتا۔ لیکن اسلام میں سر بازی اور سپاہیانہ کردار ایک عبادت ہے اور ایک سپاہی کو معافی کا پروانہ حاصل کرنے کے لئے محکمہ میں ثبوت مہیا کرنا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ اگر سپاہی یہ کہے کہ میں شرعی عذر رکھتا ہوں اور محاذ جنگ میں شرکت کرنے کے قابل نہیں رہا تو اس کے اس عذر کو قبول کر لیا جاتا ہے اور سالار اسے اس فریضے سے بری قرار دیتا ہے۔ لیکن اگر یہی قانون اس کیفیت کے ساتھ دنیا کے کسی بھی ملک میں نافذ کیا جائے تو ان کی حکومت میں فوج کی بنیاد ہی متزلزل ہو کر رہ جائے گی۔

مگر اسلام میں یہ قانون موجود ہے اور اس سے فوجی نظام پر ادنیٰ سا برا اثر بھی مرتب نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مسلمان سپاہی چونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے علمی محیط پر ایمان رکھتا ہے، اس لئے اسے یقین ہے کہ اگر اس نے جھوٹ بولتے ہوئے اپنے آپ کو معذور بتلایا تو درگاہ خداوندی میں ماخوذ ہوگا اور ذمہ دار ٹھہرے گا۔

ہر ملک کے اہم اجتماعی مشکلات میں سے ایک مشکل سرکاری محصولات کی وصولی ہے۔ لوگوں کو اپنی دولت سے محبت ہوتی ہے اور کوئی بھی اپنی دولت کو ہاتھ سے دینے پر بآسانی آمادہ نہیں ہوتا۔ اسی لئے حکومتیں واجبات کی وصولی کے لئے قانون بناتی اور بڑے بڑے ادارے قائم کرتی ہیں۔ چنانچہ جو بھی شخص واجبات کی ادائیگی سے گریز کرتا ہے، اسے خبردار کیا جاتا ہے اور اس کے اموال قرق کے لئے جاتے ہیں۔ پھر اصل واجبات کے ساتھ تاخیر سے ادا کرنے کا جرمانہ بھی وصول کیا جاتا ہے اور حکومت اس طرح کے دیگر ذرائع استعمال کر کے اپنی مانگ پوری کرتی ہے۔

اسلام اور زکوٰۃ

اسلام میں بھی اسلامی خزانے کی آمدنی سے زکوٰۃ ایک بڑا ذریعہ آمدنی اور جہاد کی طرح اسلامی عبادت ہے۔ ہر مسلمان زکوٰۃ کی ادائیگی کو اپنے روحانی اور ایمانی فرائض سے شمار کرتا اور عقیدہ رکھتا ہے کہ حکم خدا یہی ہے کہ وہ زکوۃ ادا کرے۔ چونکہ اسے یقین ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ میری حقیقی آمد اور میرے ذمہ عائد زکوۃ کی تفاصیل سے مکمل طور پر آگاہ اور سب کچھ جانتا ہے۔ اس لئے وہ ایک ایک پیسے تک کی ادائیگی کر دیتا ہے اور حقدار افراد کے حق میں سے کچھ بھی ضائع نہیں ہونے دیتا۔

امام علی علیہ السلام نے اپنے دور حکومت میں زکوۃ کی جمع آوری کے بارے میں ایک حکمنامہ جاری فرمایا تھا۔ اسمیں آپ نے عاملین زکوٰۃ کو لوگوں سے رابطے اور وصولی کے طریقہ کار کے بارے میں ہدایات جاری فرمائی ہیں۔ یہ حکمنامہ اس حقیقت کو روشن کرتا ہے کہ لوگوں کا ایمان بخدا قانون کو بخوبی نافذ کرنے اور انکے اندر وظیفہ شناسی کی حس کو زندہ کرنے میں کس قدر مئوثر ثابت ہوتا ہے۔

كان يكتبها لمن يستعمله على الصدقات، انطلق على تقوى الله وحده لاشريك له ولا تروعن مسلما ولا تجتازن عليه كارها ولا تاخذن منه اكثر من حق الله فى ما له فاذا قدمت على الحى فانزل بمائهم م غير ان تخالط ابياتهم ثم امض اليهكم بالسكينة والو قار حتى تقوم بينهم فتسلم عليهم ولا تخدج بالتحية لهم ثم تقول: عباد الله ارسلنى اليكم ولى الله وخليفته لاخذ منكم حق الله فى اموالكم فهل لله فى اموالكم من حق فتئودوه الى وليه فان قال قائل لا فلا تراجعه وان انعم لك منعم فانطلق معه من غير ان تخيفه او توعده او تعسفه اور ترهقه[1]

آپ صدقات (زکوٰۃ) کی وصولی کے لئے مقرر کردہ عامل کو لکھتے تقویٰ و پاکیزہ کے ساتھ اللہ وحدہ

---

[1] نہج البلاغہ مکتوب ۲۵

لاشریک سے ڈرے ہوئے اپنے محل ماموریت کو جاؤ! خیال رکھو کہ کسی مسلمان کو مت ڈرانا! اس کی مرضی کے بغیر اس کی زمین میں سے نہ گزرنا، اس کے مال میں سے حق خدا سے زیادہ نہ لینا، جب تم کسی آبادی میں وارد ہو تو ان کے کنویں یا تالاب کے پاس اترو ان کے گھروں میں مت جاؤ۔ اس کے بعد بڑے اطمینان و وقار اور پورے ادب کے ساتھ ان کے پاس جاؤ۔ جب لوگوں کے پاس پہنچو تو سب سے پہلے انہیں سلام کرو، پوری طرح تحیات و تسلیمات بجالاؤ اور اس میں سے کوئی کمی نہ کرو، اس کے بعد یوں کہو: بندگان خدا! مجھے اللہ کے ولی نے تمہارے ہاں بھیجا ہے، تا کہ تم سے خداوند تعالیٰ کا حق وصول کروں۔ پس اگر تمہارے اموال میں اللہ تعالیٰ کے حقوق ہیں تو انہیں ولی خدا کے حوالے کر دو۔ اب اگر کسی نے کہا میرے پاس خدا کا حق نہیں ہے، تو اسی طرف دوبارہ نہ جاؤ۔ اگر کسی نے اپنے ذمے حق خدا کا اقرار کیا تو اس کے پاس زکوٰۃ کی وصولی کے لیے جاؤ۔ لیکن توجہ رکھو کہ اس کو ہرگز نہ ڈرانا اور اس کے خوف و ہراس کا موجب نہ بنا اور سخت گیری نہ کرنا۔ نیز اس کو کسی زحمت میں نہ ڈالنا اور نہ ہی اس کے لیے کوئی دشواری پیدا کرنا۔

عاملوں کا فرض

اب آپ ملاحظہ فرمائیے کہ اسلام میں زکوٰۃ ادا کرنے والا مسلمان کس قدر قابل احترام ہوتا ہے۔ یعنی وہ حکومت اسلامی۔ ملت اسلامی اور زکوٰۃ وصول کرنے والے مامورین کے نزدیک کس قدر قابل عزت قرار پاتا ہے۔ جب ایک مسلمان شخص حکومت کے نمائندہ سے کہتا ہے کہ میرے ذمے زکوٰۃ نہیں ہے تو اس کی بات کو قبول کر لینا چاہیے۔ پھر سرکاری افسر کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس کے بیان کی تفتیش اور تحقیق کرنے لگے۔ اب اگر دورِ حاضر کے ترقی یافتہ ممالک میں سرکاری واجبات کی وصولی کیلئے اس قسم کے قوانین وضع کر دیے جائیں تو یقین ہے کہ مملکت کے خزانے میں ناقابل برداشت نقصان اور خسارہ ہو جائے گا۔ بہت سے محصول گزار افراد اس قانون سے سوء استفادہ کرنے لگیں گے اور مقررہ واجبات کی ادائیگی سے جان چھڑانے لگیں گے، لیکن اسلام میں اس قانون کے باوجود مسلمین و مومنین اپنے ذمہ کے تمام حقوق ادا کرتے رہتے ہیں اور چودہ صدیاں گزارنے کے باوجود آج کے مسلمان بھی اپنے ذمہ کے خدائی حقوق کو ادا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی وجہ فقط مسلمان کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری آمدنی سے مکمل طور پر آگاہ ہے اور اسے اس کی تمام تفاصیل کا علم ہے۔ اب اگر وہ جھوٹ بولتے ہوئے کہتا ہے کہ میرے ذمے تو کچھ بھی نہیں تو بظاہر وہ سرکاری مامورین سے خلاصی حاصل کر لے گا۔ لیکن آخر کل کو اسے خداوندی دربار میں حاضر ہونا ہے اور وہاں اسے اس ذمہ داری کے لیے ضرور ماخوذ اور مسئول ہونا پڑے گا۔

خلاصہ یہ کہ ایمان بخدا اور اللہ تعالیٰ کی علمی وسعت کا اعتقاد لوگوں کو وظیفہ شناس بناتا ہے اور یہ معنوی اور ایمانی سرمایہ تمام اسلامی قوانین کو عملی جامہ پہنانے اور اس کے عبادی۔ اخلاقی اور عملی قوانین پر اہل اسلام کے عمل درآمد کی ضمانت دیتا ہے۔

آٹھویں تقریر

علم بشر اور مشیت الٰہی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال اللہ العظیم فی کتابہ

وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ [1]

اور وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں سے کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتے مگر وہی جو وہ چاہتا ہے۔

آیت الکرسی کے اس جملے کے بارے میں ہم دو اعتبار سے گفتگو کریں گے۔

ایک تو خصوصی اعتبار سے اور وہ یہ کہ اس سے قبل کے دو جملوں کے ساتھ اس جملے کا کیا تعلق ہے۔ ان جملوں میں اذن شفاعت، شفعاء اور مشفوع لہم کی حقیقی کیفیت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے علم پر بحث کی گئی ہے۔

علم بشر کی حدود

دوسرا عمومی اعتبار ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کا علم جامع اور کامل ہے جب کہ اس جہان ہستی کے تمام حقائق کے بارے میں بشر کا علم کمتر اور محدود ہے اور ذات اقدس الٰہی کے ارادہ و مشیت کی حدود کے اندر محدود ہے۔

گفتگو کی پہلی جہت:

ہر مشفوع لہ (جس کی سفارش کی جائے) دنیوی سفارش کے لئے اپنے شفیع (سفارش کرنے والے) کی صلاحیت خود معین کرتا اور اپنی شفاعت کے لئے اسے خود منتخب کرتا ہے پھر اسے مشفوع عندہ (جس کے ہاں سفارش کرائی جائے) کی طرف روانہ کرتا ہے تاکہ وہ اس کی شفاعت کرے۔ (چونکہ دنیوی) سفارش کے نظام میں یہی طریقہ کارفرما ہے) اس لئے معنوی شفاعت کے بارے میں بھی مشرکین کی یہی سوچ تھی کہ یہاں بھی ہم اپنی مرضی کا شفیع منتخب کر سکتے ہیں۔ پس ہمیں ان بتوں وغیرہ کی عبادت کرنا چاہئے تا کہ ان سے یہ خواہش کر سکیں کہ وہ ہمارے لئے دربار الٰہی میں شفاعت کریں۔

---

[1] سورۂ بقرہ آیت ۲۵۵

اذن شفاعت علم خدا پر موقوف ہے

آیت الکرسی لوگوں کو سمجھا رہی ہے کہ تمام ارضی وسماوی مخلوقات (کہ سارے شفعاء اور مشفوع لہم بھی انہیں میں سے ہیں) اللہ تعالیٰ کی حقیقی ملکیت ہیں اور کوئی شفیع پروردگار عالم کی اجازت کے بغیر حق شفاعت نہیں رکھتا۔ اس کے بعد اس آیت نے اللہ تعالیٰ کی اجازت کو اللہ تعالیٰ کی علمی وسعت کے ساتھ مربوط کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس امر کو روشن فرمایا ہے کہ شفاعت کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی اجازت کسی حساب وکتاب کے بغیر اور بے ترتیب شکل میں نہیں، بلکہ اس ذات علیم کے علم کے ساتھ مربوط ہے۔ شفاعت کی اجازت دینے والا وہ اللہ ہے جو اس جہان کے تمام حقائق سے آگاہ ہے۔ وہی خدا شفاعت کی اجازت دیتا ہے جو ہر شفیع کی صلاحیت برائے شفاعت کو مکمل طور پر جانتا ہے۔ اس طرح وہ مشفوع لہ کے بارے میں پوری پوری اطلاع رکھتا ہے کہ وہ کس قدر شفاعت کا حق رکھتا ہے۔ مختصر یہ کہ امر شفاعت، مشفوع لہم کی صلاحیت ولیاقت کے تمام امور میں بنیادی معیار علم باری تعالی ہے۔ لیکن اس عاجز اور ناتواں مخلوق کے لئے ممکن نہیں کہ وہ اپنے قادر وتوانا خالق کے علم پر اطلاع حاصل کر سکے۔ اس لئے سوائے اس کے کوئی راستہ نہیں کہ وہ خدا اس کا ارادہ فرمائے اور اپنی مخلوق کو اپنے علم سے خود آگاہ فرمادے۔

ولا یحیطون بشیئی من علمہ الا بما شاء

ان ارضی وسماوی موجودات میں سے کوئی شئی اللہ تعالیٰ کی مشیت ارادے کے بغیر اس کے علم کے کسی حصے پر مطلع نہیں ہو سکتی۔

پس اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ہدایت کرنے اور انہیں گمراہی سے بچانے کے لئے ارادہ فرمایا کہ حقیقی اور غیر حقیقی شفعاء کے بارے میں اپنے علم کو ان پر ظاہر کرے اور انسان کو خرافات اور باطل عقائد سے نجات بخشے۔ چنانچہ اس نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف درج ذیل آیت نازل فرمائی تاکہ وہ لوگوں کو اطلاع دیں۔

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿٨٦﴾ [1]

تم اللہ تعالیٰ کے علاوہ جن کو پکارتے ہو وہ حق شفاعت نہیں رکھتے مگر فقط وہی جو حق وتوحید کی شہادت دیتے ہیں اور ان کی یہ شہادت علم وبصیرت کے ساتھ ہوتی ہے۔ یعنی (وہ اندھی تقلید کرتے ہوئے شہادت نہیں دیتے)۔

اسی طرح مشفوع لہم کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ ارادہ فرمایا کہ ان کے متعلق اپنے علم کو ظاہر فرمادے اور لوگوں کو اطلاع دے کہ مشرکین کے بارے میں باری تعالیٰ کا ازلی علم اور الٰہی فیصلہ یہ ہے کہ وہ الٰہی شفاعت سے کبھی بھی فیض یاب نہیں ہو سکیں گے۔ چنانچہ اس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ آیت نازل فرمائی۔

---

[1] سورۂ زخرف آیت ۸۶

يَعۡلَمُ مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ وَلَا يَشۡفَعُوۡنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارۡتَضٰى [1]

پروردگار عالم گزشتہ اور آئندہ کے (تمام شفعاء کو) جانتا ہے (کہ سب ہی مقرب درگاہ ایزدی اور شریف و بے عیب بندگان خدا ہیں)۔ یہ سب کی شفاعت نہیں کرتے مگر ان لوگوں کی کہ جن کا (دین) اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ ہوں۔

شفیع اور مشفوع کی صلاحیت

ان دو آیات سے بخوبی یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ شفاعت کا ہونا علم الٰہی میں ایک اہم اور نا قابل تردید حقیقت ہے۔ بشرطیکہ شفاعت کرنے والے اور جن کے حق میں شفاعت کی جارہی ہو، وہ سب صلاحیت اور لیاقت رکھنے والے ہوں۔

اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق شفیع بننے کی لیاقت اس میں ہوتی ہے جس نے حق تعالیٰ اور اس کی توحید کی شہادت علم وبصیرت کے تحت دی ہو۔ پس نتیجہ یہ ہوگا کہ انبیاء ملائکہ اور مردان خدا اس لیاقت کے مالک ہیں، وہی حق شفاعت رکھتے ہیں اور بقیہ سارے ارباب انواع۔ بت، لکڑیاں اور پتھر وغیرہ علم خداوندی کے لحاظ سے سے شفاعت کرنے کی لیاقت نہیں رکھتے، لہٰذا وہ کبھی اس منصب کے مالک نہیں ہو سکتے۔

جہاں تک مشفوع لہ کے قابل شفاعت ہونے کا تعلق ہے یہ علم الٰہی کے اندر وہی مشفوع لہ ہوسکتا ہے جو موحد اور باایمان ہو۔ لہٰذا جو غیر خدا کو خدائے تعالیٰ کا شریک درعبادت قرار دیتے ہیں، وہ جو بھی ہوں اور جیسے بھی ہوں، چونکہ وہ غیر خدا کی پرستش کرتے ہیں اس لئے ان کا دین اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ نہیں ہے۔ بنابریں اللہ تعالیٰ کے ہاں شفاعت کرنے کے اہل شفعاء کبھی ان لوگوں کی شفاعت نہیں کریں گے۔

گفتگو کی دوسری جہت:

اس بارے میں کہ ہر وہ امر جو علم میں آنے کے قابل ہے اور اس پر لفظ علم کا اطلاق ہوسکتا ہے، اللہ تعالیٰ کا عالم اور اس سے آگاہ ہے۔ پس اللہ تعالیٰ اس جہان کی حس شناخت، اس کے مال کی ساری تفصیلات، اس کی پوری مخلوقات اور ان کی ساری روئیداد سے مکمل طور پر باخبر ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کائنات کے مجموعی حالات اور زمین وآسمان کے اندر پائی جانے والی تمام اشیاء سے پوری طرح آگاہ ہے۔

اَلَا يَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ ؕ وَهُوَ اللَّطِيۡفُ الۡخَبِيۡرُ ﴿۱۴﴾ [2]

کیا وہ نہیں جانتا جس نے خلق فرمایا ہے؟ اور وہی لطیف وخبیر ہے (ان باریک ترین موجودات سے بھی باخبر ہے)

[1] سورۂ انبیاء آیت ۲۸

[2] سورۂ ملک آیت ۱۴

اللہ تعالیٰ ان کائنات کے گزشتہ وآئندہ۔کلیات وجزئیات۔اس مادے اور توانائی اور اس کے ظاہر اور باطن۔غرضیکہ اس عالم ہستی کے تمام دقائق وخصوصیات سے پوری طرح آگاہ ہے۔اس کے سارے حقائق اپنے مکمل اور واقعی مفہوم کے مطابق علم الٰہی کے سامنے ظاہر اور مشہود ہیں۔

انسان اور حقائق

محقق علماء کی نگاہ میں بشری طاقت کے مطابق اشیاء کے حقائق پر آگاہ ہونے کا نام علمت ہے۔ یاد رہے کہ اشیاء کی حقیقت کا علم رکھنا اور ان کے بارے میں اندازے لگانا اور گمان کرنا۔دو علیٰحدہ چیزیں ہیں اور دونوں میں بڑا فرق ہے۔اکثر ایسا ہوتا ہے کہ علماء ودانش مندان کسی شئے کی حقیقت کی شناخت کے بارے میں اپنے ذہن میں کچھ تصورات پروان چڑھاتے رہتے ہیں اور ان کو علمی محفلوں میں ایک نظریے کے طور پر پیش بھی کردیتے ہیں۔وہ اپنے خیال میں یہ سمجھے ہوتے ہیں کہ اس شئ کی حقیقت دریافت کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔حالانکہ نظریے (تھیوری) کی حیثیت ایک حدس اندازے اور رگمان سے بڑھ کر اور کچھ بھی نہیں اور حقیقت شئ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔مثلاً ماضی میں ان کا گمان یہ رہا کہ اس کائنات کا مرکز یہ کرہ زمین ہے اور اس جہان کی ساخت ایک پیاز کی طرح ہے۔اس کا ہر طبقہ اپنے سے بالاتر طبقے کے احاطے کے اندر ہے اور ہر طبقے کے محدب (اٹھی ہوئی) سطح اور اوپر والے طبقے کی گہری (اندرونی) سطح کے ساتھ مس ہوتی ہے۔ یہ گمان اور یہ تصور صدیوں تک ایک مقبول علمی نظریے کے طور پر علماء کے ہاں تسلیم ہوتا رہا۔وہ اسے ایک واقعیت سمجھتے رہے اور اس کے بارے میں بحث وگفتگو کرتے رہے بلکہ اس پر کتابیں بھی لکھی گئیں،لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ ایک توہم اور تخیل سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں تھا۔

ردشدہ مفروضے

عصر حاضر میں بھی ہر سال مختلف موضوعات میں کئی ایک مفروضے دنیا کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں جو بعد میں خلاف حقیقت ثابت ہوتے ہیں۔ان میں سے بعض تو بہت جلد علمی محافل میں رد کر دیے جاتے ہیں اور بعض کی تردید ہونے میں کچھ عرصہ لگ جاتا ہے،بہرحال اس قسم کا کوئی بھی مفروضہ علم صحیح نہیں کہلا سکتا۔

ہم نے اس سے پہلے خواب کے متعلق جو بحث کی ہے،اس میں آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ کل کے فلاسفہ اور آج کے سائنس دانوں نے خواب کی علت کے بارے کیا کیا باتیں کیں اور کیا کیا نظریات پیش کئے ہیں۔ان میں سے ہر ایک نظریہ کچھ وقت تک علماء کے ہاں قبول ہوا،وہ اس کے بارے میں بحث کرتے،کتابیں لکھتے اور طلباء کو اس کے مطابق درس دیتے رہے۔لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد اس کا بطلان واضح ہو گیا اور علماء کے ہاں اسے مطرود ومردود قرار دے دیا گیا۔

ہمارے جوانوں کو اس نکتے کی طرف توجہ رکھنی چاہئے کہ نظریے (تھیوری) اور علم میں بڑا فرق ہوتا ہے اگر اخبارات

ورسائل میں وہ کسی ایسے نظریے کو دیکھتے ہیں جو کسی محقق سائنس دان نے پیش کیا ہو اور وہ اسلام کی قطعی تعلیمات کے مخالف ہو تو اسے ایک علمی بات سمجھ کر فوراً قبول نہ کرلیا کریں اور اپنے دینی عقائد کے بارے میں دودلی اور شک کا شکار نہ ہو جائیں۔ بلکہ وہ تین باتیں رکھیں کہ کچھ مدت کے بعد اس نظریے کا بطلان ثابت ہو جائے گا اور اپنے دین میں شک رکھنے والا جوان خود بخود نادم اور شرمسار ہو جائے گا۔

کسی چیز کا علم اس کی حقیقت اور واقعیت کی واقفیت حاصل کرنے کا نام ہے یا اس چیز کے خاص قسم کے وجود کا ادراک کر لینے کا نام ہے۔ یا یوں کہہ لیں کہ کسی چیز کا علم اس کے بارے میں اس طرح کی آگاہی اور شناسائی حاصل کر لینے کا نام ہے جیسی کہ وہ چیز حقیقت میں ہے۔ جامع ترین الفاظ میں یوں کہئے کہ علم باری تعالیٰ میں ہر چیز کی ایک حقیقت وواقعیت موجود ہیں، پس اس شئ کا عالم وہ ہے جس کا علم اس شئ کے بارے میں پروردگار کے علم کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو۔

بشر اور ادراک حقائق

اللہ تعالیٰ کے حکیمانہ فیصلوں میں ایک عظیم فیصلہ یہ ہے کہ اس نے بشر کی فطرت میں ایک قابل قدر سرمایہ رکھا ہے جو اس کی ترقی اور بلندی میں بہت بڑا عامل ثابت ہوتا ہے، وہ انسان کے تجسس اور تلاش کی صلاحیت اور مخلوقات اور واقعات کی پیدائش کے علل واسباب کی شناخت کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ بشر طبیعی طور پر حقائق اشیاء کو درک کرنے سے عشق رکھتا ہے اور واقعات جہان کو سمجھنے کی کوشش میں مشغول رہتا ہے۔ اسی لئے جس شئ کو نہیں سمجھ پاتا اس کے آگے ''کیوں ہے'' اور ''کیا ہے'' کے استفہامیہ نشان لگاتا اور ان کے متعلق بڑی بے صبری کے ساتھ سوال کرتا ہے مثلاً وہ پوچھتا ہے۔ زمین میں زلزلہ کیوں آتا ہے؟ دریاؤں اور سمندروں میں طوفان کیوں آتے ہیں؟ آفتاب کو گرہن کیوں لگتا ہے؟ ہوا کبھی سرد اور کبھی گرم کیوں ہو جاتی ہے؟ وہ اسی طرح کے کئی اور سوال بھی کرتا ہے۔ مثلاً زندگی کیا ہے؟ فکر کیا اور حافظہ کیا ہے؟

چمکتی ہوئی بجلی ہر حیوان اور انسان ہر دو کی نظر پڑتی ہے، دونوں کے کان بادل کر گرج سنتے ہیں اور ابر سے برسات دونوں دیکھتے ہیں۔ لیکن وہ صرف انسان ہی ہے جو سوال کرتا ہے کہ بجلی کیوں چمکتی ہے؟ بادل کیوں گرجتا ہے؟ بارش کیوں برستی ہے؟ یا یوں پوچھتا ہے کہ بجلی کیا ہے؟ اس کی گرج کیا ہے؟

علت واقعہ کا علم حاصل کرنا

جب کوئی پھل درخت سے جدا ہو کر زمین پر گرتا ہے تو اس پر حیوان اور انسان دونوں کی نگاہ پڑتی ہے۔ لیکن تنہا انسان ہی ایسی مخلوق ہے جو یہ سوال سامنے لاتا ہے کہ یہ پھل کیوں گرتا ہے کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک سیب درخت سے جدا ہو کر گرا تو وہ نیوٹن کی ناک پر آ لگا اس واقعہ نے اس کی فکر کو حرکت دی اور وہ اس کے بارے میں سوچنے لگا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے زمین کی کشش ثقل کا

قانون دریافت کرلیا۔

سیب گرنے کی یہ داستان اس لحاظ سے بے فائدہ نہیں ہے، کیونکہ یہ نیوٹن ایسے بڑے سائنس دان کے ان پچیس سالہ افکار کو دوسروں تک پہنچانے اور سمجھانے کا موجب بنی کہ جو اس بڑے شخص نے اس قانون کو دریافت کرنے میں گزارے ہیں ہاں واقعاً اگر یہ سیب اس کی ناک پر نہ گرا ہوتا تو بھی ہم اس عظیم فکری قوت کو اپنی نگاہوں میں مجسم کر سکتے تھے جو اس نے اس اکتشاف کی راہ میں خرچ کی ہے۔ اس نے خود سے یہ سوال کیا کہ واقعاً اگر یہ درخت اپنی موجود بلندی سے سو یا ہزار گنا زیادہ بلند ہوتا تو کیا پھر بھی یہ سیب گرتا؟ کیا وہ پراسرار طاقت جو اجسام کے زمین کی طرف گرنے کا موجب بنتی ہے، یہ ایک سو یا ایک ہزار یا ایک لاکھ کیلومیٹر کی بلندی پر بھی اسی طرح موثر رہتی ہے یا نہیں؟ اگر مؤثر نہیں رہتی تو اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ [۱]

بشر کا محدود علم

علم ان صحیح جوابات کا نام ہے جو ''کیوں ہے'' اور ''کیا ہے'' والے سوالات پر دیئے جاتے ہیں۔ انسان کی علمی اور ثقافتی ترقی معیار بھی اس بات پر قائم ہوتا ہے کہ وہ اس قسم کے سوالات کے جوابات میں جس قدر صحیح حقائق پیش کرنے پر قادر ہو گیا ہے اور ان جوابات کے ضمن میں کس قدر صحیح اور مفصل معلومات رکھتا ہے۔ لیکن اس کائنات کی کتاب تکوینی میں اس قدر حیرت انگیز حقائق و اسرار پوشیدہ ہیں کہ دور حاضر کے انسان کی خیرہ کن ترقی اور عظیم علمی پیش رفت کے باوجود بھی اس کے معلومات اس کے سوالات کی نسبت بہت کم اور مجہول حقائق کے مقابل معلوم حقائق بالکل ناچیز دکھائی دیتے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ اگر آفتاب کے نور کے ذریعے ایک مخصوص رنگ ظاہر ہو تو ایک معین مقدار کی لمبی موج پیدا کرتا ہے۔ مثلاً ہم اس کو سرخ رنگ کا نام دیتے ہیں اور اسی طرح باقی سارے رنگ بھی سورج کی کرنوں کے سامنے اپنی خاص ترتیب کے مطابق واقع ہوتے ہیں۔ تب ہر ایک معین مقدار کی لمبی موج پیدا کرتا ہے کہ جس سے ہر ایک مربع سینٹی میٹر کے اندر امواج کی ایک مقررہ تعداد کے مطابق ایک مخصوص رنگ پیدا ہوتا ہے۔ ہم ہر ایک کو ایک علیحدہ نام دیتے ہیں مثلاً سبز وغیرہ اور یوں جو تغیر و تبدل ہر آن ہمارے سامنے انجام پذیر ہوتا وہ بہت ہی پراسرار ہے۔ ہم تا حال اس سربستہ راز سے کچھ زیادہ مطلع نہیں ہیں اور یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ہم اس معاملے کہ کنہ اور حقیقت پر آگاہ ہو چکے ہیں۔ ہم اس داستان کو جس قدر زیادہ وسعت دیتے چلیں گے اسی قدر آڈیسن کے ساتھ ہم فکر ہوتے جائیں گے کہ جس کا کہنا ہے: ہم قابل حصول معلومات کے مجموعے کے ایک فی صد میں سے ایک فی ملین کو جانتے ہیں۔ آج سے دو سال قبل نیوٹن۔ پورے علم کو ایک صحرا سے تشبیہ دیتا اور کہتا تھا کہ میں اور میرے سارے رفقاء اس وسیع و عریض صحرائے علم کے ریگزار میں سے فقط ریت کے چند ایک ذروں کے برابر علم رکھتے ہیں۔ [۲]

---

[۱] تارخ علوم ص ۲۶۳

[۲] نجوم برای ہمہ ص ۲۶۳

قال علی علیه السلام: وما الذی نری من خلقك ونعجب له من قدرتك ونصفه من عظیم سلطانك وما تغیب عنا منه وقصرت ابصر ناعنه وانتهت عقولنا دونه وحالت ستور الغیوب بیننا وبینه اعظم فمن فرغ قلبه واعمل فکره لیعلم کیف اقمت عرشك و کیف ذرات خلقك و کیف علقت کف الھواء سماواتك و کیف مددت علی مور الماء ارضك رجع طرفه حسیراً وعقله مبھوراً وسمعه الھاً وفکره حائر [1]

مجہول حقائق

امام علی علیہ السلام نے فرمایا: پروردگارا! کس قدر عجیب ہے تیری یہ مخلوق جو ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان میں تیری قدرت کا نظارہ کرتے ہوئے ہم متعجب ہو جاتے ہیں۔ ہم انہیں تیری سلطنت اور فرمانروائی کا نشان سمجھتے ہوئے اس کی توصیف کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ بہت سی مخلوق ایسی ہے جو ہم سے پوشیدہ ہے، ہماری آنکھیں انہیں دیکھ نہیں سکتیں اور ہماری عقلیں ان کے ادراک سے عاجز ہیں، ہمارے اور ان کے درمیان غیبی پردے حائل ہو چکے ہیں۔ وہ شخص تو بہت زیادہ عظیم اور بزرگ ہے کہ اپنے دل کو دیگر توجہات سے الگ رکھے، اپنی فکر کو کام میں لائے (اور مطالعہ وتحقیق کا راستہ اپنائے) تاکہ یہ معلوم کر سکے کہ تو نے اپنے عرش کس طرح برقرار فرمایا؟ اپنی مخلوق کو کیونکر خلق فرمایا؟ اور اپنے ان آسمانوں کو کس طرح اس ہوا میں معلق کر رکھا ہے؟ اس زمین کو پانی کی لہروں پر کس طرح بچھا رکھا ہے؟ تو اس شخص کی نگاہیں (بڑی زحمت کرنے کے باوجود) تھکی ہوئی واپس آئیں گی۔ اس کی عقل حیران ہوگی؟ کان ناکارہ ہو چکے ہوں گے اور فکر پریشان ہوگی (یعنی اپنے اس علمی سفر اور تحقیقی سیر سے عاجز آ کر پریشان حالت میں واپس پلٹے گا)۔

ایک عجیب نکتہ یہ ہے کہ ایک طرف انسان کی معلومات جس قدر زیادہ ہوتی جاتی ہیں اور اس کی اطلاعات میں جس قدر وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے، دوسری جہات میں اس کی مجہولات میں اتنا ہی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ آج کی دنیا میں بے جواب سوالات۔ ناشناختہ حقائق اور مختلف موضوعات میں مجہول پہلوؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور دور حاضر کا ترقی یافتہ انسان ان حقیقتوں کا ادراک کرنے سے تاحال عاجز اور ناتواں ہے۔

ماہیت فکر

ماہیت فکر کیا ہے؟ یعنی ایک ایسا عجیب عنصر جو انتہائی معمولی توانائی خرچ کرنے سے اس قدر زیادہ فعالیت انجام دیتا ہے۔ اس کی حقیقت کیا ہے؟ دیگر طبیعی توانائیوں سے اس کے کیسے روابط ہیں؟ اس زندہ مادے میں پائی جانے والی روح ایک نامرئی

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۵۹

(نادیدہ) چیز ہے، تاہم یہ ہماری دنیا کی سب سے فعال قوت ہے اوراس نے اپنی کاوشوں سے سطح زمین کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ یہی مختلف تمدن قائم کرتی ہے اور پھر انہیں سرنگوں کر دیتی ہے، اس نے ہمیں ستاروں کے جہان کی شناسائی کرائی ہے۔

جس طرح لوز المعدہ سے (معدہ میں بادام کی شکل والے لوتھڑے) سے انسولین اور جگر سے صفرا نکلتا ہے۔ کیا اسی طرح فکر بھی مغز سے ٹپکتی ہے؟ یا یہ توانائی کی ایک علیحدہ قسم ہے جو دیگر طبیعی توانائیوں سے جداگانہ حقیقت کی حامل ہے اور مغز کی سطح کے حصے میں پائے جانے والے سیلز (خلیوں) کے ذریعے پیدا ہوتی ہے؟ یا اس کے برعکس یہ ایک غیر مادی وجود ہے جو زمان و مکانی حدود سے باہر اوراس عظیم جہان کے تمام اطراف سے آگے کہیں دور سے آئی اور کسی نامعلوم طریقے سے مغز کے اندر پہنچنے میں کامیاب ہوگئی ہے۔

ہر زمانے اور ہر ملک میں بڑے بڑے فلاسفران مسائل کوحل کرنے میں اپنی عمریں صرف کرتے رہے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی اس راز کو بے نقاب کرنے میں کامیاب نہیں ہوا۔[1]

انسان کو فطری طور پر کمال حاصل کرنے کا عشق دیکر خلق فرمایا گیا ہے اور وہ حقائق کے ادراک کا والہانہ جذبہ رکھتا ہے۔ اسے یہ شوق لگا رہتا ہے کہ وہ سب چیزوں کا علم اور ہر چیز کی واقعیت کو جانتا ہو۔ یعنی جس طرح کوئی شئ حقیقت میں ہے وہ اسی طرح جانتا سمجھتا ہو۔ لیکن اس کا یہ شوق عملی طور پر کبھی بھی کامیاب نہیں ہوسکتا، کیونکہ انسان ان تمام اشیاء کے حقائق کی واقعیت تک پہنچنے پر قادر نہیں ہے۔ جب کوئی تمام حقائق کا علم رکھنا بالفاظ دیگر خدائے تعالیٰ کے علم کو اپنے احاطے میں لے لینے اوراس کی ساری معلومات سے آگاہی حاصل کر لینے کے مترادف ہے اور یہ ناممکن ہے کہ ایک محدود مخلوق اپنے محدود علم کے ساتھ خالق کے علم کا احاطہ کر سکے۔ (چہ نسبت خاک را با عالم پاک) ان حقائی کے بارے میں انسان کا علم نہایت معمولی ہے اور فقط اس حد تک ہے کہ جہاں تک اللہ تعالیٰ چاہتا ہے اوراس کی مشیت کا تقاضہ ہوتا ہے۔

ولا یحیطون بشیئی من علمه الا بما شاء

چونکہ یہ معلوم نہیں کہ ایک انسان کے علم کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی مشیت کیا ہے؟ اس لئے ہمیں پتہ نہیں چل سکتا کہ انسان فہم حقائق میں کس قدر ترقی کرنے پر قدرت رکھتا ہے اور واقعات کا ادراک کرنے میں کس حد تک آگے بڑھ سکتا ہے؟۔

بشری توانائیاں

ہاں یہ مسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بشر کو ایک بہترین اور عالی ترین جسمانی عنائیت فرما کر پیدا کیا اوراسے عقل۔ ہوش۔ حافظہ جیسی توانائیوں کے ساتھ مسلح فرمایا ہے۔ تاکہ وہ اپنی عقل کے ساتھ اس کتاب کائنات کا مطالعہ کرے، اپنے ہوش کے ساتھ نظام آفرینش کے اسرار ورموز کی تحقیق کرے اورانہیں باہمی ارتباط دینے کی کوشش کرے۔ اس طرح اپنی تحقیقات ومطالعات کے نتائج کو

---

[1] انسان ناشناختہ ص ۱۱۴

حافظے کے خزانے میں محفوظ کرے اور پھر بوقت ضرورت ان سے استفادہ کرے۔

اللہ تعالیٰ نے زبان اور قلم کی دو طاقتیں بشر کی دسترس میں قرار دی ہیں تا کہ علماء تقریر اور تحریر کے ذریعے اپنے علوم دوسروں کو منتقل کریں اور آنے والی نسلیں اپنے اسلاف کی معلومات و تحقیقات سے بہرہ مند ہوں۔ درحقیقت زبان اور قلم دو ایسے پل ہیں جو نسل سابق کے علوم و عقول کو نسل لاحق کے ساتھ مربوط کرنے کا کام دیتے ہیں اور انسانوں کی وہ معلومات جو ان کی زندگی کا سرمایا ہیں، انہیں ہر قسم کی نابودی کے خطرے سے محفوظ کر لیتی ہیں۔

قال علی علیه السلام: للانسان فضیلتان عقل ومنطق فبالعقل یستفید وبالمنطق یفید[1]

عقل و زبان

امام علی علیہ السلام نے فرمایا: انسان کے لئے دو فضیلتیں ثابت ہیں عقل اور زبان۔ وہ عقل کے ذریعے علمی استفادہ اور حقائق کا ادراک کرتا ہے اور پھر زبان کے ذریعے اپنی معلومات کو دوسروں تک پہنچاتا اور انہیں بہرہ مند کرتا ہے۔

علمی میدان کی عظیم ترقی اور صنعتی میدان کا خیرہ کر دینے والا انقلاب جو آج کے انسان کو نصیب ہوا، اس نے اس جہان کی کیفیت کو بالکل بدل کر رکھ دیا ہے۔ یہ سب فقط اسی صدی کے محققین کی علمی تحقیقات اور تجرباتی کاوشوں کا نتیجہ نہیں، بلکہ اس میں افلاطون۔ ارسطو۔ سقراط۔ بقراط۔ بوعلی سینا اور خواجہ نصیر الدین طوسی جیسے ان عظیم افراد کی تحقیقات و مطالعات کا بھی بہت زیادہ حصہ ہے جو گزشتہ ادوار میں اس قسم کی علمی تحقیقات پر محنت کرتے رہے اور آج کے تمدن کی ابتداء کر گئے ہیں۔ مختصر یہ کہ آج کا انسان کل کے انسانوں کی علمی کاوشوں کے ساتھ سوچتا ہے اور علمی کتاب کے ذریعہ منتقل ہونے والے معلومات سے اس کائنات اور صاحب فکر اذہان کے درمیان جو رابطہ پیدا ہوا ہے، وہی اس دور کے عظیم انقلاب اور بلند ترین ترقی کا موجب بنا ہے۔

انسان کا مخصوص سرمایہ

نیز شعبہ طبیعات میں انسان کو جو کامیابیاں آج تک حاصل ہو چکی ہیں یا مستقبل میں حاصل ہوں گی، یہ سب خداوند تعالیٰ کی منشاء اور مشیت الٰہی کی مرہون منت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت کے مطابق استعدادوں کا عظیم سرمایہ انسان کو عطا فرمایا اور دیگر حیوانات کو نہیں دیا۔ یعنی خداوند تعالیٰ نے اپنی مشیت کے مطابق بشر کو حقائق کا ادراک کرنے کی طاقت سے نوازا اور اس کو عاقل۔ باہوش اور محقق بنا کر خلق فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت کے ساتھ انسان کو حافظہ، تقریر اور تحریر کی طاقتیں عنایت فرمائی ہیں۔ پھر اس کرۂ ارض اور اس کے دائرے میں موجود تمام اشیاء کو انسان کے لئے مسخر کر دیا، یہ سب کچھ اسی کے لئے پیدا فرمایا اور اسے اجازت

---

[1] غرر الحکم ص ۵۸۳

دی ہے کہ وہ اس سے فائدہ اٹھائے۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا [۱]

(اللہ تعالیٰ) ہی وہ ذات ہے جس نے تمہارے لئے وہ سب کچھ خلق فرمایا جو زمین میں ہے۔

بشر کے علم کے بارے میں مشیت الٰہی بشر کی اس صلاحیت اور قابلیت کی مقدار کے ساتھ مربوط ہے۔ چونکہ بشر کی عقل و ہوش، بصارت وسماعت اور اس کی تمام ظاہری و باطنی قوتیں محدود ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ بشر کے ادراک حقائق کا دائرہ بھی محدود ہو۔

آواز کی لہریں

فضا میں انتہائی لطیف قسم کی امواج پائی جاتی ہیں کہ جنہیں آواز کا نام دیا گیا ہے۔ یہ آواز کسی حامد کی شکل میں موجود نہیں اور نہ ہی وزن رکھتی ہے، بلکہ امواج کی فقط حرکت ہی آواز (صوت) کہلاتی ہے۔ جوں ہی ہوا کے اندر کوئی خلل وجود میں آتا ہے مثلاً اشیاء کا باہمی ٹکراؤ پیدا ہوتو اس سے فضا کے اندر صوتی امواج پھیل جاتی ہے۔ یہی امواج اگر ہم میں سے کسی تک آن پہنچیں اور کان کے پردہ کو لرزانے میں کامیاب ہو جائیں تو ہمارے کان کے اندر ایک احساس پیدا ہوتا ہے۔ کان کے اسی احساس کا نام آواز (صدا'' ہے۔ البتہ ہمارے کان کے پردے کی حساسیت ایک معین حد رکھتی ہے، اگر امواج اس حد تک بالاتر ہو کر گزر چکی ہوں تو ہمارے کان ان کو سننے کی طاقت نہیں رکھتے۔ [۲]

انسانی کان کے اس ردعمل کے پیش نظر اصوات کو چند طبقات پر تقسیم کیا گیا اور سننے کے لئے دو بنیادی خصوصیات ضروری قرار دی گئی ہیں: ارتفاع اور شدت (بلندی اور سختی) آواز کے ارتفاع کا علم اس کے تواتر کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ آواز جس قدر (زیر) نیچے ہوتی ہے اس کا تواتر زیادہ ہوتا ہے اور جس قدر اس کا تواتر کم ہوتا ہے اسی قدر وہ آواز (بم) بلندتر ہوتی ہے۔ آواز کی اس خاصیت کو زیر مطالعہ لانے کے لئے متعدد قسم کے تجربات انجام دئے گئے ہیں تاکہ سننے کے شرائط کی تعیین کی جا سکے۔

ماوراء صوت

انسان کا کان ایسی آواز کا ادراک کرنے پر قادر ہے جس کا تواتر سولہ (۱۶) درجے فی ثانیہ سے زیادہ ہو۔ بلندی کے لحاظ سے اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ اس وقت سنائی دیتی ہے جب تک وہ سولہ ہزار درجے فی ثانیہ کی اوسط حد کے اندر رہو۔ انسانی کان ایسی لہروں کو سننے پر قادر نہیں ہے جن کا تواتر سولہ (۱۶) درجے فی ثانیہ سے کم تر ہو، ان لہروں کو مادون صوت (آواز سے پائین تر)

---

[۱] سورۂ بقرہ آیت ۲۹

[۲] نجوم برای ہمہ ص ۸۹

کا نام دیا گیا ہے۔انسانی کان سولہ ہزار درجے فی ثانیہ تک کی لہروں کو سن سکتا ہے،جن آوازوں کا تواتر سولہ ہزار سے زیادہ ہوانہیں ماوراءصوت (آواز سے بالاتر) کا نام دیا گیا ہے۔[۱]

آج کے سائنس دانوں نے اپنی تجربہ گاہوں میں انتہائی پیچیدہ آلات کے ذریعے بڑی مہارت سے یہ معلوم کرلیا ہے کہ سرخ اور بنفشی رنگ کے درمیان فرق کا باعث روشنی کی میکروسکوپی امواج کی وہ تعداد ہے جو ہر ثانیہ میں ہماری آنکھ میں وارد ہوتی ہے۔ روشنی کی یہ لہریں باہم اتنی نزدیک ہوں کہ ان میں سے سات سو چھپن کروڑ فی ثانیہ ہماری آنکھ میں وارد ہوسکیں تو وہ ہمارے اندر یہ احساس پیدا کرتی ہیں جس کو بنفشی رنگ کہا جاتا ہے۔یہ لہریں اس قدر چھوٹی چھوٹی ہوتی ہیں کہ میکروسکوپ کے ذریعے بھی دکھائی نہیں دیتیں۔اگر ہم ان لہروں کو دیکھنے پر قادر نہیں ہوجاتے اور انہیں جسم مان سکتے تو فضا میں اڑھائی سینٹی میٹر مربع کے اندر بنفشی رنگ کی باسٹھ ہزار روشن لہریں سما سکتی تھیں۔لیکن واضح ہے کہ ہمارے لئے ان امواج میں سے ایک کو دیکھنا بھی ممکن نہیں ہے۔

رنگ کی لہروں کی تعداد

وہ لوگ اپنی تجربہ گاہوں میں روشنی دار امواج کی فی سینٹی میٹر تعداد کو شمار کرنے پر بھی قادر ہوگئے ہیں، چنانچہ وہ نورانی لہریں جو ہمارے اندر اس احساس کو جنم دیتی ہیں کہ جس کا نام آبی رنگ رکھا گیا ہے۔اس کے لئے ضروری ہے کہ فضا میں اڑھائی سینٹی میٹر کے اندر اس کی پچپن ہزار لہریں موجود ہوں، سبز رنگ کے لئے اڑتالیس ہزار لہریں، زرد رنگ کے لئے چوالیس ہزار لہریں، اور سرخ رنگ کے لئے ہر اڑھائی سینٹی میٹر کے اندر اڑتیس ہزار لہریں موجود ہونا چاہئیں۔نیز گہرے سرخ رنگ کیلئے تینتیس ہزار لہریں ہونا چاہئیں اور جو سرخ سے بھی کم تر ہوتا ہے تو وہ ہمیں دکھائی نہیں دے سکتا۔

باالفاظ دیگر اگر کوئی روشنی اڑھائی سنٹی میٹر میں تینتیس ہزار لہروں سے کم مقدار پر مشتمل ہو تو ہمارے اعصاب اس کا ادراک کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔مثلاً الکحل کے شعلے کی روشنی اپنے بعض خاص حالات میں تقریباً نا قابل رویئت ہوتی ہیں۔

دوسری طرف اگر نورانی لہروں کی تعداد ایک معین حد سے بالاتر ہو تو ہماری آنکھ اسے دیکھنے پر بھی قادر نہیں ہے۔اس لحاظ سے یہ امواج بھی آواز کی مانند ہوجاتی ہیں۔جیسا کہ بہت سے حشرات الارض کی آوازیں کہ جو بہت زیادہ زیر ہوتی ہیں، اس لئے سماعت میں نہیں آتیں اسی طرح بہت سی نورانی لہریں بھی ہیں جو اڑھائی سنٹی میٹر میں چھیاسٹھ ہزار سے زیادہ ہوجاتی ہیں اور وہ ہماری نگاہ میں آنے والی نہیں ہوتیں، ایسی امواج کی ماوراء بنفشی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔[۲]

---

[۱] چہ میدانم؟ ماوراءصوت ص ۱۹

[۲] نجوم برای ہمہ ۹۳

انسان کی محدود بصارت وسماعت

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ انسان کی بصارت وسماعت کی طاقتیں خداوند تعالیٰ کی مشیت وارادہ کے مطابق محدود رکھی گئی ہے۔ وہ ذات باری تعالیٰ ہے کہ جس کی بینائی وشنوائی کی قدرت اس محدود مادے سے قائم نہیں اور (لامحدود ہے) وہ ہر چیز کو دیکھتا ہے اور ہر مسموع کو سنتا ہے۔

قال علی علیہ السلام: وکل سمیع غیرہ یصم عن لطیف الاصوات ویصمہ کبیرھا ویذھب عنہ ما بعد منھا وکل بصیر غیرہ یعمی عن خفی الالوان و لطیف الاجسام [1]

امام علی علیہ السلام نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے علاوہ ہر سننے والا لطیف آوازوں کے سننے سے عاجز ہے اور شدید آوازیں اس کو بہرا اور ناشنوا بنا دیتی ہیں، وہ دور کی آوازوں کو بھی سن پاتا اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ ہر بینا فرد مخفی رنگوں اور لطیف اجسام کو دیکھنے سے عاجز ہوتا ہے۔

یہ بس خداوند تعالیٰ کی ذات ہے جو ہر چیز اور ہر شخص سے باخبر اور اس سے آگاہ ہے۔ وہ اس جہان ہستی کے تمام غیوبات و مشہودات، ماضی وحال، اور تمام موجودات سے پوری طرح مطلع وآگاہ ہے کہ کوئی بھی چیز اس کی ذات اقدس سے پوشیدہ نہیں ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَخۡفٰی عَلَیۡہِ شَیۡءٌ فِی الۡاَرۡضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ ؕ﴿۵﴾ [2]

بے شک اللہ تعالیٰ ہی وہ ہے جس سے زمین وآسمان کی کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔

انسانوں کی تمام ظاہری اور باطنی قوتیں محدود ومتناہی ہیں، اسے مشیت الٰہی نے جس قدر اجازت عطا کی ہے، اسی قدر وہ ان موجودات کائنات کو اپنے علم کے دائرے میں لیتا اور اس جہان کے مخفی اسرار پر مطلع ہوسکتا ہے۔ انسان کو یہ قدرت ہرگز نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے غیر محدود علم سے واقف ہو سکے اور باری تعالیٰ کے سارے معلومات پر آگاہی حاصل کر سکے۔

ولا یحیطون بشیئی من علمہ الا بما شاء

انسان اپنے علوم کے گوناگوں شعبہ جات میں جس قدر ترقی وتکامل اور بلندی وپیش رفت حاصل کر لے، وہ اس امر پر کبھی قادر نہ ہو سکے گا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی حقیقت کو درک کر لے کہ یہ علم تو فقط اس کی ذات اقدس سے مختص ہے۔

علم بشر کی نارسائی

بشر کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ مستقبل میں اس جہان کی کسی مخلوق یا خود انسان کے بارے میں مزید پر عظمت کامیابیاں

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۶۴

[2] سورۂ آل عمران آیت ۵

حاصل کرے اور قابل غور اور دلچسپ قسم کے نظریات سامنے لائے۔لیکن جہاں تک ان دو حقیقتوں کی گہرائی اور ان کے کم و کیف تک پہنچنے کا تعلق ہے جو علم الٰہی میں موجود ہے، انسان ہرگز ہرگز اس حد تک پہنچنے پر قادر نہیں ہے۔

مَآ اَشۡهَدۡتُّهُمۡ خَلۡقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَلَا خَلۡقَ اَنۡفُسِهِمۡ [1]

میں نے ان کو آسمانوں اور زمین کی خلقت پر شاہد نہیں بنایا اور نہ انہیں ان کے اپنے نفوس کی خلقت پر آگاہی بخشی ہے۔

انسان کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ آئندہ زمانے میں انسانی روح کی شناخت میں کوئی بہت بڑی کامیابی حاصل کرے، لیکن اس کے باوجود بھی اس موضوع میں اس کی تمام اطلاعات محدود رہیں گی اور روح کی حقیقت علم الٰہی میں جس حد تک موجود ہے، وہ کبھی بھی انسانی دسترس میں نہ آ سکے گی۔

وَيَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الرُّوۡحِ ؕ قُلِ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّىۡ وَمَاۤ اُوۡتِيۡتُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا قَلِيۡلًا ۝٨٥ [2]

اور وہ لوگ آپ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہہ دو کہ روح میرے رب کے امر سے ہے اور تمہیں علم نہیں عطا کیا گیا مگر کم۔

خلاصہ یہ کہ راہ علم و دانش میں بشر کی پیش رفت اور حقائق و واقعات پر اطلاع حاصل کرنے میں انسان کی کامیابی اس حد تک آگے بڑھ سکتی ہے۔ جو باری تعالیٰ کی مشیت میں مقرر ہے اور جتنی اللہ تعالیٰ نے اجازت دے رکھی ہے۔مشیت کی حدود سے باہر کی کوئی بھی حقیقت انسانی دسترس میں نہیں آسکتی وہ نہ کبھی اس کی قدر میں آئی ہے اور نہ آئے گی۔

ولا یحیطون بشیئی من علمه الا بما شاء

علم غیب اور انبیاء وائمہ

اب مناسب دکھائی دیتا ہے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انبیاء اور دائمہ طاہرین علیہم السلام کے علم غیب کے موضوع پر کچھ گفتگو ہو جائے۔ یہ علم غیب اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کی اجازت کے تحت ہے اور یہ چیز قرآن مجید کی آیات اور اہل بیت علیہم السلام کی روایات میں وارد ہوئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا اذن دو قسم کا ہے: اذن عمومی او اذن خصوصی، اس نظام کائنات میں اللہ تعالیٰ کا اذن عمومی تو وہی قوانین و سنن ہیں جو قطعی و حتمی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکیمانہ قضاء کے مطابق اس جہان میں قوانین کا اجراء فرمایا ہے۔یعنی ایک نوع کے تمام افراد اپنی نوع کے بارے میں مقرر کردہ ضوابط قوانین میں مساوی حیثیت رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق اپنے سفر حیات پر رواں

---

[1] سورۂ کہف آیت ۵۱

[2] سورۂ بنی اسرائیل آیت ۸۵

دواں رہتے ہیں۔

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ [1]

اور پاکیزہ میں زمین باذن الٰہی (اپنے اندر بیج پروان چڑھاتی ہے) اوراس کا پوداا س سے باہر نکل آتا ہے۔

پس پاکیزہ زمین کے ساتھ اذن الٰہی بھی ملا ہوا ہے، اذن الٰہی سے مراد وہی طبیعی شرائط اور ضروری مواد ہیں جو اللہ تعالیٰ نے حکیمانہ فرمان کے ساتھ زرخیز زمینوں میں مقرر فرمائے اور انہیں گھاس اور پودوں کے لائق قرار دے دیا ہے۔

اذن خصوصی سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ اجازت ہے جو اس نے کسی معین اور خاص موجود کو اس کا اہل سمجھتے ہوئے عنایت فرمائی ہے۔ پس یہ ایک خصوصی عطیہ ہوتا ہے کہ جو اس نوع کے دیگر افراد میں عادی طور موجود نہیں ہوتا۔

وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِي فَتَنْفُخُ فِيهَا فَتَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِي وَتُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ بِإِذْنِي ۖ وَإِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ [2]

اور جب تو مٹی سے پرندے کی شکل بناتا ہے میرے اذن کے ساتھ۔ پھر تو اس میں پھونک مارتا ہے تو وہ اڑنے لگتا ہے میرے اذن کے ساتھ۔ اور تو کوڑھی اور مبروص کو شفا دیتا ہے میرے اذن کے ساتھ اور تو مردوں کو (قبروں سے) باہر نکالتا ہے میرے اذن کے ساتھ

جو اذن اللہ تعالیٰ نے پرندہ بنانے، بیماروں کو شفا دینے اور مردوں کو زندہ کرنے کے بارے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیا تھا۔ وہ ایک خصوصی فیض اور انفرادی اجازت تھی کہ نوع بشر کے دیگر افراد عادی طور پر اس فیضاب نہیں ہیں،

مشیت عمومی و مشیت خصوصی

جس طرح اذن خدا کی دو قسمیں ہیں اور اسی طرح کسی امر سے متعلق مشیت الٰہی کی بھی دو قسمیں ہیں، (۱) مشیت عمومی (۲) مشیت خصوصی ۔

علم طب کے بارے میں مشیت عمومی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمی کو طب کی معرفت حاصل کرنے کی قابلیت اور استعداد عطا فرما دی ہے اور اس کا ارادہ یہ ہے کہ جو شخص بھی اس علم کو حاصل کرنے کے لئے اس راستے میں اپنی استعداد کو استعمال میں لائے اور محنت کرے تو اسے اس کی استعداد کے مطابق یہ علم حاصل ہو جائے اور وہ طبیعی دوائیوں اور عادی وسائل کے ساتھ مریضوں کا علاج کر سکے۔

اس بارے میں مشیت خصوصی یہ ہے کہ کسی خاص فرد کو ایک ناشناختہ معنوی طاقت عنایت فرمائے اور وہ شخص علمی اور طبی

---

[1] سورۂ اعراف آیت ۵۸

[2] سورۂ مائدہ آیت ۱۱۰

مقدمات کے بغیر نیز دوا اور دیگر وسائل کو بروئے کار لائے بغیر بیمار کا علاج کر دے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس مشیت او اذن کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اپنا خصوصی فیض فرمایا کہ وہ اندھوں اور کوڑھیوں وغیرہ کا علاج کرتے تو انہیں شفا حاصل ہو جاتی تھی۔

وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ[1]

ایک طبیت اور حضرت مسیح بن مریم علیہما السلام ہر دو کی طرف سے علاج کی مشیت کے ساتھ ہوتا ہے، البتہ اس فرق کے ساتھ کہ ایک طبیب کے مریضوں کا علاج کرنے میں اللہ تعالیٰ کی مشیت عمومی اور حضرت مسیح علیہ السلام کے لئے اللہ تعالیٰ کی خصوصی مشیت شامل تھی۔

نبی اور غیب مطلق

غیب سے مراد ہر وہ چیز ہے جو ہم سے پوشیدہ پنہاں ہو، ان میں سے بعض چیزیں غیب مطلق ہیں جو ہمیشہ سے پوشیدہ ہیں اور پوشیدہ رہیں گی۔ مثلاً ذات باری تعالیٰ کی حقیقت کہ یہ نہ کبھی بشر پر واضح ہوئی ہے او نہ کسی طریقے سے اس کے آشکار ہونے کا امکان ہے اور یہ محدود مخلوق کبھی بھی اپنے لامحدود خالق کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہو سکتی۔

کچھ دوسرے امور غیب نسبی ہیں یعنی ایک اعتبار سے غیب اور دوسرے اعتبار سے شہود ہیں۔ مثلاً آنے والے کل کے واقعات وہ آج ہمارے لئے غیب ہیں اور ہمیں نہیں معلوم کہ کل کیا حوادث پیش آئیں گے۔ لیکن جوں ہی کل آتا ہے تو وہی حوادث شہود میں بدل جاتے ہیں اور ہم پر آشکار ہو جاتے ہیں۔ اس وقت ہمارا موضوع اس غیب نسبی سے متعلق مسائل غیب اور اخبار غیبیہ ہیں کیونکہ بشر کے لئے انہیں آگاہی حاصل کرنا ممکن ہے۔

ایک تعلیم یافتہ، ماہر نجوم، اپنے قواعد ریاضی کے حساب کتاب کے ساتھ غیب کی خبریں دیتا ہے اور کہتا ہے کہ فلاں روز آفتاب کو گہن لگے گا اور فلاں شب چاند گرہن ہو گا۔ پھر جس طرح اس نے کہا ہوتا ہے اسی طرح اس مقررہ وقت پر سورج گرہن اور چاند گرہن ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ نجومی مشیت الٰہی کے مطابق اس منظم جہان کے نظام پر مطلع ہونے کے ذریعے غیب کی یہ خبر دیتا ہے، لیکن یہ مشیت خداوندی کسی خاص اور معین شخص سے مربوط نہیں ہے۔ بلکہ جو کوئی بھی علم نجوم کے متعلق مسائل ریاضیات میں درس پائے اور صحیح حساب کتاب کرنے میں کامیاب ہو جائے، وہ چاند گرہن اور سورج گرہن وغیرہ کا اطلاع دینے کا اہل ہو سکتا ہے۔

غیب گوئی اور طبیب

ایک تعلیم یافتہ طبیب کسی بیمار کے بستر کے قریب آتا ہے اور اس آئندہ کی حالت کے متعلق خبر دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کو چوبیس گھنٹے بعد اس کا بخار اور بڑھ جائے گا، اڑتالیس گھنٹے بعد اس کی کپکپی طاری ہو جائے گی اور تین روز بعد بے ہوش ہو جائے گا پھر دیکھا

---

[1] سورۂ آل عمران آیت ۴۹

جاتا ہے کہ جس طرح اس نے کہا تھا ویسے ہی ہوتا ہے۔ یہاں اس طبیب نے مشیت الٰہی کے طفیل اور اپنے طبی حساب کی بنیاد پر یہ بات کہی کسی معین اور خاص فرد سے مختص نہیں اور جو کوئی بھی درس طب پڑھے، بیماری کے آنے اور اس کے عوارض سے آگاہی حاصل کرے، وہ ان غیبی باتوں کی اطلاع دے سکتا ہے۔

ولا یحیطون بشیئی من علمه الا بما شاء

غیب گوئی اور برگزیدہ افراد

ان نسبی عیوب میں کچھ عیب ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ ہی کے علم میں ہیں اور یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے سے بھی ان پوشیدہ حقائق پر اطلاع حاصل نہیں ہوسکتی۔ ہاں بعض برگزیدہ اور منتخب افراد ہوتے ہیں کہ جنہیں اللہ تعالیٰ اپنے ارادہ مشیت کے ساتھ ان غیوب پر مطلع کردیتا ہے۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ﴿۲۷﴾[۱]

اللہ تعالیٰ وہ ہے جو غیب (کی حقیقتوں اور واقعتیوں) کا عالم ہے۔ اور کسی کو بھی ان (حقائق) پر آگاہ نہیں کرتا مگر اس کو جسے رسالت کے لئے خداوند تعالیٰ نے برگزیدہ بنا لیا ہوتا ہے۔ کیونکہ وہی ہے جسے وہ آگے اور پیچھے سے محافظت بخشتا (اور اس کی مراقبت کرتا) ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ۭ[۲]

اور میں تمہیں خبر دیتا ہوں کے تم کیا کھاتے ہو؟ اور کیا کیا چیزیں اپنے گھروں میں جمع کی ہوئی ہیں؟۔

عن ابی عبدالله علیه السلام قال: اذا اراد الامام ان یعلم شیء اعلمه ذالك[۳]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: جب امام یہ چاہے کہ کسی چیز کا علم حاصل ہو تو اللہ تعالیٰ اسے اس چیز کا علم دے دیتا ہے۔

عامہ وخاصہ (اہل سنن واہل تشیع) ہر دو کے سلسلہ اسناد کے ساتھ بہت سی روایات موجود ہیں جن میں رسول اکرم صل اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ طاہرین علیہم نے غیبی خبریں دی ہیں۔ انہوں نے لوگوں کو ایسے واقعات کی اطلاع دی ہے جو مستقبل میں وقوع

---

[۱] سورۂ جن آیت ۲۶۔۲۷

[۲] سورۂ آل عمران آیت ۴۹

[۳] الکافی ج ۱ ص ۲۵۸

پذیر ہوں گے، یہاں ہم ان میں سے چند ایک بطور نمونہ ذکر کئے دیتے ہیں،

ماہ رمضان قریب آ رہا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک تفصیلی خطبہ دیا، اس میں ماہ رمضان کی عظمت اور معنویت کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کچھ فرائض وسنن کی توضیح فرمائی اور لوگوں کو اپنے وظائف وفرائض انجام دینے کا شوق دلایا۔

قال امير المومنين عليه السلام: فقمت فقلت يا رسول الله ما افضل الاعمال فى هذا الشهر فقال يا ابا الحسن. افضل الاعمال فى هذا اشهر الودع عن محارم الله عزوجل ثم بكى. فقلت يا رسول الله ما يبكيك فقال يا على. ابكى لما يستحل منك فى هذا الشهر كانى بك وانت تصلى لربك وقدانبعث اشقى الاولين والآخرين شقيق عاقر ناقة ثمود فضربك ضربة على قرنك فخضب منها لحيتك قال امير المومنين فقلت يا رسول الله و ذالك فى سلامة فى دينى فقال فى سلامة من دينك[1]

رسول اکرمؐ اور اخبار غیب

امیر المومنین امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: اس خطبہ کے دوران میں اٹھ کھڑا ہوا اور عرض کی: یا رسول اللہؐ! ماہ رمضان میں تمام اعمال میں سے افضل و بہتر کون سا عمل ہے؟ آپ نے فرمایا: گناہ سے اجتناب کرنا۔ اس کے بعد حضرت رسول اکرمؐ رونے لگے۔ میں نے پوچھا یا رسول اللہؐ: آپ کو کیا چیز رلا رہی ہے؟ فرمایا: میرا گریہ اس مصیبت کی وجہ سے ہے جو اس ماہ میں تم پر وارد ہوگی، گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ تم درگاہ خداوندی میں نماز میں مصروف ہو اور اولین وآخرین میں سے بدبخت ترین اور قوم ثمود کی ناقہ کی ٹانگیں کاٹنے والے شقی کی مثل ایک شخص تمہارے سر پر تلوار کا وار کرتا ہے کہ اس سے تمہارے خون سے تمہاری داڑھی رنگین ہوگئی ہے۔ امام علیہ السلام مزید فرماتے ہیں کہ اس پر میں نے عرض کی: یا رسول اللہؐ! کیا یہ سانحہ مجھ پر میری دینی سلامتی کی حالت میں آئے گا؟ فرمایا ہاں، تمہارے دین کی سلامتی میں ہوگا،

چنانچہ امام علی علیہ السلام ۴۰ھ میں شہید کئے گئے اگر حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا یہ خطبہ زندگی کے آخری سالوں میں دیا ہو تو بھی اس میں آپ نے تقریباً ۲۹ سال آگے کی خبر دی ہے۔ قابل غور یہ نکتہ ہے کہ اس میں آپ نے فقط ایک غیبی خبر نہیں دی بلکہ کئی ایک غیبی خبریں بیان فرمائی ہیں۔

---

[1] عیون اخبار الرضا ج ۱ ص ۲۹۷

چند غیبی اخبار

۱۔ امام علی علیہ السلام اپنی طبعی مرگ میں دنیا کو نہیں چھوڑیں گے، بلکہ آپ کو قتل کیا جائے گا۔

۲۔ آپ کی شہادت ماہ رمضان مبارک میں وقوع پذیر ہوگی۔

۳۔ آپ کو حالت نماز میں قتل کیا جائے گا۔

۴۔ آپ کو زہر سے سہید نہیں کا جائے گا بلکہ آپ کو اسلحہ (تلوار) کے ساتھ شہید کیا جائے گا۔

۵۔ یہ وار آپ کے سر پر لگے گا نہ سینے یا پہلو پر

۶۔ آپ کا خون اس قدر بہے گا کہ آپ کی داڑھی آپ کے خون سے رنگین ہوجائے گی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ غیبی خبر بڑی صراحت اور یقین کے ساتھ ایک کثیر جمعیت مسلمین کے سامنے منبر پر سے بیان فرمائی۔حتی کہ یہ بیان آپ کے ضمیر میں اس قدر روشن اور قابل تردید تھا کہ آپ نے فرمایا: گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے ساتھ یہ سانحہ پیش آرہا ہے۔

۲۹ سال بعد پیش آنے والے ایک واقعہ کی اس طرح اطلاع دینا عام علمی ذرائع اور یونیورسٹی کی تعلیم کے توسط سے ایک ناممکن امر ہے۔ یہ غیبی علم ہے جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی خصوصی مشیت سے ہے کہ جس کا فیض اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر اکرمؐ پر فرمایا اور رسول اکرمؐ اسی کی بنیاد پر گفتگو فرمارہے ہیں۔ پھر توجہ رہے کہ رسول اکرمؐ اس سانحے کے وقوع پذیر ہونے کی اطلاع کئی ایک مرتبہ دیتے رہے ہیں۔

قال انس بن مالك مرض علي عليه السلام: فدخلت عليه وعنده ابو بكر و عمر فجلست عنده فاتاه النبي (ص) فنظر في وجهه فقال له ابو بكر و عمر يانبي الله مانراه الا ميتا فقال لن يموت هذا الآن ولن يموت حتى يملأ غيظا ول يموت الا مقتولا[1]

امام علی کی شہادت کی خبر دینا

انس بن مالک کہتے ہیں: امام علی علیہ السلام بیمار ہوئے تو میں ان کی خدمت میں گیا، ابوبکر وعمر بھی وہاں بیٹھے تھے۔ اتنے میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے اور حضرت علی علیہ السلام کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ ابوبکر وعمر چونکہ حضرت علی علیہ السلام کی بیماری میں شدت محسوس کررہے تھے، اس لئے رسول اکرمؐ کی خدمت میں عرض کرنے لگے ہمیں تو یہ نظر آتا ہے کہ حضرت

[1] کامل ابن اثیر ج ۳ ص ۱۶۸

علیؑ اسی تکلیف میں دنیا چھوڑنے والے ہیں۔تب رسول اکرمؐ نے فرمایا: ہرگز اس بیماری کے باعث دنیا سے نہیں جائیں گے،علی علیہ السلام ہرگز فوت نہیں ہوں گے مگر جب آپ کا دل غیظ وغضب سے پر ہو چکا ہوگا اور وہ ہرگز (بیماری سے فوت نہیں ہوں گے) بلکہ وہ قتل کئے جائیں گے۔

حضرت ابوذر کی وفات

حضرت ابوذر غفاری زبذہ کے صحراء میں اپنی عمر کی آخری گھڑیاں گزار رہے تھے اور آپ کی زوجہ آپ کے پاس بیٹھی رو رہی تھی،ابوذر نے پوچھا: کیوں روتی ہو؟اس نے جواب دیا: آپ اس بیابان میں فوت ہو رہے ہیں،میں تنہا آپ کے جنازے کو کیا کروں گی؟میرے پاس تو آپ کے کفن کا کپڑا بھی نہیں ہے۔ابوذر نے فرمایا رووٴمت۔

فانی سمعت رسول الله (ص) ذات یوم وانا عنده فی نفر یقول: لیموتن رجل منکم بفلاة من الارض تشهده عصابة من المومنین[1]

ایک دن میں اور چند دیگر افراد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے،کہ آپ نے فرمایا: تم میں سے ایک بے آب وگیاہ صحراء میں فوت ہوگا اور چند باایمان لوگ اس راستے سے آئیں گے اور اسکے جنازے پر حاضر ہوں گے،ابوذر نے اپنی زوجہ سے کہا جو لوگ اس روز میرے ساتھ حضور اکرمؐ کی خدمت میں موجود تھے،وہ سب دنیا سے جا چکے ہیں،سب کی وفات آبادی میں لوگوں کے درمیان ہوئی کوئی اوران میں سے میرے علاوہ کوئی بھی نہیں رہا ہے۔اب میں اس صحراء میں جان دے رہا ہوں،اس لئے تو اس راستے پر نگاہ رکھنا اور جو کچھ میں نے تجھ سے کہا تو اس کا بہت جلد نظارہ کرے گی۔زوجہ نے کہا کیونکر ممکن ہے کہ کوئی اس بیابان سے گزرے جبکہ حجاج کے گزرنے کا وقت بھی ختم ہو چکا ہے۔ابوذر نے فرمایا: میں نے ہرگز جھوٹ نہیں بولا اور تم اس راستے پر نگاہ رکھ کر انتظار کرتی رہو۔اس کے بعد آپ دنیا کو چھوڑ گئے اور پھر زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ ایک قافلہ اس راستے سے گزرا اور ربذہ میں وارد ہوا۔مالک اشتر بھی ان میں تھے۔ابوذر کی زوجہ نے اپنے شوہر کی موت کی اطلاع انہیں دی تو وہ لوگ یہ خبر سن کر سخت متاثر ہوئے لیکن ساتھ ہی خوش ہوئے کہ حسن اتفاق سے اس الہٰی انسان کی تجہیز وتکفین کی توفیق حاصل ہوئی اور آپ کو غسل وکفن دیا۔مالک اشتر نے امامت فرمائی اور سب حاضرین سے نماز جنازہ میں شرکت کی اور پھر آپ کو دفن کر دیا۔[2]

ابوذر غفاری کے بارے میں حضرت رسول اکرمؐ کا فرمان دو غیبی خبروں پر مشتمل ہے:

اول: یہ کہ ابوذر ایک بیابان میں فوت ہوں گے۔

دوم: یہ کہ ایک جمعیت اس راستے آئے گی اور اسے دفن کرے گی۔

---

[1] اسد الغابہ ج ۱ ص ۳۰۲

[2] بحار الانوار ج ۶ ص ۷۷

یہ دوخبریں پیغمبر اکرمؐ نے اپنی زندگی میں دی تھیں اور پھر کئی سال گزرنے کے بعد عثمان کے دورحکومت پر آپ کی یہ پیشینگوئی تحقیق پذیر ہوئی۔ تب ابوذر نے بیابان میں جان دی، وہاں سے ایک قافلہ گزرا اوراس نے آپ کو دفن کیا۔ یہ دونوں غیبی واقعات علم الٰہی میں موجود تھےاوررسول اکرمؐ بمشیت الٰہی ان پر مطلع ہوئے تھے۔

حضرت عمار یاسر بھی رسول اکرمؐ کے صحابہ میں سے ہیں" آپ نے اپنی اسلامی زندگی میں مشرکین کے ہاتھوں بڑے صدمے اٹھائے، اورسنگین واقعات کا سامنا کیا۔ عمار یاسر جنگ صفین میں امیرالمومنین امام علی علیہ السلام کے لشکر میں تھے اوراسی جنگ میں شہادت کے درجہ پر فائز ہوئے۔ حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زندگی میں حضرت عمار کے بارے میں دو غیبی خبریں دی تھیں کہ ایک لمبا عرصہ گزرنے کے بعد یہ دونوں خبریں ٹھیک ثابت ہوئیں۔

عمار یاسر کا قتل

اول: آنحضرتؐ نے عمار یاسر کے بارے میں یہ خبر دی تھی کہ وہ ایک ظالم اورستمگار گروہ کے ہاتھوں قتل کر دیئے جائیں گے، یہ خبر لوگ بالواسطہ حضرت رسول اکرمؐ سے نقل کیا کرتے تھے،نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ بعض افراداسی امر کو جنگ صفین میں برحق گروہ کو باطل گروہ سے ممتاز کرنے کا معیارقرار دے چکے تھے۔

شهد خزيمة بن ثابت الجمل وهو لا يسل سيفاً وشهد صفين ولم يقاتل وقال لا اقاتل حتى يقتل عمار فانظر من يقتله فاني سمعت رسول الله (ص) يقول: تقتله الفتنه الباغية فلما قتل عمار قال خزيمة ظهرت لی الضلالة ثم تقدم و قاتل حتى قتل[1]

خزیمہ بن ثابت جنگ جمل میں حاضر ہوئے اورتلوار کو ہاتھ نہ لگایا پھر جنگ صفین میں بھی حاضر ہوئے لیکن جنگ میں حصہ نہ لیا وہ کہتے تھے کہ جب تک عمار قتل نہ ہوں گے میں جنگ نہیں کروں گا۔ میں دیکھوں گا کہ کون سا گروہ عمار کو قتل کرتا ہے، کیونکہ میں نے حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا کہ آپ نے فرمایا: عمار کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔ پس جب عمار (معاویہ کے لشکر کے ہاتھوں) قتل ہو گئے تو خزیمہ نے کہا اب میں نے گمراہ ٹولے کو پہچان لیا ہے۔اس کے بعد آپ نے تلوار ہاتھ میں لی اورآگے بڑھ کر لشکر معاویہ پر حملہ کیا اور جنگ کرتے رہے تا آنکہ خود بھی قتل ہو گئے۔

قال عمار بن ياسر يوم صفين ائتوني بشربة فاني بشربة لبن فقال ان رسول الله (ص) قال: آخر شربة نشربها من الدنيا شربة لبن وشربها ثم قاتل حتى قتل[2]

---

[1] اسد الغابہ ج ۴ ص ۴۷

[2] اسد الغابہ ج ۴ ص ۴۶

دوم: دوسری غیبی خبر جو حضرت رسول اکرمؐ نے عمار کے بارے میں دی، وہ آپ کی آخری غذا کے بارے میں تھی۔ عمار یاسر نے بروز صفین کچھ پینے کے لئے مانگا تو لوگ آپ کے لئے دودھ لے آئے۔ تو اس پر آپ نے کہا: پیغمبر اکرمؐ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ زندگی میں تمہارا آخری مشروب دودھ ہوگا، اس کے بعد آپ نے وہ دودھ پیا اور میدان جنگ میں مصروف قتال رہے، حتی کہ شہید ہو گئے۔

یہ دو ایسی حقیقی خبریں ہیں جو اللہ تعالیٰ کے علم میں تھیں اور اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت سے ان کی اطلاع جناب رسول اکرمؐ کو دی تھی،

ولا یحیطون بشیئی من علمه الا بما شاء

علامہ حلی رضوان اللہ علیہ نے اپنے والد گرامی سے نقل فرمایا ہے:

مغلوں کے حملے سے کوفہ، حلہ کربلا اور نجف اشرف کے باشندوں کے محفوظ رہنے اور قتل عام سے بچ جانے کا سبب یہ ہوا کہ جب ہلاکو خان بغداد کے باہر پہنچا اور ابھی اس نے شہر کو فتح نہیں کیا تھا کہ اہالیان حلہ خوف و ہراس سے اپنے گھر چھوڑ کر بطائح کی طرف نکل گئے اور ان کی بہت ہی قلیل تعداد شہر کے اندر رہ گئی۔ ان افراد میں میرے والد، جناب سید بن طاؤس اور فقیہ ابن ابی العز شامل تھے، ان تین حضرات نے فیصلہ کیا کہ ہلاکو خان کے نام ایک خط لکھیں اور اس میں صراحتاً تحریر کریں کہ ہم تمہاری اطاعت کا اعلان کرتے ہیں۔

پھر خط لکھا اور ایک غیر عرب شخص کے ہاتھ روانہ کیا، ہلاکو خان نے اس خط کو پڑھنے کے بعد ان حضرات کے نام ایک فرمان لکھا اور دو افراد "**نکله اور علائو الدین**" کے ہاتھ ان کی طرف بھیجا اور ان دونوں کو کہا کہ ان خط لکھنے والوں سے کہنا اگر تم نے یہ خط بصمیم قلب لکھا ہے اور تمہارے دل تمہاری تحریر سے ہم آہنگ ہیں تو پھر میرے پاس آ جاؤ۔

علامہ حلی کے والد اور ہلاکو خان

ہلاکو خان کے فرستادہ آدمی حلہ آئے اور ہلاکو کا یہ پیغام ان تین حضرات کو پہنچایا، لیکن یہ حضرات ہلاکو کی ملاقات سے خائف اور ناراحت تھے کیونکہ معلوم نہ تھا کہ آخری انجام کیا ہوگا۔ چنانچہ میرے والد نے ان دونوں سے کہا: اگر تنہا میں ہی ہلاکو کے پاس چلا جاؤں تو کافی رہے گا، (آپ کے جانے کی ضرورت نہ رہے گی۔) انہوں نے کہا: ہاں ٹھیک ہے۔ تب آپ نے ان دونوں سفیروں کے ساتھ سفر کیا، جب کہ ابھی بغداد فتح نہیں ہوا تھا اور عباسی خلیفہ کے قتل تک نوبت نہیں پہنچی تھی۔ جب میرے والد ہلاکو خان کے سامنے حاضر ہوئے تو اس نے کہا: آپ نے میرے ساتھ نامہ نویسی کا اقدام کیوں کیا؟ اور میری ملاقات کو کیسے آ گئے؟ جب کہ ابھی آپ کو معلوم ہی نہیں کہ میرے اور خلیفہ کے مابین کیا ہونے والا ہے؟ آپ کو یہ اطمینان کیسے حاصل ہو گیا کہ میرے اور خلیفہ کے مابین صلح نہیں ہو گی اور اس کو چھوڑوں گا نہیں؟

میرے والد نے جواب میں فرمایا: ہمارے خط لکھنے کے اقدام اور آپ کے ہاں آ جانے کی بنیاد ایک روایت پر ہے جو امیر

المومنین امام علی علیہ السلام کی طرف سے ہم تک پہنچی (اور وہ آپ کا خطبہ زوراء) ہے۔

قال فی خطبة الزوراء وما ادرك ما الزوراء ارض ذات اثل یشتد فیها البینان وتکثر فیها السکان ویکون فیها مخادم و خزان یتخذها ولد العباس موطناً ولخرفهم مسکنا تکون لهم دار لهو ولعب یکون بها الجور الجائر والخوف المه المحیف والأئمة الفجرة والا مراء الفسقة والوزراء الخونة تخدمهم ابناء فارس والروم لا یأتمرون بمعروف اذا عرفوه ولا یتناهون عن منکر اذا انکروه تکفی الرجال منهم بالرجال وانساء بالنساء فعند ذلك الغم العمیم والبکاء الطویل والویل والعویل لا هل الزوراء من سطوات الترك وهم قوم صغار الحدق وجوههم کالجان المطوقة لباسهم الحدید جرد مرد یقدمهم ملك یاتی من حیث بدا ملکهم جهوی الصوت قوی الصولة عالی الهمة لا بمدینة الا فتحها ولا ترفع علیه رایة الا نکسها الویل الویل لمن ناواه فلا یزال کذالك حتی یظفر [1]

خطبہ زوراء

امام علی علیہ السلام نے خطبہ زوراء میں فرمایا: تجھے کیا معلوم کہ زوراء کیا ہے؟ ایک وسیع سرزمین ہے جس میں مضبوط عمارتوں کی بنیادیں رکھی جائیں گی اور ایک بڑی جمعیت وہاں ہائش پذیر ہوگی کہ ان میں رؤساء اور دولتمندوں کی ایک بڑی تعداد ہوگی۔ ہاں نبی عباس اس کو اپنا وطن بنائیں گے اور اپنی سطوت و دولت کا مستقر قرار دیں گے۔ یہ شہر (زوراء) ان نبی عباس کے لہوولعب کا مرکز ہو گا۔ وہ ظلم و جور اور خوف وہراس کا گڑھ بن جائے گا۔ وہاں فاسق وفاجر ائمہ بدکار حکمرانوں اور خیانت کار روزراء کا اجتماع ہوگا اور فارس و روم کے نوجوان ان کے خدام ہوں گے۔ یہ لوگ نیکی کی معرفت کے باوجود اس پر عمل نہیں کریں گے اور برائی کو جان لینے کے باوجود اس کی پرواہ نہیں کریں گے۔ یہاں تک کہ ان کے مرد مردوں پر اکتفا اور عورتیں عورتوں پر اکتفا کریں گی۔ ان تاریک اور گناہ آلود فضاؤں، ان شرمناک اور ننگ آور حالات میں زورءا کے معاشرے کو ایک عام اندوہ، طویل گریہ بکاء اور بدبختی دامن گیر ہوجائے گی۔ یہ لوگ باہر سے ترک اقوام کے حملوں کی گرفت میں آجائیں گے اور وہ ایسی اقوام ہیں جن کی آنکھوں سے ڈھیلے چھوٹے اور ان کے چہرے طوق دار ڈھالوں کی مانند اور ان کا لباس فولادی (زرہیں) ہیں۔ وہ بے ریش جوانوں ایسے خدوخال رکھتے ہیں، ان کی قیادت ایک ایسا بادشاہ کررہا ہوگا جو اپنی اصلی سرزمین سے آئے گا۔ وہ اونچی آواز، قوی حملہ اور بلند ہمت کا مالک ہوگا، کسی شہر سے نہ گزرے گا

---

[1] سفینۃ البحار ''زور'' ص ۵۶۸

مگر اسے فتح کرلے گا، اس کے مقابلے میں کوئی اپنا پرچم بلند نہ کرے گا مگر وہ اسے سرنگوں کردے گا، اس کے سر پر بلاء وعذاب آئے گا جو اس کی مخالفت میں اٹھے گا، وہ اسی طرح قوی وکامیاب ہوتے ہوئے بڑھتا رہے گا تا آنکہ آخری کامیابی حاصل کرلے گا۔

علامہ حلیؒ کے والد رامی نے اس خطبے کی قرائت کے بعد ہلاکو خان سے کہا:

امام علی علیہ السلام نے اس خطبے میں جن اوصاف کا تذکرہ فرمایا ہے وہ ٹھیک ٹھیک ہمیں تم لوگوں میں ملتی ہیں۔ اس لئے ہمیں تمہاری کامیابی کی امید ہے، تمہیں خط لکھنے کی وجہ بھی یہی تھی اور اس لئے میں تمہارے پاس چلا آیا ہوں۔ ہلاکو خان نے ان صاحبان کی فکر کو پاکیزہ اور قابل قبول تصور کیا اور علامہ کے والد محترم کے نام پر ایک فرمان لکھ دیا جس میں حلہ کے عوام کو خصوصی عنایات کا مستحق قرار دیا۔

سقوط بغداد

پھر زیادہ عرصہ نہ گزرا کہ ہلاکو نے بغداد فتح کرلیا اور آخری عباسی خلیفہ مستعصم کو قتل کردیا۔ اس کے بارے میں دائرۃ المعارف بستانی میں لکھا ہے کہ اس خونیں حادثہ بیس بیس لاکھ سے زائد افراد قتل ہوئے، بے دریغ اموال غارت کئے گئے اور کثیر تعداد میں گھروں کو نذر آتش کردیا گیا۔ اس کے نتیجے میں واضح ہوگیا کہ علماء حلہ نے امام علی علیہ السلام کے خطبے کو اچھی طرح سمجھا اور ہلاکو خان اور اس کے لشکر پر اس کی صحیح تطبیق کی تھی۔ اس صحیح تشخیص اور برموقع اقدام کے نتیجے میں وہ حضرات حلہ۔ کوفہ۔ نجف اور کربلا کے لوگوں کو یقینی ہلاکت سے نجات دلانے میں کامیاب ہوگئے اور اجتماعی کشت وخون سے محفوظ رہے۔

شہر بغداد کی بنیاد بنی عباس میں سے خلیفہ منصور دوانیقی نے رکھی اور ۱۴۵ھ میں اس نے اس کی تعمیر کا آغاز کیا۔ ہزار ہا فنی ماہرین۔ انجنیئر۔ معمار اور مزدور اس کام پر لگائے گئے۔ چنانچہ چار سال بعد ۱۴۹ھ میں اس کی عمارتیں مکمل ہوگئیں۔

پھر جب ہلاکو خان اور اس کے لشکر نے اس شہر پر حملہ کیا اور سقوط بغداد ہوا تو وہ ۶۵۶ھ سال تھا۔ چنانچہ منصور دوانیقی کے حکم سے بغداد کی بنیاد پڑے اور ہلاکو کے ہاتھوں اسکے سقوط کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ تھا۔[1]

امام علی علیہ السلام ۴۰ھ میں شہید ہوئے اور اگر آپ نے خطبہ اپنی عمر کے آخری ایام میں بھی دیا ہو تو یہی کہا جائے گا کہ آپ نے بغداد کے خونین واقعے کی خبر ۳۹ھ میں دی ہوگی، جب کہ اس کا وقوع ۶۱۷ سال بعد ہوا۔

اگر آپ ہاتھ میں قلم لے کر امام علی علیہ السام کے اس خطبے کا غور وخوض کے ساتھ تجزیہ کرنے بیٹھیں تو دیکھ لیں گے کہ آپ کا یہ کلام کئی ایک غیبی خبروں پر مشتمل ہے۔

یہ غیبی وقائع اور حقائق علم الٰہی میں موجود ہوتے ہیں اور یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے سے ان کی واقفیت نہیں ہوسکتی۔ یہ تو خود اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے کہ اپنی خصوصی نوازش فرمائے اور جس پر چاہئے علم کا فیض فرمادے اور وہی شخص غیبی اخبار پر مطلع ہوسکتا ہے۔

---

[1] دائرۃ المعارف بستانی ''بغداد''

ولا یحیطون بشیئی من علمه الا بما شاء

رسول اکرمؐ اور ائمہ طاہرین علیہم السلام کی طرف سے نقل شدہ غیبی خبریں جو ہم تک پہنچی ہیں، وہ اہل سنت و اہل تشیع کی کتب میں بہت کثیر تعداد میں موجود ہیں۔

ماضی اور حال میں مسلمانوں کے اندر ایسے افراد کی ایک تعداد موجود رہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے برگزیدہ بندوں کو اس قسم کی اخبار سے مطلع کر دینے کے بارے میں شک و تردید کا شکار رہے اور اسے تسلیم کرنے میں پس و پیش کرتے رہے ہیں۔ لیکن ماضی میں ہی جب ان میں سے بعض افراد ایسی غیبی خبروں کے تحقق پذیر ہونے پر آگاہ ہو گئے تو اپنی سابقہ روش اور شک و تردید کے نظریئے سے پشیمان ہو گئے اور انہوں نے اس پروردگار الٰہی میں استغفار کر لی۔

غرفة الا زدی یقال له صحبة وهو من اصحاب النبی (ص) ومن اصحاب الصعه وهو الذی دعاله النبی (ص) ان یبارك الله فی صفقته قال دخلنی شك منشان علی فخرجت معه علی شاطئی الفرات فعدل عن الریف ووقف ووقفنا حوله فقال بیده هذا موضع رواحلهم ومناخ رکابهم ومهراق دمائهم بابی من لا ناصر له فی الارض ولا فی السلماء الا الله فلما قتل السحین خرجت حتی اتیت المکان الذی قتلو افیه فاذا هو کما قال ما اخطا شیاء قال فاستغفرت الله مما کان منی من الشك وعملت ان علیه رضی الله عنه لم یقدم الا بما عهد الیه فیه[1]

واقعہ کربلا کے متعلق اخبار

غرفہ ازدی کہ جسے صحبہ بھی کہا جاتا ہے، وہ اصحاب صفہ میں سے تھا۔ یہ وہ شخص ہے جس کے متعلق اک معاملے میں آنحضرتؐ نے دعا فرمائی تھی کہ اللہ تعالیٰ اس کے کاروبار میں برکت دے۔

غرفہ کہتے ہیں: میرے دل میں امام علیہ السلام کے متعلق شک و تردید پیدا ہوگئی، جب کہ ایک دن ہم ایک جمعیت میں آپ کے ہمراہ نہر فرات کے کنارے کنارے جارہے تھے۔ آپ نے راستہ بدل لیا اور آگے ایک مقام (کربلا) پر جا کر ٹھہرے اور ہم سب بھی آپ کے گردگرد آکر ٹھہر گئے۔ آپ نے اپنے ہاتھ سے ایک جگہ کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا:

یہ ان کے کارواں کے اترنے کی جگہ ہے، یہ ان کے اونٹوں کی فرودگاہ ہے اور یہ ان کے خون بہائے جانے کا مقام ہے۔ میرا باپ قربان ہو اس مظلوم پر کہ زمین وآسمان میں جس کا سوائے اللہ کے اور کوئی ناصر ومددگار نہ ہوگا۔

(غرفہ یہ غیبی خبر سننے سے شک و تردید کا شکار ہو گئے اور دل میں کہنے لگے کہ حضرت جو خبر دے رہے ہیں، کیا یہ اسی طرح وقوع

---

[1] اسد الغابہ ج ۴ ص ۱۶۹

پذیر بھی ہوگی؟“

اس خبر کا واقع میں ثابت ہونا

چنانچہ وہ فرماتے ہیں: جب حضرت امام حسین علیہ السلام شہید کر دیئے گئے تو میں مقتل شہداء کی اس سرزمین کی زیارت کے لئے چلا۔ میں نے دیکھا کہ جو کچھ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے اس زمین کے بارے میں فرمایا تھا، وہ اسی طرح وقوع پذیر ہو چکا تھا اور آپ کی گفتگو میں کوئی معمولی سا فرق نہیں پڑا تھا۔ پس اس منظر کو دیکھنے سے میرے دل کے تمام شکوک وشبہات ختم ہو گئے، میں نے اپنے کئے پر توبہ واستغفار کی اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی۔ اس وقت مجھے یقین ہو گیا کہ امام علی علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی بات کے بغیر کوئی کلام نہیں فرمایا تھا۔

عن موسی بن مهران قال رایت علی بن موسی الرضا علیه السلام فی مسجد المدنیة و هرون یخطب فقال: اترونني و ایاه ندفن فی بیت واحد[1]

موسیٰ بن مہران کہتے ہیں: میں نے حضرت علی بن موسیٰ رضا علیہما السلام سے مسجد مدینہ میں ملاقات کی، جبکہ ہارون وہاں خطبہ دینے میں مصروف تھا۔ حضرت نے مجھ سے فرمایا: کیا تم مجھے اور اس ”ہارون“ کو دیکھ رہے ہو؟ دیکھنا کہ ہم دونوں ایک ہی کمرے میں دفن کئے جائیں گے۔

قال المامون یوما اللرضا علیه السلام: ندخل بغداد ان شاء الله تعالیٰ فنفعل کذا و کذا فقال له: تدخل انت بغداد یا امیر المومنین۔ فلما خلوت به قلت انی سمعت شیئا غمنی و ذکرته له فقال: یا حسین: وما انا و بغداد لا اری بغداد ولا ترانی[2]

مامون اور امام رضا

ایک روز مامون عباسی حضرت امام رضا علیہ السلام سے کہنے لگا: ان شاء اللہ ہم بغداد میں وارد ہوں گے تو ایسا ایسا کام کریں گے۔ آپ نے مامون سے فرمایا: (ہاں) تم بغداد میں وارد ہو گے............راوی کہتا ہے کہ جب میں امام علیہ السلام کے ساتھ تنہائی کے ایک مقام پر پہنچا تو میں نے عرض کیا: جب میں نے یہ خبر سنی، اس نے مجھے مغموم کر دیا ہے۔ حضرت نے فرمایا: اے حسین: میں کہاں اور بغداد کہاں میں کبھی بغداد کو نہیں دیکھ سکوں گا اور نہ تو مجھے پھر دیکھ سکے گا، (یا یہ کہ بغداد مجھے نہیں دیکھ سکے گا۔ مترجم)

---

[1] عیون اخبار الرضا ج ۲ ص ۲۲۶

[2] عیون اخبار الرحضا ج ۲ ص ۲۲۵

غیب کی خبریں جو برگزیدگان الٰہی بتایا کرتے تھے۔ وہ سب باذن پروردگار اور ذات الٰہی کی مشیت کے پرتو میں ہوتی تھیں، یہ ہستیاں اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق اس خصوصی لطف و کرم سے فیضیاب ہوتی تھیں۔ وہ بزرگ ایسے ایسے حقاق کی اطلاع دے دیا کرتے کہ جن سے عام انسان آگاہ نہیں ہو سکتے۔

مختصر یہ کہ سارے حقائق اور تمام واقعات علم الٰہی میں حاضر و موجود ہوتے ہیں اور ایک بشر کے بس میں نہیں کہ وہ علم الٰہی کو حاصل کر لے اور اس کا احاطہ کر سکے۔ ہاں فقط مشیت خدا اور خواست باری تعالیٰ کے تحت ایک ہستی اس بات پر قادر ہو سکتی ہے کہ اس کائنات کے بعض حقائق کی عالم ہو جائے او ان کی آ گاہی حاصل کر لے۔

ولا یحیطون بشیئی من علمہ الا بما شاء

نویں تقریر

کرسی کے معانی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال اللہ العظیم فی کتابہ

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ [۱]

اللہ تعالیٰ کی کرسی آسمانوں اور زمین سے وسیع ہے۔

وسعت مادی یا معنوی

کسی چیز میں پائی جانے والی وسعت اور گنجائش کو مادی اعتبار سے دیکھا جائے اور پھر معنوی اعتبار سے اس کی ظرفیت کا جائزہ لیا جائے تو ان دونو میں بڑا فرق ہوتا ہے۔مثلاً ہم ایک گلاس کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس میں پانچ پیالیوں کے برابر گنجائش ہے،یعنی اس کی داخلی فضا اپنے اندر اتنی مقدار مائع کو جگہ دے سکتی ہے۔کبھی ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص بڑی ظرفیت اور وسعت کا مالک ہے تو مراد یہ ہوتی ہے کہ سنگین حوادث کے مقابلے میں آپے سے باہر نہیں ہوتا اور اپنی خودی کو بھول نہیں جاتا یا یہ کہ وہ دوسروں کے اسرار اپنے سینے میں محفوظ رکھتا ہے اور ہر کس و ناکس کو نہیں بتاتا۔پس اس مثال میں ظرفیت اور وسعت ایک معنوی اور روحانی امر کو کہا گیا ہے اور اس کے معنی روح کی بزرگی اور نفس پر قابو رکھنے کی قدرت اور اپنے آپ کو سنبھالے رکھنے کی قوت ہے۔

قال علی علیہ السلام: ان ھذہ القلوب اوعیة فخیرھا اوعاھا [۲]

امام علی علیہ السلام نے کمیل بن زیاد سے فرمایا:

لوگوں کے دل علم و اخلاق کے ظروف ہیں،ان میں سے بہترین دل وہ ہے جو بیشتر معنوی قدرت اور محفوظ کرنے کی زیادہ طاقت رکھتا ہو۔

آیت الکرسی اس مورد بحث جملے میں کہہ رہی ہے: اللہ تعالیٰ کی کرسی آسمانوں اور زمین سے وسیع ہے اس نکتے کو جاننے کے لئے کہ اس وسعت سے مراد معنوی وسعت ہے یا مادی وسعت۔؟ ضروری ہے کہ اس سے قبل ہم کرسی کے معنی کو سمجھیں تاکہ پھر اس

---

[۱] سورۂ بقرہ آیت ۲۵۵

[۲] نہج البلاغۃ کلمہ ۱۳۹

یک وسعت اور گنجائش کے مفہوم سے بھی آگاہی حاصل ہو سکے۔

کرسی کے معانی

لفظ کرسی لغت میں متعدد معانی کے لئے آتا ہے: روایات اور تفاسیر میں جملے میں وارد شدہ کرسی کے لفظ کے تین معانی بیان ہوئے ہیں:

اول: علم،

دوم: ایک وسیع و عریض فلکی جرم جو اس زمین اور دیگر تمام آسمانی اجرام کو گھیرے ہوئے ہے۔

سوم: سلطنت اور قدرت

اب ہم ان تین معانی پر مختصر بحث و گفتگو کرتے ہیں۔

اول: لغت میں کرسی بمعنی علم آتا ہے، مثلاً کہتے ہیں "ہو من اہل الکرسی" فلاں فرد اہل کرسی میں سے ہے یعنی اہل علم میں سے ہے۔ چنانچہ اہل البیت علیہم السلام کی روایات میں بھی اس آیت میں آئے ہوئے کلمہ کی کرسی کی تفسیر علم سے کی گئی ہے۔

عن الفضل بن عمر قال: سئلت ابا عبدالله علیه السلام عن العرش والکرسی ماهما فقال (ع) العرش هو لعلم الذی اطلع الله علیه انبیاء و رسله وحججه والکرسی هو العلم الذی لم یطلع الله علیه احدا من انبیاء ورسله وحججه [1]

خصوصی علم

مفضل بن عمر نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال کیا کہ عرش اور کرسی کیا ہیں؟ آپ نے جواب میں فرمایا: عرش وہ علم ہے کہ جس سے اللہ تعالیٰ نے انبیاء۔ رسل اور حجت خدا ہستیوں کو مطلع فرمایا۔ کرسی وہ علم ہے جسے اپنی ذات اقدس سے مختص رکھا ہے اور پیغمبروں اور حجت خدا بزرگوں میں سے کسی کو اس پر مطلع نہیں کیا۔

عن حفص بن غیاث قال: سلت ابا عبدالله علیه السلام عن قول الله عزوجل (وسع کرسیه السموات والارض) قال علمه [2]

حفص بن غیاث کہتے ہیں: میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے "وسع کرسیہ السموات والارض" کے متعلق سوال کیا۔ آپ نے فرمایا...... یہ اللہ تعالیٰ کا علم ہے۔

---

[1] معانی الاخبار ص ۲۹

[2] تفسیر البرہان ص ۲۴۸

اس مفہوم کی بنیاد پر آیت کے اس جملے کا معنی یہ بنے گا کہ اللہ تعالیٰ کا علم تمام آسمانوں اور زمین پر وسعت رکھتا ہے۔ہم سب کومعلوم ہے کہ علم کمالات معنویہ میں ہے اور اس کی وسعت و ظرفیت سے بھی مادی نہیں معنوی وسعت مراد ہوتی ہے۔لہٰذا اس جملے کے ذریعے اللہ تعالیٰ لوگوں کو آگاہ کرنا چاہتا ہے کہ اس ذات اقدس کا لامحدود علم تمام آسمانوں اور زمین پر حاوی ہے۔(کوئی مقام اس کے علم سے باہر نہیں ہے)

ربط آیات

جب ''کرسی'' کا معنی علم ہو تو اس جملے کا گزشتہ آیات سے اس طرح ربط قرار دیا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے ''لہ مافی السموات ومافی الارض'' کے ذریعے اعلان فرمایا ہے کہ اس کائنات ہستی کی ساری مخلوقات اور ان آسمانوں اور زمین کی تمام موجودات اس ذات اقدس الٰہی کی ملکیت ہیں۔پھر ''یعلم مابین ایدیھم وما خلفھم'' کے ذریعے واضح فرمایا کہ وہ مالک حقیقی اپنی ملکیت سے غافل اور بے خبر نہیں اور وہ ان کے ماضی و مستقبل اور ظاہر و باطن،غرضیکہ ان کے تمام مادی اور معنوی حالات سے بخوبی مطلع اور آگاہ ہے۔یعنی ان مملوکات کی ساری جزئیات و خصوصیات اس کے کامل علم کے اندر گھری ہوئی ہیں اور وہ ان سب پر پوری طرح محیط ہے۔

ان دو جملوں میں خداوند تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کے اندر پائی جانے والی ساری مخلوقات کی مالکیت اور علم کی بات کی تھی،لیکن خود آسمانوں اور زمین کے بارے میں کچھ نہ فرمایا تھا،اب ''وسع کرسیہ السموات ولارض'' کے جملے سے تصریح فرمادی تھی۔خود تمام آسمانوں اور زمین بھی اس باری تعالیٰ کے علم کے احاطے کے اندر ہیں۔بالفاظ دیگر پہلے جملے میں آسمانوں اور زمین کی مظروف کی طرف اشارہ کیا اور اب اس جملے میں خود اس ظرف آسمان و زمین کے بارے میں بیان فرمایا ہے۔

ایک فلکی جرم

دوم: بعض اسلامی روایات میں یہ بھی ذکر ہے کہ کرسی ایک بہت بڑا آسمانی جرم ہے جو اپنی وسعت و عظمت کے لحاظ سے تمام آسمانوں اور زمین کو گھیرے ہوئے ہے۔گویا کرسی ایک عظیم مخلوق ہے جس کے اندر تمام آسمانوں اور زمین کے سما جانے کی وسعت و گنجائش موجود ہے۔

عن الفضيل بن يسار قال: سالت ابا عبدالله عليه السلام عن قول الله جل وعز (وسع كرسيه السموات والارض) فقال: فضيل كلى شيئى فى الكرسى، السموات والارض وكل شيئى فى الكرسى[1]

فضیل بن یسار کہتے ہیں: میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے ''وسع کرسیہ السموات والارض'' کے معنی دریافت کئے تو

---

[1] الکافی ج ا ص ۱۳۲

آپ نے فرمایا:۔ ہر چیز کرسی میں ہے یعنی آسمان۔ زمین اور تمام اشیاء کرسی کے اندر موجود ہیں،

روی الاصبغ بن نباتة ان علیا علیه السلام قال: ان السموات والارض وما فیها من مخلوق فی جوف الکرسی[1]

کرسی کی اندرونی وسعت

اصبغ بن نباتہ نے امام علی علیہ السلام سے روایت کی کہ آپ نے فرمایا: تمام آسمان وزمین اوران کے اندر کی ساری مخلوقات کرسی کے اندر ہیں،

عن ابی عبدالله علیه السلام قال: العرش فی وجه هو جملة الخلق والکرسی وعاء ه[2]

اما جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: عرش ایک لحاظ سے اس سارے جہان ہستی اور آفرنیش کا مجموعہ اور کرسی اس مجموعے کا ظرف ہے۔

عن زرارة عن ابی عبدالله علیه السلام فی قول الله وسع کرسیه السموات والارض قال ابو عبدالله (ع) السموات والارض وجمیع ما خلق الله فی الکرسی[3]

زرارہ نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: تمام آسمان۔ زمین اور ساری مخلوقات خدا، کرسی کے اندر ہیں۔

ایک مشکل تصور

ایک بشر کے لئے کرسی نامی ایسے باعظمت جرم کا تصور کرنا سخت مشکل ہے جو اپنے اندر سارے آسمانوں اوزمین کی وسعت رکھتا ہو۔لیکن اہمیت اس بات کی ہے کہ اسلام کے پیشیواؤں نۓ کرسی کی ظرفیت کا یہی تعارف کروایا ہے۔ کہ وہ ان آسمانوں اور زمین کے مجموعی حجم سے کہیں زیادہ وسعت رکھتی ہے۔ بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ اس کرسی سے بزرگ تر اور وسیع تر ایک دوسری مخلوق بھی موجود ہے اور وہ بھی پروردگار عالم کی قلمرو میں داخل ہے۔

عن ابی عبدالله علیه السلام انه قال، ما السموات والارض عند الکرسی الا

---

[1] مجمع البیان ج ا۔ ۲ ص ۳۶۳

[2] معانی الاخبار ص ۲۹

[3] تفسیر البرہان ص ۱۴۹

کحلقة خاتم فی فلاة وما الکرسی عند العرش الا کحلقة فی فلاة[1]

کرسی کی عظمت

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: تمام آسمان اور زمین کرسی کے مقابلے میں اس طرح ہیں جس طرح کی وسیع اور پہناور بیابان میں ایک انگشتری پڑی ہوئی ہو۔ یہ کرسی اپنی بزرگی و عظمت کے باوجود الٰہی عرش عظیم کے مقابلے اس طرح ہے جس طرح ایک صحرا میں انگشتری کا حلقہ ہو۔

کرسی کے اس معنی کے لحاظ سے مورد بحث جملے کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ کرسی مخلوقات خدا میں سے ایک بہت بڑا جرم ہے کہ جس کی وسعت اور گنجائش تمام آسمانوں اور زمین کو حاوی ہے۔اس سے واضح ہے کہ کرسی اپنی اس ظرفیت و وسعت کے لحاظ سے ان کا خ خلقت کی کثرت و وسعت اور اس کے ایک مادی وسعت پر مشتمل ہونے کا پتہ دیتی ہے۔

دو سوال

کئی مرتبہ اتفاق ہوتا ہے کہ نوجوان اپنے تجسس و تحقیق کے جذبے کے تحت دو باتوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں، ایک یہ کہ قرآن مجید میں سات آسمانوں کی تصریح کی گئی ہے ان سے مراد کیا ہے؟

دوسرے یہ کہ دن اور رات آفتاب کے طلوع وغروب سے وجود میں آتے ہیں اور بوقت تخلیق افلاک طلوع وغروب نہ تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہ کیسے فرمایا کہ اس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا ہے؟

بہتر ہوگا کہ موقع کی مناسبت اور اس فرصت سے فائدہ اٹھایا جائے اور آیت الکرسی کے جملہ ''وسیع کرسیہ السموات والارض'' کے بارے میں بحث کرتے ہوئے ان دونوں کے بارے میں بھی مختصر گفتگو کر لی جائے، امید ہے کہ یہ گفتگو مفید اور سودمند رہے گی۔

پوشیدہ حقیقت

آغاز سخن میں پہلے سوال کے جواب میں اجمالی طور پر یہ کہنا چاہئے کہ دینی نکتہ نگاہ سے ہم نہیں جانتے کہ سات آسمان کیا ہیں اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جس حقیقت سے بارہا آگاہ فرمایا وہ ہم پر پوشیدہ ہے۔ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ اس جہان ہستی کے خالق اور موجودات کو وجود بخشنے والے مالک نے اپنی مخلوق کے بارے میں خبر دی اور فرمایا ہے کہ میں نے سات آسمان پیدا کئے ہیں۔

ہم نہ فقط ان سات آسمانوں کی حقیقت سے بے خبر ہیں بلکہ اس مخلوق کی وضع و کیفیت پر بھی آگاہ نہیں ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس قادر خدا نے اس باعظمت آسمان کو کس طرح خلق فرمایا اور یہ حیرت انگیز مخلوقات کہاں سے اور کس طرح سے آئی ہیں؟

---

[1] مجمع البیان ج ا۔ ۲ ص ۳۶۲

مَآ اَشۡهَدۡتُّهُمۡ خَلۡقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَلَا خَلۡقَ اَنۡفُسِهِمۡ ۖ [۱]

میں نے بشر کو آسمانوں اور زمین کی خلقت پر گواہ نہیں بنایا اور نہ ہی انہیں خود ان کی آفرینش پر حاضر و شاہد بنایا ہے، یعنی بشر اس جہان اور انسان کی خلقت پر آگاہ نہیں ہے۔

ناشناخت مقامات

علمی اعتبار سے بھی یہ عالم اور یہ باعظمت کہکشائیں ابھی تک دور حاضر کے ماہر سائنس دانوں کے لئے مجہول اور ناشناختہ ہیں اور وہ ان کے آغاز اور انجام سے بے خبر ہیں۔ گزشتہ صدی کے محقق ماہرین طاقتور ترین ٹیلی سکوپوں کے ذریعے کتاب تکوین او افلاک کے اجرام کے مشاہدہ میں مگن رہے اور انہوں نے اس راہ میں بڑی بڑی کامیابیاں بھی حاصل کی ہیں۔ لیکن وہ اپنی ان تمام ترقیوں اور کامیابیوں کے باوجود معترف ہیں کہ وہ اپنی علمی کاوش کے ساتھ اس دور دراز راہ کے فقط ایک معمولی حصے کو طے کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں اور ابھی تک اس جہان کے کثیر مقامات ناشناختہ ہیں۔

رسل کہتا ہے: جب (کوپرنیک) کا طریقہ کامیاب ہوا تو ہم سمجھے کہ زمین اس کائنات کا مرکز نہیں اور کچھ مدت بعد سورج نے اس کی جگہ لے لی، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ سورج کسی طرح سے بھی ستاروں کی دنیا کا بادشاہ نہیں ہے۔ بلکہ درحقیقت اسے متوسط قسم کے ستاروں میں بھی شمار کیا جا سکتا، اور اس کائنات کی خالی فضا کے اندر لے کراں وسعت موجود ہے۔''

سورج کی مسافت نزدیک ترین ستارے سے تقریبا ۲ / ۴ نوری سال ہے، اس کے باوجود کہ ہم آسمان کے بھرے حصے میں رہتے ہیں کہ جسے کہکشاں کہا جاتا ہے اور جو تیس ارب ستاروں کا مجموعہ ہے۔ یہ کہکشاں ان دوسری متعدد کہکشاؤں میں سے ایک ہے جن میں سے ابھی تک تین کروڑ کو شناخت کیا جا چکا ہے اور شاید بہترین ٹیلی سکوپوں کے ذریعے ان کی مزید تعداد بھی معلوم ہو جائے۔ ایک کہکشاں سے دوسری کہکشاں تک کا اوسط فاصلہ بیس لاکھ نوری سال ہے، اب بظاہر وہ کافی جگہ نہیں پا رہی ہیں، کیونکہ یہ سب بڑی جلدی میں ایک دوسری سے دور ہوتی جا رہی ہیں۔

ان میں سے بعض تو چودہ ہزار (۱۴۰۰۰) میل فی ثانیہ یا اس سے بھی زیادہ رفتار میں ہم سے دور ہو رہی ہیں، ماہرین کے مطابق اس وقت ان میں سب سے دور ترین کہکشاں وہ ہے جو پچاس کروڑ نوری سال کے فاصلے پر ہے۔ وہ اس طرح کہ جو کچھ آج ہم دیکھ رہے ہیں وہ اس شکل کی تصویر ہے جس پر وہ آج سے پچاس کروڑ سال قبل تھیں۔ [۲]

---

[۱] سورۂ کہف آیت ۵۱

[۲] تاثیر علم بر اجتماع ص ۳۱

مطالعہ افلاک

تاہم ابھی ماہرین اس تلاش وجستجو سے تھکے نہیں ہیں، وہ کائنات وافلاک کے مطالعے میں مصروف ہیں اور تازہ انکشافات کرنے پر قادر ہو گئے ہیں۔لیکن تاحال اس تعجب انگیز مخلوقات کو مکمل طور پر سمجھنے کے لائق نہیں ہوئے ہیں اور نہ یہ اس کے آخری مقامات کو اپنے علمی احاطہ میں لانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ہاں وہ جس قدر زیادہ مطالعہ ومشاہدہ کرتے جاتے ہیں اسی قدران کی حیرت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اوراس جہان آفرنیش کی زیادہ سے زیادہ عظمت ان کی نگاہوں میں جلوہ افگن ہوتی جاتی ہے۔

اس تہ درتہ جہان میں وہ چھوٹی سی کہکشاں کہ جسے داخلی کہکشاں کا نام دیا گیا ہے، انسان اس کے تیسرے سیارے پر آباد ہے۔ تاہم وہ اس قدر باہوش ہے کہ اس سارے جہان کی حیران کن عظمت کا ادراک کرنے کی خواہش رکھتا ہے اوراس کے لئے ظاہر ہونے والی اشیاء بتارہی ہیں کہ وہ اپنی اس کوشش میں کسی حد تک کامیاب ہوا ہے۔ جو مسافتیں اور فاصلے ہم بتارہے ہیں وہ نوری سال کے حساب سے ہیں۔ اس کا حساب یوں کیا جاسکتا ہے کہ نور یعنی روشنی یکصد چھیاسی ہزار میل فی ثانیہ چلتی ہے جو تین لاکھ کیلومیٹر کے مساوی ہے، اس بیاد پر ایک نوری سال کا فاصلہ چھ ٹریلین میل بنتا ہے۔

تہ درتہ جہان

ان تہہ درتہہ جہانوں کے باہم اتنے زیادہ فاصلے ہیں کہ ہر فضائی طبقہ دوسرے کے اندر ایک چھوٹے سے داغ کی مانند شمار ہوتا ہے۔ مثلاً یہ نظام شمسی جو پہلی فضا شمار ہوتا ہے یہ دوسری فضا کے اندر خال سا معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسری فضا تیسری چوتھی فضا کے اندر............تا آخر۔

فضا نمبر 1 یعنی نظام شمسی: سورج ہمارا اس زمین سے آٹھ نوری منٹ یا نو کروڑ تیس لاکھ میل دور ہے اس کا عرض فقط نوری سال کا ہزارواں حصہ ہے۔

فضا نمبر ۲: نزدیک ترین ستارہ اس ستارے کا نام الفاسنٹری رکھا گیا ہے۔ یہ زمین سے ۳/ ۴ نوری سال کے فاصلے پر ہے۔ یعنی اگر ایک فضائی راکٹ دس لاکھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے حرکت کرے تو اسے اس ستارے تک پہنچے کے لئے تین ہزار سال تک پرواز کرنا ہوگی، حالانکہ یہ تو زمین کا سب سے قریب ترین ستارہ ہے۔

فضا نمبر ۳: داخلی کہکشاں ہماری یہ زمین میں کہکشاں کے اندر ہے وہ ایسے ظرف کی مثل ہے جو گیس اور غبار سے پر ہے، وہ ایک لاکھ نوری سال کے فاصلے پر ہے۔ اس کے دس کروڑ ستاروں میں سے زمین کا یہ سورج اور الفاسنٹری ستارہ سانپ کی کنڈلی کی مثل پیچ دار کہکشاں کے بیرونی کنارے پر ایک نورانی نقطے کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔

فضا نمبر ۴: نزدیک ترین کہکشاں: اس کہکشاں کا نام (اینڈرومدا) رکھا گیا ہے اور داخل کہکشاں سے اس کا فاصلہ

۲/۲ ملین نوری سال ہے۔اس کے باوجود ماہرین فلکیات اسے اس قدر نزدیک شمار کرتے ہیں کہ اسے داخلی کہکشاں کی بہن کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ بلکہ اسے ان داخلی کہکشاؤں کے گروہ ہی کا ایک حصہ شمار کرتے ہیں۔ (اینڈرومدا) بھی سانپ کی طرح پیچ دار شکل پر مشتمل ہے، اس کے کنارے پر نئے ستارے موجود ہیں اور اس کے اندرونی گنجان حصے کو جلے ہوئے پرانے ستاروں نے پر کر رکھا ہے۔

بعیدترین کہکشاں

فضا نمبر ۵: دورترین کہکشائیں: (کازاریں) یہ علم نجوم وفلکیات کے تازہ ترین اکتشافات میں سے ہیں، ان میں سے نزدیک ترین کہکشاں کو ''۱۳ ایکس ۲۔سی ۳'' کی علامت دی گئی ہے۔ یہ بیس لاکھ نوری سال کے فاصلے پر اور کہکشاں (۲۹۵۔سی ۳) پچاس لاکھ نوری سال کے فاصلے پر واقع ہے۔

اس حد تک پہنچنے پر بھی ماہرین فلکیات کا خیال ہے کہ وہ ابھی تک اس باعظمت جہان کے قابل دید کنارے کی راہ میں کھڑے ہیں اور دیگر نامعلوم فضاؤں کی دریافت کے لئے مزید کوششوں کی ضرورت ہے۔[1]

یہ مقالہ جو ماہرین کی تازہ ترین علمی تحقیقات کو بیان کر رہا ہے چند نکتوں پر مشتمل ہے کہ جن کی توضیح ضروری ہے۔ کیونکہ ہر نقطے کا واضح ہونا ہماری بحث کے کسی ایک حصے کی تائید کرتا اور نئی نسل کے اذہان کو اسلام کے قریب لانے میں مفید وموثر ثابت ہوتا ہے۔

فضائی طبقات

(۱) رسل کی کتاب سے نقل شدہ پہلے مقالے میں سائنس دانوں نے اس جہان افلاک کی عظمت وبزرگی کا حساب کہکشاں کی بنیا پر کیا اور اسی پر ان کے اندازے قائم ہوئے ہیں۔ اس مقالے میں بڑی صراحت سے کہا گیا ہے کہ آج تک تین کروڑ کہکشائیں دریافت ہو چکی ہیں اور شاید بہترین ٹیلی سکوپ میسر آنے پر کچھ مزید کہکشائیں بھی دریافت ہو جائیں۔

نامکشوف فضائیں

لیکن نیوز ویک میں مندرج مقالے میں عالم بالا کی عظمت وبزرگی کا حساب فضائی طبقات کی بنیاد پر ہے اور اسی کو اپنے قیاس کی واحد بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ مقالہ نویس کہتا ہے: دور حاضر کے سائنس دان پانچ فضاؤں کی دریافت تک پہنچ چکے ہیں اور انہوں نے اس فضا کی بعیدترین کہکشاں کا فاصلہ زمین سے چھ بلین نوری سال بتایا ہے۔ مقالے کے آخر میں وہ صراحت سے کہتا ہے کہ ماہرین نجوم معتقد ہیں کہ وہ ابھی تک جہان کے قابل دید کنارے پر راسے میں کھڑے ہیں اور ابھی دیگر نامکتنو ف فضاؤں کو

---

[1] مجلہ نیوز ویک ۲۵ مئی ۱۹۶۴ء

دریافت کرنا ضروری ہے۔

ستاروں سے آگے اور بھی جہان ہیں

ہم ابتداءِ سخن میں اشارہ کر چکے ہیں کہ دینی نقطۂ نگاہ سے ہم نہیں جانتے کہ سات آسمان کیا ہیں؟ اور کسی بھی مسلمان کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ قرآن شریف کی آیات اور کلام الٰہی کی تفسیر اپنی رائے سے کرے۔ یعنی وہ ان کی تعبیر ایسے ناپختہ نظریات اور متزلزل خیالات سے کرے کہ جو روز بروز تغیر پذیر ہیں۔

پس نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ دانشمند اور سائنس دان تا حال اس جہان کی شناخت سے عاجز رہے اور قرآن کریم کے پیرو بھی سات آسمانوں کی معرفت نہیں رکھتے، خلاصہ یہ کہ دونوں گروہ اس جہان آفرنیش کی مجموعی شناخت سے قاصر ہیں، اور ابھی تک انکی کوششیں نارسا ہیں، البتہ یہ فرق ضرور ہے کہ باایمان افراد سات آسمانوں کے وجود پر اس لئے عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس خالق کائنات نے ایسا ہی فرمایا ہے۔ دیگر سائنس دان اگرچہ سات آسمانوں کے وجود سے بے خبر ہیں، تاہم وہ ان کے وجود کی نفی نہیں لا سکے اور جو لاعلم و بے خبر ہو، اسے نفی کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔

پانچ کہکشاؤں کا گروہ

(۲) وہ جوان جو سات آسمانوں کے ذکر کو شک اور دودلی کی کیفیت سے سنتے ہیں، انکے اذہان کے تشفی کے لئے ہم یوں کہتے ہیں: اگر بالفرض نیوز ویک کا مقالہ نویس ایک مذہبی اور سات آسمانوں کا معتقد انسان ہوتا اور سوال کرنے والوں سے کہہ دیتا کہ باہمی امتیاز رکھنے والی پانچ کہکشاؤں کا جو گروہ تا حال دریافت کیا جا چکا ہے، ہم انکو پانچ آسمان سمجھ لیتے ہیں، اور ممکن ہے کہ آئندہ سو سال تک مزید اسے دو گروہ بھی دریافت ہو جائیں تو سات آسمان دریافت ہو جائیں گے۔ اگر بشر حسب معمول اپنی علمی و تحقیق مساعی کو جاری رکھتا ہے تو شاید پانچ سو سال بعد وہ کرسی کی دریافت تک بھی پہنچ جائے کہ تمام آسمانوں اور زمین پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اب آپ بتائیے کہ وہ معترض نیوز ویک کے اس مقالہ نویس کے جواب میں کیا کہہ سکتا ہے۔؟

ماریک مقامات

(۳) سائنس دان طاقتور ٹیلی سکوپوں کے ذریعے ان مقامات تک ترقی کر سکتے ہیں جو روشن ہیں اور وہ اس کے مطالعہ و تحقیق میں آ سکتے ہیں۔ اگر ان روشن مقامات کے پیچھے تاریک اور اندھیرے مقامات موجود ہوں تو واضح ہے کہ ہمارے ان محققین و ماہرین آ سکتے ہیں۔ اگر ان روشن مقامات کے پیچھے تاریک اور اندھیرے مقامات موجود ہوں تو واضح ہے کہ ہمارے ان محققین و ماہرین کے لئے ان کا مطالعہ و مشاہدہ ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نیوز ویک کے مقالے میں ''قابل رؤیت کنارہ'' قید کا تذکرہ ہوا ہے۔

قرآن مجید نے چند مقامات پر اس آسمان دنیا یعنی سات آسمانوں میں سے پہلے اور نزدیک ترین آسمان کے بارے

میں بات کی اور تصریح فرمائی کہ کہ خالق کائنات نے آسمان دنیا کو ایسے چمکدار ستاروں سے آراستہ فرمایا ہے جو نورانی چراغوں کی طرح روشن ہیں۔

فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ۭ وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ [1]

پھر اس نے سات آسمان کا نظام دو روز میں استوار فرمایا اور ہر آسمان کو اپنے فرمان ربوبیت کی وحی فرمائی اور ہم نے آسمان دنیا (سب سے قریبی آسمان) کو روشن چراغوں سے مزین کر دیا۔

روشن علاد

اب اگر کوئی (سات آسمان کیا ہیں؟) کے سوال کے جواب میں کہے۔آج تک انسان نہ فقط سات آسمانوں سے بے خبر ہے بلکہ وہ تو پہلے آسمان سے بھی صحیح طور پر آگاہ نہیں ہے۔ کیونکہ سائنس دانوں کا مطالعہ تو اس کائنات کے روشن حصے تک محدود ہے اور یہ آسمان دنیا ہے جو ستاروں اور روشن چراغوں سے آراستہ ہے۔لیکن انسان اپنی ترقی یافتہ سائنس کے ساتھ ابھی تک روشن اور ستاروں بھرے آسمان کے آخر نقطے تک بھی نہیں پہنچ سکا ہے۔اب آپ فرمایئے کہ وہ سائل محترم اس جواب کے بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں؟

کرسی و عرش کی عظمت

(۴) جیسا کہ پہلے اشارہ ہو چکا ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: تمام آسمان اور زمین کرسی کے مقابلے میں اس طرح ہیں جس طرح ایک انگشتر کا حلقہ کسی وسیع و عریض بیابان میں پڑا ہو۔ پھر کرسی بھی اپنی پوری بزرگی و عظمت کے ساتھ عرش کے مقابلے میں اسی طرح ہے جس طرح ایک وسیع و عریض بیابان میں ایک انگشتر کا حلقہ پڑا ہو۔

اب اس مضمون کا اپنے ذہن میں متصور کرنا کہ تمام آسمان و زمین کرسی کے عظیم و کبیر جرم کے اندر ایک انگشتر کے حلقے کی طرح ہیں۔ واضح ہے کہ یہ تصور انسان کے لئے سخت مشکل اور دشوار ہے، لیکن دور حاضر کے سائنس دانوں نے یہاں انگشتر کے حلقے کی بجائے ''خال'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔آپ نے نیوز ویک کے مقالے میں ملاحظہ فرمایا کہ یوں آیا ہے، یہ نظام شمسی جسے پہلی فضا سے موسوم کیا گیا ہے، دوسری فضا کے اندر ایک خال کی مانند قرار دیا جا سکتا ہے اور اسی طرح دوسری فضا تیسری فضا کے اندر............تا آخر......

اس بڑے کہکشانی مجموعے کو ایک خال یا ایک نقطہ نور سے تشبیہ دینا اس صدی کے ماہر سائنس دانوں کی مسلسل تحقیقات کا نتیجہ ہے، جب کہ حدیث میں اس کو ایک انگشتری کے حلقے سے تعبیر کیا گیا ہے۔اس سے ہمارے سامنے یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ

---

[1] سورۂ حم سجدہ آیت ۱۲

اسلام کے عظیم اولیاء وائمہ ہدیٰ آج سے چودہ سو سال قبل ان حقائق سے پوری طرح باخبر تھے کہ جن سے انسان بے خبر تھا۔ ہاں اس تاریکی وظلمات سے بھرے دور میں یہ بلند و بالا منزلیں انہیں وحی والہام کے نورانی چراغوں کے ذریعے حاصل ہوئیں (اورانہیں کے ذریعے وہ ان باریک حقائق تک پہنچے)۔

دوسرا سوال

سوال دوم یہ تھا کہ شب وروز آفتاب کے طلوع وغروب سے پیدا ہوتے ہیں اور کائنات کی تخلیق کے وقت طلوع وغروب نہ تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہ کیسے فرمادیا کہ میں نے آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں خلق کیا ہے۔

یوم اور نہار کا فرق

جواب: عربی زبان میں کلمہ ''یوم'' اور کلمہ ''نہار'' باہمی فرق رکھتے ہیں۔ کتاب تاج العروس میں ہے: ''النہار کسحاب اسم وہو ضد الیل'' نہار بروزن سحاب ایک اسم ہے جو لیل کی ضد ہے اسلئے فقط دن سے مختص ہے۔ لیکن کلمہ ''یوم'' لغت میں وسیع معنی کا حامل ہے۔

(من طلوع الشمس الى غروبها من طلوع الفجر الصادق الى غروب الشمس، من الطلوع الى الطلوع او من المغرب الى الغروب ولا يختص بالنهار دون اليل وستعمل بمعنى مطلق الزمان)

یوم کا وسیع معنی

یوم کا لفظ طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک کا وقت، طلوع صبح صادق سے غروب آفتاب تک کا وقت، طلوع سے طلوع تک کا وقت مغرب سے غروب تک کا وقت ہے۔

ان سب کے لئے لفظ ''یوم'' استعمال ہوتا رہتا ہے، ''یوم'' کو فقط دن کے لئے مختص نہیں کیا گیا۔ وہ ایسے وقت کے لئے استعمال ہوتا ہے جس میں رات بھی شامل ہوتی اور اس کے علاوہ لفظ ''یوم'' مطلقاً ''زمان'' کے لئے بھی استعمال کردیا جاتا ہے۔

قال علی علیه السلام۔ الدهر يومان۔ يوم لك ويوم عليك۔ فاذا كان لك فلا تبطر واذا كان عليك فاصبر [1]

امیر المومنین امام علی علیہ السلام کا ارشاد ہے: دنیا تیرے لئے دو روز ہے، ایک روز تمہارے نفع اور تمہارے میلانات کے

---

[1] نہج البلاغہ کلمہ ۳۹۰

مطابق ہے تو دوسرا روز تمہارے ضرر اور تمہاری خواہشات کے خلاف ہے۔ پس جو روز تمہارے نفع میں ہو اور خدائے تعالیٰ کی نعمتیں تمہیں میسر ہوں تو اس روز سرکشی طغیان، تکبر اور غرونہ کر اور جو روز تیرے ضرر میں ہو اور تو مصائب و مشکلات میں گرفتار ہو، اس روز صابر و بردبار رہ۔

ان الیوم عمل ولا حساب وغدا حساب ولا عمل[1]

فرمایا: آج عمل کا دن ہے اور حساب نہیں اور کل حساب ہے اور عمل نہیں ہوگا۔

حضرت علی علیہ السلام وہ شخصیت ہیں کہ آپ کا کلام عرب کے لئے مثال و نمونہ ہے۔ آپ جیسے فصیح و بلیغ فرد نے ان دونوں حدیثوں میں کلمہ ''یوم'' کو استعمال فرمایا ہے۔ پہلی حدیث میں ''یوم'' سے انسان کی زندگی کے دوران کا ایک حصہ مراد لیا ہے، ممکن ہے وہ تیس سال یا پچاس سال کا یا کم و بیش ہو۔ دوسری حدیث میں آپ نے پوری دنیا کی عمر کو کہ جو دار التکلیف ہے، اسے ایک ''یوم'' میں شمار کیا ہے۔

فارسی میں لفظ ''روز'' کا معنی

فارسی زبان میں بھی لفظ ''روز'' بہت وسیع معنی رکھتا ہے، کبھی ایک گھڑی یا ایک دن رات کیلئے بھی استعمال ہو جاتا ہے۔ کبھی ''روز'' کہہ کر ہم پوری زندگی مراد لے لیتے ہیں اور کبھی کئی صدیوں کے وقت کو بھی ''روز'' کہہ دیا جاتا ہے۔

مثلاً ایک ضعیف باپ اپنے چالیس سالہ فرزند کو جو لاابالی اور غیر ذمہ دار ہو یوں کہتا ہے: ایک روز تو بچہ تھا غلطیاں کرتا تھا تو میں کہتا تھا بچہ ہے۔ پھر ایک روز تو جوان تھا، برائیاں کرتا تھا تو میں کہتا تھا کہ جوانی کا تقاضا ہے۔ اب تو اس عمر میں آ کر بھی جو بری حرکتیں کرتا ہے تو بتا کہ اب کیا کہوں؟۔

تاریخ کا ایک استاد اپنی جماعت میں اپنے شاگردوں کے سامنے کسی ملک کی حکومت کی کیفیت واضح کرنا چاہتا ہے تو یوں کہتا ہے: فلاں مملکت ایک روز استبدادی نظام کے تحت چل رہی تھی اور اب وہ جمہوری نظام یا مشروطہ نظام کے تحت چل رہی ہے۔

اب یہاں ممکن ہے کہ اس کا استبدادی دور کئی ایک صدیوں پر مشتمل ہو کہ جسے ایک روز سے تعبیر کیا گیا ہے۔

فارسی زبان کا ایک شاعر اپنے اشعار میں لفظ ''یوم'' کو استعمال کرتا ہے اور ممکن ہے کہ اس کا معنی چند ماہ بعد یا چند سال ہو۔ وہ کہتا ہے۔

افسانہ حیات دو روزی نبود بیش
آن ہم کلیم باتو بگویم چساں گزشت
ایک روز صرف بستن دل شد بہ این و آن
روز دگر بہ کندن دل زین و آن گزشت

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۴۳

زندگی کا افسانہ دو روز سے زیادہ نہ تھا۔ اے میرے مخاطب! تجھے بتاؤں کہ وہ کس طرح گزر گیا، ایک روز تو اس چیز اور اس چیز سے دل لگانے میں صرف ہوا اور دوسرا روز اس چیز سے دل ہٹانے میں گزر گیا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ کلمۂ ''یوم'' عربی زبان میں اس قدر وسیع معانی رکھتا ہے کہ ممکن ہے اسے ایک گھنٹہ بھر وقت پر بولا جائے یا ایک دن، ایک سال اک ہزار سال ایک ملین سال بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت پر بولا جائے۔ یہ ان تمام اوقات کو اپنے اندر لینے کی صلاحیت رکھتا ہے اور ان سب پر علیحدہ علیحدہ بھی استعمال ہوسکتا ہے۔

ہم یقینی طور پر جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا حکم بے چون و چرا لازم الاجراء ہوتا ہے۔ وہ جو ارادہ بھی فرمائے، وہ بلا کم و کاست عمل میں آجاتا ہے۔

إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَآ أَرَدْنَٰهُ أَن نَّقُولَ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ ۝٤٠ [۱]

سوائے اس کے نہیں ہمارا کہنا کسی شئی کے لئے یہ ہے کہ جب ہم اس کے متعلق ارادہ کرتے ہیں کہ اسے کہیں ہو جا! تو وہ جاتی ہے۔

تدریجی تخلیق

اس امر کی بنیاد پر اگر خداوند تعالیٰ ارادہ فرماتا تو اس باعظمت جہان کو ایک لمحے میں بھی پیدا فرما سکتا تھا۔ لیکن اس نے اس طرح نہ چاہا اور اپنی حکیمانہ مصلحت سے یہ ارادہ فرمایا کہ آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں خلق فرمادے۔ پس جو کچھ اس کی مشیت میں گزرا وہی ہوا اور یہ جہان ہستی اسی کے مطابق آیا۔ البتہ ہم نہیں جانتے کہ یہ خلق فرمانے کا روز جو در اصل آفرینش کا ایک دورہ ہے، اس کی مقدار کتنی تھی؟ ہاں جب قرآن مجید نے اس کائنات کی خلقت کی مدت چھ روز بتائی ہے تو اس سے یہ ضرور سمجھ لیتے ہیں کہ یہ باعظمت جہان دفعتاً موجود نہیں ہوا۔ بلکہ اس کی خلقت تدریجی تھی، اس پر ایک مدت لگی اور یہ امر بھی قرآن مجید کے علمی اخبار میں سے ہے۔

روی عن امیر المومنین علیہ السلام: ولو شاء ان یخلقھا فی اقل من لح البصر لخلق ولکنہ جعل الانۃ والمداراۃ مثالا لامنئہو ایجابا باللحجۃ عا [۲]

الٰہی فیصلہ

حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ہے: اگر خدا چاہتا کہ اس جہان کو چشم زدن سے بھی کم وقت میں خلق فرمائے تو وہ ایسا کرسکتا تھا۔ لیکن اس نے ایسا نہ چاہا اور کائنات کو تدریجاً خلق فرمایا۔ پھر ایک طرف مخلوق میں اس تدریج کو اپنے امناء وحی اور نمائند

---

[۱] سورۂ نحل آیت ۴۰

[۲] بحار الانوار ج ۱۴ ص ۲

گان کے لئے مثال قرار دیا، تاکہ وہ معاشرے کے ایمانی اور اخلاقی افکار کو ترقی دینے میں مدارات اور ملائمت کی راہ اپنائیں اور کامیاب ہوسکیں۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے اس تدریج کو اپنی مخلوق پر حجت قاطع قرار دیا ہے، تاکہ جب وہ پوچھیں کہ اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو ایک لمحے میں مومن اور با اخلاق کیوں نہیں بنا دیتا؟ تو جواب میں کہا جائے کہ باری تعالیٰ کا قطعی فیصلہ ہے کہ تمام موجودات تدریجاً اپنے کمال کو پہنچیں، جس طرح کہ اس نے اس کاخ ہستی کو بھی چھ روز میں تدریجاً وجود بخشا اور مکمل کیا ہے۔

ماضی میں بعض افراد اپنے مخصوص مقاصد کے لئے قرآنی آیات اور اسلامی معارف سے آگاہی حاصل کئے بغیر اس چھ روز والے مسئلے کو اسلام پر اعتراض کی بنیاد بناتے اور اس سے غلط نتائج اخذ کرتے رہے ہیں۔ چونکہ مستقبل میں بھی ایسی حرکتوں کا تکرار ممکن ہے، اس لئے نیک نیت اوصاف دل مسلمان نوجوانوں کو ان لوگوں کے اعتراض سے پیدا ہونے والے شک اور دودل سے بچانے کے لئے ہم معترضین کی کتاب سے چند جملے نقل کرتے ہیں اور پھر ان کی تحقیق کرتے ہیں، تاکہ مطلب واضح ہو جائے اور نوجوانوں کے ایمان و یقین کے لئے مفید اور سودمند ثابت ہو۔

ایک معترض اپنی کتاب میں یوں رقمطراز ہے:

مادہ پرست مکتب کے لئے تو کائنات کی آفرینش کا مسئلہ صاف ہے، ہاں مادیون اور دیگر فلاسفہ کے درمیان اس دنیا کے وجود میں آنے کے بارے میں اتنا فرق ہے کہ مادہ پرست اس دنیا کو قدیم جانتے ہیں اور باقی سب فلاسفہ اس کو حادث سمجھتے ہیں، پھر ان میں سے ہر ایک اس کائنات کے خالق کو مختلف ناموں سے یاد کرتا ہے۔ ان کا اعتقاد ہے کہ یہ دنیا خداوند تعالیٰ کے توسط سے بہت تھوڑی مدت میں وجود میں آئی ہے، لیکن تمام موجودہ مذاہب کا عقیدہ ہے۔

خلق السموات والارض فی ستۃ ایام

اس نے آسمانوں اور زمین کو چھ یوم میں خلق فرمایا۔

جب معلوم اس حد تک ترقی کر گئے کہ مجہول حقیقتیں منکشف ہوگئیں اور دنیا کی شناخت کے وسائل مہیا ہو گئے ہیں، یعنی اقتصادی تکامل نے ان تمام مسائل کو بشر کے اختیار میں دے دیا ہے۔ پس دنیا کی پیدائش کا مسئلہ بھی خود بخود حل ہو گیا اور معلوم ہو چکا ہے کہ بشر آفرینش کا شاہکار ہے۔ علماء دین اس کو تخلیق کے چھٹے روز کی مخلوق سمجھتے ہیں، (یعنی یہ بشر خدا کے تھک جانے سے ایک روز قبل کی مخلوق ہے) اس بارے میں بھی سب کو علم ہے کہ یہ ایک خلئے کی تدریجی ترقی سے وجود میں آیا ہے کہ اس کا وجود بھی (شوآن) اور (شلایدن) کے توسط سے ظاہر ہوا ہے۔ نیز خود خلیہ بھی ایک خاص قسم کی کیمیاوی ترکیب رکھتا ہے کہ مقررہ شرائط کے تحت دباؤ اور حرارت کے توسط سے معین کیمیاوی خواص حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ انہیں خلیوں کے اجتماع سے اربوں سال کی مدت میں ضروریات اور شرائط کے مطابق تدریجی اور ناگہانی تغیرات ہوتے رہے۔ یوں اس کی کیفیات میں تبدیلی آتی رہی اور پھر منطقی (ڈیا لیکٹک) اصول کے مطابق یہ انسان وجود میں آ گیا۔

ایک عجیب نکتہ یہ ہے کہ بعض لوگ اس دقیق علمی نظریہ کو قبول کرنے سے انکاری ہیں جو وجود بشر کو ایک باریک طولانی تکامل

کا نتیجہ قرار دیتا اور خصوصی نظام کے تحت شمار کرتا ہے۔ البتہ اسی انسان کے ایک روز میں (فقط ایک روز میں) پیدا ہو جانے کو منطقی سمجھتے ہیں اور اس کا کاملاً صحیح خیال کرتے ہیں۔[۱]

کائنات کے قدیم ہونے کا مفروضہ

اس گفتگو کی ابتداء میں مقالہ نگار کا کہنا یہ ہے۔ مادہ پرستوں کے ہاں دنیا کی آفرینش کا مسئلہ واضح ہے کہ وہ دنیا کو قدیم جانتے ہیں، حالانکہ دیگر فلاسفہ دنیا کو حادث شمار کرتے ہیں۔

اگر چہ یہ بات نئی نہیں بلکہ یہ صدیوں سے کہی جاتی رہی اور ابتداء ہی سے الٰہی مکتب کے مقابلے میں مادی مکتب بھی موجود رہا ہے۔ لیکن مقالہ نگار جو خود بھی مادی مکتب کے حامیوں میں ہے، جیسا کہ اس کی تحریر سے ظاہر ہو رہا ہے، ہم اس سے یہ سوال کرتے ہیں کہ اس تحریر میں آپ نے جو لفظ ''دنیا'' استعمال کیا اور جسے آپ قدیم جانتے ہیں، اس دنیا سے آپ کی کیا مراد ہے؟ کیا اس کائنات کا مجموعہ مراد ہے۔ یا فقط اپنا یہ نظام شمسی مراد ہے؟ اس کے جواب میں آپ کے لئے ان دونوں میں سے ایک کا نام لینا ممکن نہیں ہے، کیونکہ اگر جرم آفتاب کا وزن اس طرح برقرار رہتا ہے کہ اس میں کمی یا بیشی نہیں ہوتی۔ وہ ماضی میں بے پناہ روشنی دیتا رہا ہے اور آئندہ بھی اسی طرح لامحدود روشنی دیتا رہے گا، اور یہ کہ دیگر تمام شمسی چاند اور اجرام فلکی بھی ازلی اور قدیم ہیں۔

ماضی میں جب انسان کی معلومات بہت پست تھیں، اس وقت بعض لوگ اسی طرح کا نظریہ پیش کرتے رہے ہیں۔ لیکن آج جب کہ علمی مدارج بڑی حد تک ترقی کر چکے ہیں اور انسان کائنات کی طبیعت اور اس کے تغیرات پر مطلع ہو چکا ہے۔ اب یہ باتیں کرنا ہرگز مناسب نہیں اور اب بشر کا کائنات کے اس ادارے کو ازلی وقدیم کہنا کسی طرح معقول بات نہیں ہے۔

کائنات کا حدوث زمانی

ماہر حیاتیات فرینک اولن کہتا ہے: قانون حرارت (ترموڈینامک) ثابت کرتا ہے کہ یہ کائنات مسلسل ایک ایسیکیشیت کی طرف رواں دواں ہے کہ اس میں سارے اجسام پست درجہ حرارت اختیار کرتے جائیں گے اور اس حد تک پہنچ جائیں گے کہ ان مس قابل مصرف توانائی نام کی کوئی چیز موجود نہیں رہے گی اور اس وقت زندگی ناممکن ہو جائے گی۔ لہٰذا اگر اس جہان کی کوئی ابتداء نہیں اور وہ ہمیشہ سے موجود ہے تو پھر ضروری ہے کہ اس سے پہلے موت اور سکوت کی یہ حالت اس میں حادث ہو چکی ہو۔ لیکن سورج کا جلانے والی دھوپ دینا، ستاروں کا موجود ہونا اور زمین کا زندگی کی گہما گہمی سے پر ہونا اس امر کا شاہد صادق ہے کہ اس جہان کی ایک مقررہ (وقت) پر ابتداء ہوئی اور زمانے کا وہی لحہ اس جہان کی پیدائش کا آغاز تھا۔[۲]

---

[۱] میٹریلزم تاریخی ص ۸۸

[۲] اثبات وجود خدا ص ۱۸

اگر مقالہ نویس کے ہاں لفظ ''دنیا'' سے مراد عالم کا مادہ ہو اور وہ کہے کہ اس کائنات کا وہ مادہ جس کو اس کائنات کی عمارت کے بنیادی خمیر کی حیثیت حاصل ہے وہ مادہ قدیم ازلی ہے تو یہاں دو بحثیں پیش آتی ہیں۔

اول: کیا علمی اعتبار سے مادے کا قدیم ہونا ممکن ہے یا نہیں؟

دوم: کیا ایک قدیم اور بے شعور مادہ اس حیرت انگیز اور عجیب وغریب نظام کو خلق وایجاد کر سکتا ہے یا نہیں؟

مادے کی فنا

ایک صاحب دانش نے ایک مقالے میں ان دو سوالوں کا جواب لکھا ہے اور ہم اسے من وعن نقل کئے دیتے ہیں:

ماہر کیمیا وریاضیات جان کلولنڈ کوثرن کہتا ہے: جب انرجی (نئے) مادے میں تبدیلی ہوتی ہے تو یہ تبدیلی قانون کے مطابق متحقق ہوتی ہے اور اس طرح جو مادہ وجود آتا ہے وہ انہیں قوانین کی پیروی کرتا ہے جن پر سابقہ مادے عمل کر رہے ہیں۔ علم کیمیا میں یہ امر ثابت ہوا ہے کہ ایک دن مادہ نابود ہو جاتا ہے۔ البتہ مادوں میں اس لحاظ سے فرق ہے کہ کچھ مادوں کی نابودی بے حد سست ہے جب کہ کچھ دوسرے مادے ایسے ہیں کہ ان کی نابودی بے حد تند وتیز ہے۔

بنابرایں معلوم ہوا کہ مادہ ازلی نہیں ہے اور اس لحاظ سے ایک وقت میں اس کا آغاز ہوا ہے۔ کیمیا اور دیگر علوم کے شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ یہ آغاز تدریجی نہ تھا، اس کے برخلاف مادے کی پیدائش ناگہانی طور پر ہوگئی تھی حتی کہ زمانی دلال تقریبی اندازے سے اس کی پیدائش کے وقت کا پتہ بھی دے سکتے ہیں۔ پس اس لحاظ سے اس مادی جہان کو ایک معین وقت میں پیدا کیا گیا اور یہ اسی وقت سے طبعی قوانین کا پابند رہا ہے۔ لہٰذا یہ جہان کسی تصادف اور اتفاقی سانحے کی پیداوار نہیں ہے۔

ایمان بہ خدا علم کی مجبوری ہے

چونکہ مادہ نہ تو اپنے آپ کو پیدا کر سکتا ہے اور نہ ہی اپنے اوپر جاری قوانین کا خلق ہو سکتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ عمل آفرنش کو کسی ایسے عامل کے ذریعے متحقق سمجھا جائے جو غیر مادی ہے۔ لہٰذا اگر صحیح فکر اور درست سوچ اختیار کی جائے تو علم آپ کو مجبور کر دیتا ہے کہ آپ خدا پر ایمان لے آئیں۔ [1]

گزشتہ مقالے میں اس کے لکھنے والے نے اس کے دوسرے حصے میں الٰہیون کے متعلق کہا تھا۔ (ان خدا پرستوں کا اعتقاد ہ کہ یہ دنیا خداوند تعالیٰ کے ذریعے تھوڑی سی مدت وجود میں آئی اور تمام موجودہ مذاہب یہی عقیدہ رکھتے ہیں کہ

خلق السموات والارض ستۃ ایام

---

[1] اثبات وجود خدا ص ۴۴

ایامِ تخلیق کا طول

ہم اس مقالہ نویس کے ساتھ فقط دین اسلام کے بارے میں بات کر رہے ہیں اور دیگر ادیان سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ قرآن مجید کے پیروکاروں کا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ اس امر پر قادر تھا کہ وہ اس جہان کو پلک جھپکنے سے بھی کم وقت میں خلق فرما دے، لیکن اس ذات قدیر نے ایسا کرنے کا ارادہ نہ فرمایا اور اسے چھ روز میں خلق فرمایا۔ ہم نے عربی زبان میں لفظ ''یوم'' کے معنی کی جو تشریح اور وضاحت کی ہے کہ اس لفظ میں ایک وسیع معنی کی گنجائش موجود ہے، اس لئے ہم ان چھ ایام کے متعلق پوری طرح آگاہ نہیں ہیں کہ ان سے وقت کی کتنی مقدار مراد لی گئی ہے۔ پس ہم نہیں سمجھ سکے کہ اس مقالہ نویسی نے اس مدت کو کس طرح ایک تھوڑی سی مدت سے تعبیر کر دیا ہے؟ حالانکہ بعض روایات میں جو مثال ذکر ہوئی ہے وہ تو اربوں سال پر حاوی نظر آتی ہے۔

روی عن امر المومنین علیه السلام: انه سئله عن مدة ما کان عرشه علی الماء قبل ان یخلق الارض والسماء فقال تحسن ان تحسب؟ فقال له نعم فقال لو ان لارض من المشرق الی المغرب ومن الارض ال السماء حب خردل ثم کلفت علی ضعفك ان تحمله حبة حبةً من المشرق الی المغرب حتی افنیتة لکان ربع عشر جزء من سبعین الف جزء من بقاء عرش ربنا علی الماء قبل ان یخلق الارض والساء ثم قال انما مثلت لك مثالا [1]

ایک شخص نے امیر المومنین امام علی علیہ السلام سے سوال کیا کہ آسمان و زمین کی خلقت سے قبل عرش خدا جو پانی پر رہا تو وہ کتنی مدت تھی؟ یعنی عرش الٰہی کتنی مدت پانی پر رہا؟ امام علی علیہ السلام نے جواب میں فرمایا: کہ تو اچھی طرح حساب کرنے پر قادر ہے؟ اس نے کہا جی ہاں: آپ نے فرمایا: اگر یہ زمین مشرق سے مغرب تک اور زمین سے آسمان تک رائی کے دانوں سے بھری ہوئی ہو اور تجھے اپنی ناتوانی و کمزوری کے باوجود زحمت دی جائے کہ ان دانوں کو ایک ایک دانہ کر کے کے مغرب کی طرف لے جاتا آنکہ سارے دانے ختم ہو جائیں تو اس حمل و نقل کی مدت اس مدت کے ستر ہزارویں حصے کا چالیسواں حصہ ہو گی کہ زمین و آسمان کی خلقت سے قبل جتنی مدت عرش الٰہی پانی پر رہا تھا۔ اس کے بعد فرمایا کہ میں نے محض اس مطلب کو سمجھانے کے لئے تیرے سامنے یہ ایک مثال پیش کی ہے۔

آج کل گنتی کے لئے بڑے بڑے ہندسے اور عدد وجود میں آچکے ہیں مثلاً ملین۔ بلین۔ ترلین۔ اور کا ترلین وغیرہ لیکن ان کے معلوم ہونے سے قبل جب کہ عربی فارسی اور دیگر زبانوں میں یہ اعداد وضع نہیں ہوئے تھے، بلکہ اب بھی یہ لفظ ان کی زبانوں میں نہیں ہیں، اس لئے وہ ان دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنی زبان میں استعمال کرتے ہیں۔ مگر پرانے زمانے میں ایسے

[1] تفسیر البرہان ج ا۔ ۲ ص ۲۷۴

بڑے بڑے اعداد کو سمجھانے کے لئے مثالوں ہی سے کام لیا جاتا تھا، جیسا کہ اس روایت میں امام علی علیہ السلام کے کلام میں رائی کے دانوں کی مثال سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ یا پھر متکلمین چند کلمات کو باہم مرکب کر لیتے تھے، تاکہ اس ترکیب سے اس بڑے عدد کی نشاندہی کر سکیں۔ بطور نمونہ ہم ایک اور مقام کا ذکر کئے دیتے ہیں۔

قال رسول الله (ص): ان موسی سئل ربه عزوجل ان یعرفونه بدء الدنیا منذ کم خلقت فاوحی الله تعالیٰ الی موسی تسئلنی عن غوامض علمی فقال: یا رب احب ان اعلم ذالك فقال: یاموسی خلقت الدنیا منذ مئة الف الف عام عشر مرات[1]

رسول اکرمؐ نے فرمایا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے درگاہ الٰہی میں دنیا کے آغاز کے بارے میں سوال کیا اور عرض کیا دنیا کو خلق ہوئے کتنی مدت گزر چکی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تو مجھ سے میرے علم کی مشکل امور کے بارے میں سوال کر رہا ہے۔ عرض کی پروردگار! مجھے اس امر کا جاننا مرغوب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے اس دنیا کو آج سے اتنا عرصہ قبل خلق کیا کہ تو ہزار کو ہزار سے ضرب دے کر پھر اسے سو کے ساتھ ضرب دے اور اس عمل کا دس بار تکرار کرے (صد ہزار ہزار سال دس مرتبہ) اس حاصل ضرب کے عدد کو آج کی اصطلاع میں ایک ملیارد (ایک ارب) کہا جاتا ہے۔

نیو یارک کی علمی اکیڈمی کا سربراہ کرسی موریسن کہتا ہے: احتمال ہے کہ آج سے ایک ملیارڈ سال قبل ہمارے اس کرہ زمین کے انقلاب اور طوفان تھمے ہوں اور اس کے نتیجے میں اس کرے کی سطح سخت ہوگئی اور دریا و ہوا وغیرہ جو آج اس میں دکھائی دے رہے ہیں، یہ سب اس طرح وجود میں آ گئے۔[2]

کرۂ زمین کی عمر

ملاحظہ کیجئے کہ چودہ سو سال قبل ہمارے عظیم پیشوا پیغمبر اسلامؐ نے وہی بات از راہ وحی بتائی ہے جو آج کے سائنس دان اپنی علمی تحقیقات کے ذریعے دریافت کرنے میں کامیاب ہوئے اور کہتے ہیں کہ اس کرۂ زمین کے اس موجود حالت میں آنے کا زمانہ تقریبا ایک ملیارڈ (ارب) سال ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ آج کل ایک بڑے عدد کو ایک لفظ ملیارڈ (ارب) سے بیان کیا جاتا ہے، لیکن چونکہ لغت عرب میں اس کے لئے کوئی ایک کلمہ وضع نہ ہوا تھا، اس لئے حدیث رسول اکرمؐ میں اسی عدد کو چار کلمات کی ترکیب کے ذریعہ بیان کیا گیا۔

گزشتہ معروضات سے دو نتیجے برآمد ہوئے:

---

[1] بحار الانوار ج ۱۴ ص ۸۱

[2] راز آفرینش انساں ص ۲۲

اول: یہ کہ خلقت آسمان وزمین کے چھ روز والے سوال کا جواب روشن ہوگیا اور معلوم ہوا کہ ''یوم'' کا لفظ عربی زبان میں وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ تا انیکہ امام علی علیہ السلام نے اس دار تکلیف کو کہ جس میں تمام نسلیں مکلف تھیں، ہیں اور ہوں گی اور ممکن ہے کہ اس دار کے آغاز سے انجام تک کی ساری مدت کئی ملین سال کے برابر بھی ہوجائے۔ تاہم حضرت نے اس دنیا کی پوری عمر کو ایک روز سے تعبیر کر دیا اور فرمایا ''ان الیوم عمل ولاحساب''، ہم نہیں جانتے کہ تخلیق دنیا کے چھ روز کی مدت کس قدر تھی؟ تاہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ ان چھ روز میں ہر ایک کی مدت کتنی ہی طولانی کیوں نہ ہو ''کلمہ یوم'' میں اس مدت کو بیان کرنے کی وسعت موجود ہے۔

دوم: دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ مقالہ نویس کو ''یوم'' کے لغوی معنی سے واقفیت نہیں اور نہ ہی اسے اسلامی روایات پر آگاہی حاصل ہے، اسی لئے وہ خود بخود فیصلہ دے رہا ہے کہ خدا پرستوں کا اعتقاد یہ ہے کہ ''یہ دنیا ایک تھوڑی سی مدت میں خدائے تعالیٰ کے توسط سے وجود میں آئی ہے'' (جب کہ حقیقت اس کے مطابق نہیں ہے)

یہی مقالہ نویس آگے چل کر لکھتا ہے: معلوم ہوا کہ بشر جسے آفرینش کا شاہکار کہتے ہیں اور علماء دین اس کو خلقت کے روز ششم خدا کے تھک جانے کے ایک روز قبل کی مخلوق مانتے ہیں، یہ بھی ایک خلیے کے تدریجی تکامل کا نتیجہ ہے۔ دینی مکتب کے نقطہ نگاہ سے انسان کی پیدائش۔ خلقت آدم کے ابتدائی مراحل اور ان پر گزرنے والی مدت وغیرہ سب امور ابھی تک ہمارے علم میں نہیں ہیں اور ہم نہیں جانتے کہ بشر کی پیدائش کا آغاز کیسے ہوا؟

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا: ہم نے انسان کو آسمانوں اور زمین کی تخلیق پر اسی طرح خود انسان کی تخلیق پر شاہد وحاضر نہیں بنایا اور انسان نہ تو اپنی آفرینش پر شاہد وناظر رہا اور نہ ہی اس جہان ہستی کی تخلیق پر شاید نظار رہا ہے۔

مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۖ [1]

متضاد علمی نظریے

علمی مکتب کے اعتبار سے بھی انسان کی خلقت کے بارے میں متضاد نظریے سامنے آئے اور گونا گوں آراء پیش کی گئی ہیں، ان کے بعد کوئی محقق خلقت بشر کے بارے میں کوئی یقینی بات کرنے کی کیفیت میں نہیں ہے۔

ایک زمانے میں ڈارون کا مفروضہ زبان زد عام وخاص تھا اور اسے ایک علمی اور قابل قبول نظریے کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ کالجوں کے نوجوانوں کو اس کا درس دیا جاتا تھا کہ آدمی بندر سے ترقی کرتا ہوا موجودہ صورت میں آیا ہے اور زندگی کے تمام اطوار زنجیر کے حلقے کیطرح باہم پیوستہ ہیں، البتہ ان میں سے بعض حلقے گم ہوگئے ہیں کہ جن کا کوئی نشان نہیں رہا ہے۔ لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرا کہ ڈارون کا یہی نظریہ مورد انتقاد قرار پانے لگا اور اس پر مختلف جہات سے اعتراضات ہوئے اور اس کے رد میں کتابیں لکھی گئیں۔

لی کنٹ دونوئی کہتا ہے: زندہ موجودات کی تاریخ میں ''حلقہ'' کا لفظ ایک خطرناک لفظ ہے، ہم اس کی تصدیق نہیں کر سکتے

---

[1] سورۂ کہف آیت ۵۱

کہ ایک معین شکل واقعی ایک حلقہ ہے۔ ممکن ہے کہ کہیں کہیں ایسا ہوا ہو،لیکن ہمیشہ ہی ایسا ہونا ضروری نہیں ہے، بہرصورت اظہار کیا جا سکتا ہے کہ زندہ موجودات میں کوئی ایک بھی مستقیماً کسی دیگر موجود کی پچھلی نسل نہیں اور نہ انسان بندر کی اولاد ہے۔ کیونکہ ممکن ہے ان کے درمیان فرضی نسلیں اور ان کی شکلیں جو کبھی موجود رہی ہوں اور انہیں ماحول سے سازگاری کے لئے وضع کر لیا گیا ہو۔ (ورنہ ان کی حقیقت کچھ بھی نہیں)[1]

پھر یہی ماہرین کچھ عرصہ تک زندگی کے خلیوں کی دو قسمیں (حیوانی ونباتی) بیان کرتے اور کہتے تھے کہ آدمی۔ حیوانی خلیوں سے بنا ہے، اس لئے یہ حیوانات کے گروہ میں آتا ہے۔

لیکن پھر ایک دن امریکا ترقی علوم کی انجمن کے زیر انتظام انڈیانا پولیس کے ادارے میں منعقدہ ایک کانفرنس میں ٹیکساس کے ایک زندگی شناسی کے ماہر استاد نے بیان دیا اور کہا بشر درحقیقت حیوان نہیں۔ بلکہ یہ ایک قسم کی نبات ہے۔ اس نے عالمانہ انداز میں کہا کہ انسان، نباتی خلیوں کے تکامل کے نتیجے میں وجود میں آیا ہے کہ زرد آلک اور سرخ جلبک اس کے اجداد ہیں۔[2]

بشر ایک ناشناختہ مخلوق

خلاصہ یہ کہ انسان کی آفرینش اور اس کے آغاز کی کیفیت دینی اور علمی نظر میں ابھی تک ناشناختہ اور مجہول ہے اور ہم اس کے متعلق بحث نہیں کر سکتے۔ البتہ مذکورہ مقالہ نویس نے جو جملہ لکھا کہ ”علماء دین بشر کو روز ششم کی مخلوق مانتے ہیں“ اس پر کچھ گفتگو کریں گے۔

مخلوقات قبل از انسان

روایات سے یہ صریح نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ کرۂ ارض زمین بڑے طویل عرصے تک غیر آباد اور غیر مسکون رہا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے زندہ حوادث کو خلق فرمایا اور آدم کو پیدا کرنے سے قبل نباتات اور حیوانات کو زمین میں پیدا کیا۔ اسی طرح قبل از آدم اس زمین میں کچھ اس ایسی مخلوقات بھی پیدا ہوئی ہیں جنہوں نے فساد اور خون ریزیاں کیں۔

عن هشام بن سالم قال قال ابو عبدالله عليه السلام: وما علم الملائكة بقولهم (تجعل فيها من يفسد فيها ويسفك الدماء) لو لا انهم كانو ار او امن يفسد فيها ويسفك الدماء[3]

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: اگر ملائکہ نے دیکھا نہ ہوتا کہ قبل از خلقت آدم کچھ موجودات زمین میں ایسی رہی تھیں

---

[1] سرنوشت بشر ص ۱۱۵

[2] اثبات وجود خدا ص ۸

[3] بحار الانوار ج ۵ ص ۳۱

جوفساد کرتے تھے اور خونریزی کرتے تھے۔تو وہ کیونکر یہ سمجھ سکتے اور درگاہ الٰہی میں یہ کہتے۔''کیا تو نے یہ ارادہ فرمایا ہے کہ ان کو زمین میں بسائے جوفساد کریں اور خون بہائیں؟''

بشر کا آخری مخلوق ہونا

بنابریں اگر یہ بات ''کہ انسان روز خلقت کی آخری مخلوق ہے'' منابع وحی الہام کے ہاں سے آئے ہو تو پھر اسے علمی اخبار کے شمار میں لانا چاہیے۔اس کا معنی یہ ہے کہ بشر آفرینش کے دورہ کی آخری مخلوق ہے جو دیگر زندہ موجودات اور نباتات اور حیوانات کے بعد آخر میں پیدا ہوئی اور اپنے زمان پیدائش کے اعتبار سے زندہ موجودات کی آخری صف میں قرار پاتی ہے۔

دور حاضر کے سائنس دان بھی مطالعہ وتحقیق کے بعد اسی نتیجے پر پہنچے ہیں جو آج سے چودہ صدیاں قبل اسلام کے اولیاء کرام نے وحی الہام کے راستے بتایا تھا۔

اگر ہم زمین کی پوری عمر کا دور ایک سال فرض کرلیں تو اس میں سے آٹھ ماہ اسطرح گزر گئے کہ اس پر کوئی زندہ موجود نہ تھا اورنویں اور دسویں ماہ وائرس کی قسم سے پہلا زندہ موجود (ایک باکٹری خلئے) کی قبیل سے وجود میں آیا، پھر دسمبر (سال کے آخری مہینے) کے دوسرے ہفتے میں پستاندار مخلوق نمودار ہوئی اور دسمبر کی اکتیس تاریخ کورات کے گیارہ بج کر پینتالیس منٹ پر (اختتام سال سے پندرہ منٹ قبل) انسان نے میدان حیات میں قدم رکھا۔انسان کا یہ تاریخی دورہ سال کے آخری سیکنڈ ہیں۔[1]

خدائے تعالیٰ نقائص سے پاک ہے

مقالہ نویس علماء دین کے قول کے بارکہتا ہے کہ ان کے نزدیک۔بشر خدا کے تھک بیٹھنے سے ایک دن قبل پیدا کیا گیا ہے۔اگر اس کو توحید قران پر معمولی سی اطلاع بھی حاصل ہوتی تو وہ علماء اسلام سے یہ نسبت نہ دیتا۔کیونکہ تھکاوٹ زندہ مادی موجودات کے عوارض میں سے ہے کہ جن کے قویٰ محدود ہیں، وہ کثرت کار سے خستہ ہو جاتے ہیں اور خواب و استراحت کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔لیکن جہاں تک خدائے تعالیٰ کی ذات اقدس کا تعلق ہے تو وہ تمام مادی نقائص سے پاک و پاکیز ہے اور اس کے جرم قدس میں خستگی وناتوانی یا کوئی کمزوری داخل نہیں ہوسکتی۔

امام علی علیہ السلام چودہ صدیاں قبل اپنی مدلل اور عمیق تقریروں میں توحید اسلامی اور صفات باری تعالیٰ کے بارے میں گفتگوفرما گئے ہیں۔آپ نے ذات اقدس الٰہی کو تمام مادی نقائص سے پاک پاکیزہ قرار دیا۔چونکہ خستگی۔کمزوری اور تھکاوٹ وغیرہ بھی انہیں نقائص میں سے ہیں،اس لئے ذات الٰہی ان سے منزہ مبریٰ ہے آپ نے فرمایا:

---

[1] امید ہای نوص ۲۳

لم یتکادہ صنع شیئی منہا اذصنعہ ولم یثودہ منہا خلق ما براہ وخلقہ [1]

ان مخلوقات میں سے کسی شئی کا ایجاد کرنا اللہ تعالیٰ کے لئے دشوار نہ تھا اور ان اشیاء کا خلق کرنا اللہ تعالیٰ کی تھکاوٹ اور ناتوانی کا موجب نہیں بن سکا۔

مقالہ نویس تو اس حد تک لکھ گیا ہے:

تعجب انگیز بات یہ ہے کہ بعض لوگ اس دقیق اور علمی نظریئے کو قبول کرنے سے انکاری ہیں کہ وجود بشر ایک دقیق اور مرحلہ وار طولانی تکامل کے نتیجے میں بنا ہے۔لیکن وہ اس کے ایک روز (فقط ایک روز) میں پیدا کردئے جانے کو منطقی اور کاملا صحیح تسلیم کرتے ہیں۔

اگر لفظ ''یوم'' کی گزشتہ وضاحت پر نظر ہو کہ وہ اپنے اندر لغت عرب میں وسعت رکھتا ہے اور مطلق زمان کے معنی میں آتا ہے۔اس لئے ایک بہت بڑے زمانے کو لفظ یوم سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔پھر روایات اسلامی کی یہ تصریح بھی سامنے موجود ہے کہ آدم کی خلقت کے ابتدائی مراحل ایک بہت طولانی مدت میں انجام پائے اور وہ بھی تدریجی انداز سے تکمیل کو پہنچے۔اس لئے مجھے سمجھ نہیں آتی کہ پھر مقالہ نویس اس وضاحت کے بعد کس طرح یہ لکھتا دکھائی دیتا ہے کہ ایک روز (فقط ایک روز) میں خلقت آدم ہوئی۔نہ معلوم اس نے یہ بات کہاں سے لی ہے؟

کرسی ایک وسیع افلاکی جرم

سات آسمانوں اور زمین کی چھ روز میں پیدائش کے بارے میں جس قدر وضاحت مناسب تھی وہ عرض کی جا چکی ہے۔لہٰذا اب ہم دوبارہ اصلی بحث کی طرف واپس آتے ہیں کہ اسلامی روایات کے مطابق کرسی ایک ایسے بڑے افلاکی جرم کا نام ہے کہ جس میں تمام آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر سما لینے کی گنجائش موجود ہے۔اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں فرمایا:

وسع کرسیہ السموات والارض

عن زرارۃ بن اعین قال: سئلت ابا عبداللہ علیہ السلام عن قول اللہ عزوجل (وسع کرسیہ السموات ولارض) السموات والارض وسعن الکرسی والکرسی وسع السموات والارض؟ فقال: ان کل شیئی فی الکرسی [2]

زرارہ بن اعین نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیت الکرسی کے اس جملے کے بارے میں سوال کیا کہ آیا آسمانوں اور زمین نے کرسی کو گھیرا ہوا ہے یا کرسی نے آسمانوں اوز مین کو اپنے اندر لیا ہے؟ آپ نے فرمایا: تمام اشیاء کرسی کے اندر ہیں

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۲۲۸

[2] الکافی ج ۱ ص ۱۳۲

یعنی کرسی میں تمام آسمانوں اورزمین کواپنے اندر سما لیتے کی گنجائش موجود ہے۔

کرسی کا تیسرا معنی تسلط الٰہی

کرسی کا معنی سوم:۔مفسرین نے اس مقام پر لفظ کرسی کا ایک اور معنی بھی ذکر فرمایا ہے کہ اس آیت میں کرسی سے مراد ذات اقدس الٰہی کی سلطنت اور قدرت ہے۔

وثالثها ان لامراد بالکرسی ههنا الملك والسلطان والقدرة ککم کما یقالاا جعل لهذا الحائط کرسیا ای عمادا یعمد به حی لا یقع ولا یمیل فیکون معناه احاطه قدرته السموات والارض وما فیها[1]

تیسرا معنی یہ ہے کہ کرسی سے مراد وہ تسلط وحکومت خداوندی ہے جو اللہ تعالیٰ کو اس جہان ہستی پر حاصل ہے۔عربی زبان میں اس ستون اور سہارے کو بھی کرسی کہتے ہیں جو کسی دیوار کو گرنے اور ٹیڑھا ہونے سے بچانے کے لئے اس کی تکیہ گاہ کے طور پر بنایا جاتا ہے۔ بنابریں آیت کا معنی یہ بنے گا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت تمام آسمانوں اور زمین کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور اس نے انہیں سہارا دے رکھا ہے۔

حکومت خداوندی

جب ہم ''کرسی'' کو اللہ تعالیٰ کی سلطنت وقدرت کے معنی میں لے لیں تو آیت کے اس جملے کا سابقہ جملوں سے ربط کچھ اس طرح بنے گا کہ خداوند تعالیٰ نے ''لہ مافی السموات فی الارض'' کے الفاظ سے یہ فرمایا کہ میری مالکیت تمام سمادی اور ارضی اشیاء کو حاوی ہے۔''یعلم ما بین ایدیہم وما خلفہم'' سے واضح کیا کہ میرا علم تمام موجودات عالم کو شامل اور ہر طرح سے جامع اور کامل ہے۔ پھر ''وسع کرسیہ السموات والارض'' کے ذریعے لوگوں کو سمجھایا کہ نہ فقط یہ کہ خداوند تعالیٰ پورے جہان کا مالک ہے اور اپنی مملوکات کے تمام اوضاع واحوال سے آگاہ ہے بلکہ وہ اس پورے کاخ وجود وہستی اور آسمانوں کی تمام موجودات واشیاء پر پوری طرح قادر ہے، سارا جہان رب العالمین کی سلطنت اور قبضے میں ہے اور تمام ذرات کائنات پر اس کی حکمرانی، فرماں روائی اور حکومت قائم ہے۔

کائنات اور اس کو پیدا کرنے والا ارادہ

اس ذات اقدس نے اس باعظمت جہان کو پیدا کیا، اس کے لئے قواعد وضوابط اور قوانین تکوینی معین فرمائے۔ پھر اس جہان ہستی کو اس راہ پر چلا دیا جس پر چلانے کا اس نے ارادہ فرمایا تھا۔ یاد رہے کہ عالم ہستی کا مادہ اور اس کے تمام قوانین تکوینی اب بھی اسی

---

[1] مجمع البیان ج ا۔ ۲ ص ۳۶۲

کے اپنے قبضے قدرت میں ہیں اور تمام اشیاء بلا قید وشرط اس کے مطیع وفرماں برادر ہیں۔

بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ۝۱۱۶ [1]

تمام سماوی وارضی موجودات اس کی ملکیت ہیں اور سارے ہی بال قید وشرط اس کے مطیع اور اس درگاہ مقدس کے سامنے مطیع وخاضع ہیں۔

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا۝۱۳۳ [2]

اے لوگو! اللہ تعالیٰ کی سلطنت وقدرت اس قدر وسیع ومسلط ہے اور اس کا فرمان اس حد تک مانا جاتا ہے کہ اگر وہ چاہے کہ تم سب کو چلتا کرے اور تمہاری جگہ دوسرے لوگوں کو لے آئے تو وہ ذات اس پر بھی قادر ہے۔

خداوند تعالیٰ کی فرمانروائی

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی مطلق سلطنت اور زبردست حکومت کے بارے میں متعدد آیات موجود ہیں اور ان سب میں جامع ترین یہ دو جملے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ۝۱ [3]

اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ۝۱۴ [4]

اللہ تعالیٰ جو چاہے حکم دے۔

اللہ تعالیٰ جو چاہے کرے۔

اللہ تعالیٰ کی ازلی وابدی قدرت

مخفی نہ رہے کہ باری تعالیٰ کی سلطنت وقدرت بھی اس ذات مقدس کی دیگر تمام صفات کی طرح ازلی۔ ابدی اور لامحدود ہے۔ اس کی قدرت کا کسی مخلوق کی قدرت وتوانائی پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، اس لئے کہ مخلوق کے پاس جو کمال ہے وہ اکتسابی اور محدود ہے۔

جب کہ اس ذات اقدس الٰہی کا کمال عین ذات اور لامحدود ہے۔

---

[1] سورۂ بقرہ آیت ۱۱۶

[2] سورۂ نساء آیت ۱۳۳

[3] سورۂ مائدہ آیت ۱

[4] سورۂ حج آیت ۱۴

قال علی علیہ السلام: کل قوی غیرہ ضعیف وکل ملك غیرہ مملوك وکل عالم غیرہ متعلم وکل قادر غیرہ بقدر ویعجز [۱]

صفات الٰہی کی برتری

امام علی السلام نے فرمایا: اللہ تعالی کے علاوہ ہر قوی وتوانا ناتواں وضعیف ہے اور اس کے علاوہ ہر مالک مملوک ہے۔ پروردگار کے علاوہ ہر عالم، متعلم ہے اور خداوند تعالیٰ کے علاوہ ہر قادر قدرت وعجز کا مجموعہ ہے۔

وہ فقط خداوند تعالیٰ ہے جو قوی مطلق، کائنات کا واقعی مالک۔ عالم بدون تعلم اور قادر بدون عجز ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو لا محدود سلطنت وحکومت کا مالک ہے اور اس کی ازلی وابدی قدرت نے تمام آسمانوں، زمین اور ہر شے کا احاطہ کیا ہوا ہے۔

---

[۱] نہج البلاغہ خطبہ ٦٤

دسویں تقریر

کائنات کا محافظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال اللہ العظیم فی کتابہ

وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ﴿٢٥٥﴾ [1]

کائنات کی حفاظت

آسمان اور زمین کی حفاظت (اور اب باعظمت کائنات کی نگرانی) اللہ تعالیٰ کے لئے تھکاوٹ لانے (اور خستگی پیدا کرنے) کا باعث نہیں بنتی۔ کیونکہ وہ ذات اقدس الٰہی (تمام مادی نقائص سے) بلندتر اور (ہر عجز و ناتوانی سے) بزرگ تر ہے۔

''قیوم'' کی تشریح میں ہم نے بتایا تھا کہ اس کے معانی میں سے ایک معنی یہ ہے۔

القیوم ھو الاقائم بنفسه مطلقا لا بغیره وھو مع ذالك قیوم به کل موجود

وہ ذات اقدس الٰہی اپنے تمام صفات کمال کے ساتھ بذات خود قائم ہے اور وہ کسی غیر کی طرف معمولی احتیاج بھی نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس تمام موجودات عالم اور پورا جہان ہستی اس ذات مقدس کے سہارے قائم اور برپا ہے۔

چونکہ امکان تھا کہ اس آیت کریمہ کے سامعین اللہ تعالیٰ کی حیات کو بھی اس طرح تصور کرنے لگیں کہ خداوند ''حی'' کے لئے ممکن نہیں کہ وہ ہمیشہ کے لئے ''قیوم'' رہے۔ کیونکہ ہر زندہ قطعی طور پر خواب و استراحت کی احتیاج رکھتا ہے۔ جب کسی کو نیند آجاتی ہے تو وہ غافل ہوجاتا ہے اور اپنی حفاظت کے قابل بھی نہیں رہتا، چہ جائیکہ وہ دیگر افراد کی حفاظت کر سکے۔

نقائص سے مبریٰ ذات

پس قبل اس کے کہ لوگوں کے اذہان میں یہ تصور آئے اور رسول اکرمؐ سے اس قسم کا کوئی سوال کریں اور جواب کی درخواست کریں۔ اللہ تعالیٰ نے ''لا تاخذہ سنۃ ولا نوم'' کے جملے سے ان سوالوں کا راستہ بند کردیا، قطعی جواب پیش کردیا اور فرمایا کہ اونگھ اور نیند اس ذات قدسی پر غلبہ حاصل نہیں کرسکتیں ''فی الواقع اللہ تعالیٰ اس جملے کے ذریعے یہ بتانا چاہتا ہے کہ خالق کی زندگی کو مخلوق کی زندگی پر

---

[1] سورۂ بقرہ آیت ۲۵۵

قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ نیند۔ اونگھ اور ایسی چیزیں مخلوق کی زندگی کے عوارض سے منزہ اور مبرا ی ذات ہے۔

یہ جملہ "ولا یودہ حفظہما" جواب ہماری بحث کا مورد ہے، یہ بھی "تاخذہ سنۃ ولانوم" کی مثل ہے۔ کیونکہ کرسی کا تیسرا معنی یہ تھا:

المراد بالکرسی ھیھنا الملك و السلطان و القدرۃ فیکون معناہ احاطہ قدرتہ بالسموات والارض وما فیھا.

یہاں کرسی سے مراد حکومت، سلطنت اور قدرت ہے۔ لہٰذا معنی یہ بنے گا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت آسمانوں، زمین اور ان میں پائی جانے والی تمام اشیاء کو حاوی ہے۔

یہاں ممکن تھا کہ اس آیت کے سامعین عالم کائنات پر حاصل قدرت وسلطنت الٰہی کو اپنی قدرت وسلطنت پر قیاس کرنے لگیں جو انہیں اپنے گھر۔ زندگی اور اموال وغیرہ پر حال ہے۔ اور رسول اکرمؐ سے یہ لگنے لگیں۔ ہم تو محنت اور کوشش کرتے کرتے تھک جاتے ہیں اور اس سے ہماری حاکمیت کی قدرت کمزور پڑ جاتی ہے۔ کیا خالق کائنات بھی اس جہان کی حفاظت کے کام اور اس میں اپنی قدرت کے استعمال کرنے سے تھک جاتا ہے یا نہیں؟

تھکن کا عارضہ

قبل اس کے کہ پیغمبر اکرمؐ کی بارگاہ میں ایسا سوال پیش کیا جائے، اللہ تعالیٰ نے "**ولا یودہ حفظھما**" کے جملے سے اس سوال کا جواب دے دیا اور صراحت کردی کہ پروردگار عالم اس جہان کی حفاظت کرنے سے کبھی نہیں تھکتا۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ نے اس سوال کا جواب دے دیا اور صراحت کردی کہ پروردگار عالم اس جہان کی حفاظت کرنے سے کبھی نہیں تھکتا۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ اس جملے کے ذریعے یہ واضح فرمانا چاہتا ہے کہ لوگوں کو خالق کی لامحدود قدرت کا قیاس لامحدود قدرت کا قیاس مخلوق کی قدرت کے ساتھ نہیں کرنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی طرح سمجھنے لگیں۔ کیونکہ تھکاوٹ۔ کمزوری وغیرہ مادی قوت کے عوارض ہیں، جبکہ خداوند تعالیٰ تمام مادی نقائص سے منزہ و مبریٰ ہے۔

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ [1]

قوائے جسمانی کی محدودیت

علمی مسائل میں سے ایک مسئلہ جو کے فلاسفہ کے ہاں مورد قبول تھا اور دور حاضر کے محققین بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ تمام مادی طاقتیں اور مادے سے نکلنے والی تمام توانائیاں محدود ہیں اور ایک معین مقدار رکھتی ہیں۔ کوئی مادی وجود جس قدر بھی قوی وطاقتور کیوں نہ ہو، بہرحال غیر محدود تاثیر کا مالک نہیں ہوسکتا (بالآخر اس کی ایک حد ضرور ہوتی ہے) بوعلی سینا کہتے ہیں۔

---

[1] سورۂ شوریٰ آیت ۱۱

علم انه لا یجوز ان یکون جسم ذوقوة غیر متناهیة یحرك جسما غیره[1]
ناممکن ہے کہ کوئی جسم لامحدوداور غیر متناہی قوت اور توانائی کا مالک ہو اور کسی دوسرے وجود کو لامحدود حد تک تحریک دیتا رہے۔
حکیم سبزواری کہتے ہیں:

قد انتهى تأثير ذات مدة
في مدة وعدة وشدة[2]

ہر عمل جو قائم بالمادۃ ہو وہ تاثیر کے وقت۔ تاثیر کی شدت کے لحاظ سے محدود و متناہی ہوتا ہے۔
آج کی دنیا میں ہر مادی وجود سے حاصل کی جانے والی توانائی کی مقدار کا تعین کیا جاچکا ہے اور اس کی مقدار کی حدود معین ہو چکی ہیں۔ جہاں جہاں اس مادی وجود کی تحقیقی مدار کا تعین ہو چکا ہوتا ہے، وہاں اس سے حاصل ہو سکنے والی توانائی کی مقدار کا بھی یقینی اندازہ ہوجاتا ہے۔ البتہ جہاں مدہ کی حقیقی مقدار کا صحیح تعین نہیں ہوسکتا وہاں اس کی موجودہ مقدار کا تقریباً اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور پھر اس سے حاصل ہوسکنے والی قوت کا بھی اندازہ لگایا جاتا ہے۔ بہر حال یہ ایک قطعی بات ہے کہ محدود مادی وجود کبھی بھی لامحدود توانائی کا ماخذ نہیں ہوسکتا۔

مادی موجودات کی توانائی

ایک لیٹر پٹرول ایک معین مقدار ہے تو اس سے پیدا ہونے والی قوت بھی معین ہے۔ لیکن اگر کسی تیل کے علاقے میں زیر زمین پائی جانے والی گیس کی مقدار دقیق طور پر معلوم نہیں ہوتی تو اس ذخیرے سے حاصل کی جاسکنے والی توانائی کا بھی صحیح اور یقینی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ لیکن یہ مسلم بات ہے کہ کرۂ زمین اور اس کا وہ قطعہ بھی محدود ہے جہاں یہ گیس پائی گئی ہے۔ لہٰذا وہاں پائی جانے والی گیس کی مقدار بھی حتماً محدود ہے اور ایک دن ختم ہوجائے گی۔ پس اس سے جو قوت حاصل ہوگی اسے بھی محدود سمجھنا ہوگا اور وہ بھی ایک دن ضرور ختم ہوجائے گی۔

خورشید کی قوت

کرۂ خورشید کروڑوں سال سے لگاتار جوش کھا رہا ہے اور اپنی عظیم قوت کو اس فضائے بے کراں میں تقسیم کر رہا ہے۔ اس ناقابل تصور توانائی میں سے ایک معمولی سی مقدار کرہ زمین کے نصیب میں بھی آجاتی ہے۔ اس ناچیز مقدار کا نتیجہ ہے کہ زمین میں پائی جانے والی اشیاء اپنی زندگی باقی رکھے اور اپنا سفر جاری رکھے رہتی ہے۔

---

[1] اشارات بوعلی سیناء نمط ۶
[2] شرح منظومہ سبزواری ص ۱۲۶

اگر سورج کی قوت کا مقائسہ کیا جائے تو یہ ایک ایسے جرم کی قوت کے مساوی ہے جو ۲ / ۴ ملین ٹن فی سیکنڈ کی مقدار رکھتا ہو۔ جبکہ پورے ملک فرانس میں سال بھر میں جس قدر بجلی خرچ ہوتی ہے، وہ آدھے کیلوگرام جرم کی توانائی کے مساوی ہے۔اس لحاظ سے اگر پورا کرۂ زمین فرانس کے معیار کے برابر بجلی خرچ کرے تو اسے کرۂ آفتاب سے فقط دوسکینڈ کے برابر قوت حاصل کر لینا کافی ہو جائے گا۔جبکہ آفتاب سے کرۂ زمین تک پہنچ جانے واقی قوت اس سے خارج ہونے والی قوت کا انتہائی معمولی حصہ ہے (جو ایک ارب حصوں میں سے ایک آدھے حصے سے بھی کمتر ہے)۔ یادرہنا چاہئے کہ اس نظام شمسی کے دیگر سیارے اور چاند۔سورج سے نکلی ہوئی قوت میں سے ایک بٹے پانچ ہزارواں حصہ حاصل کرتے ہیں۔ بقیہ ساری قوت فضا میں پھیل جاتی ہے۔اور ہم تو فقط اس سخاوت کی قصیدہ خوانی ہی کر سکتے ہیں۔[۱]

انسان اور آفتاب

یہ آفتاب ہمیشہ سے اپنی درخشندگی اور روشنی کے فروغ کی وجہ سے انسان کے تمام طبقات کی توجہ کا مرکز بنا رہا ہے اور وہ اس بارے میں غلط صحیح ہر قسم کی باتیں کرتے رہے ہیں بعض لوگ علمی نظریئے کے عنوان سے اس کے بارے میں باطل نظریات پیش کرتے ،بعض اسے قابل عبادت قرار دیتے اور اس کی پوجا کرتے رہتے ہیں۔

گزشتہ دوصدیوں میں علم وصنعت کی ترقی ہوئی اور کائنات کی شناخت میں بڑی بڑی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔اب بہت سے مجہول حقائق معلوم ہو گئے تو ان میں آفتاب کی وسعت اور اس کے وزن کا اندازہ بھی لگا لیا گیا۔اس سے انہوں نے اس کی تقریبی عمر کا اندازہ لگایا تو معلوم ہوا کہ یہ کرۂ خورشید ازلی اور ابدی نہیں ہے۔ بلکہ یہ کرات سماوی میں سے ایک ہے جو ایک دن وجود میں آیا اور ایک دن ختم بھی ہو جائے گا۔اس کے علاوہ اس سے بڑے بڑے اور اس سے زیادہ روشن کئی سورج بھی اس کائنات کی فضاؤں میں موجود ہیں۔

سائنس دانوں کی نظر میں بعض مطالب زیادہ قابل توجہ اور قابل تحقیق قرار پائے اور وہ یہ جاننے کی کوشش کرنے لگے کہ یہ عظیم اور حیرت انگیز توانائی کیونکر پیدا ہو رہی ہے؟اس خیرہ کر دینے والے نور کا اصلی منبع کہاں ہے؟اس توانائی کے ذخیرے کتنی مدت تک اپنی موجودہ کیفیت کے مطابق چل سکتے ہیں؟اور علمی طور پر اس کرۂ آفتاب کے متعلق کن تغیرات کی پیش بینی کی جاسکتی ہے؟

سورج کی قوت کے مرکزی سرچشمے کی شناخت کے بارے میں ان سائنس دانوں نے تحقیق وجستجو کی تو انہوں نے اس بارے میں مختلف نظریات پیش کیے۔ہم ان میں سے چند ایک کا تذکرہ کئے دیتے ہیں۔ان میں سے کچھ نظریات کو تو اکثر دانشمندان نے قبول بھی کر لیا تھا،لیکن وقت گزرنے اور مزید تحقیق ہونے کے باعث یہ سب نظریات مسترد کر دیئے گئے۔

---

[۱] چہ میدانم؟زندگی ومرگ ستارگان ص ۴۔۷

مستر د نظریات

ا۔ کیمیاوی قوت:

سب سے پہلا نظریہ یہ سامنے آیا کہ ہم یہ دیکھیں، کیا ستاروں کی قوت جلنے کا نتیجہ یا کیمیاوی فعل وانفعال کا اثر تو نہیں؟
۱۸۵۴ء میں لارڈ کلوین نے اس موضوع کو مورد تحقیق قرار دیا تھا، وہ کہتا ہے کہ کوئی کیمیاوی فعل وانفعال کبھی بھی اس قدر قوت پیدا کرنے کا موجب نہیں بن سکتا کہ وہ آفتاب کے درجہ حرارت کو اس مقدار پر ہزار ہا سال تک برقرار رکھ سکے۔

۲۔ سماوی پتھروں کا گرنا:

بعض ماہرین نے یہ خیال کیا آفتاب کی سطح پر آسمانی پتھروں کے گرنے سے اس قدر قوت پیدا ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے یہ پتھر بہت زیادہ سرعت۔ مثلاً ۶۰۰ کیلو میٹر تک کی سرعت پیدا کر لیتے ہوں۔ پر اس سے جو قوت پیدا ہوتی ہے وہ ایک کیمیاوی سوختگی سے پیدا ہونے والی قوت سے ہزار گناہ ہو سکتی ہے، لیکن متعدد دلائل کے ساتھ مفروضہ بھی مسترد کر دیا گیا۔

۳۔ تراکم یعنی تہ بہ تہ ہونا:

آفتاب کے متعلق یہ نظریہ ۱۸۵۴ء میں ہلموٹس کے ذریعہ سامنے آیا اور بہت سے سائنس دانوں، بالخصوص کلوین نے اسے قبول بھی کر لیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ کافی عرصہ تک یہ خیال کیا جاتا رہا کہ یہ اس مسئلے کا قطعی جواب ہے اور لوگ یقین کرتے رہے کہ ہم نے ستاروں کی زندگی کے مسئلے کو دریافت کر لیا ہے۔

یہ مفروضہ کچھ یوں کہ کشش رکھنے والی توانائی حرارتی قوت کی شکل میں تبدیل ہے، پس آفتاب اپنے مرکز کی اس جاذبہ توانائی (کشش والی توانائی) کی تاثیر میں آکر متراکم ہوتا رہتا ہے یعنی تہ بہ تہ ہوتا رہتا ہے۔ اس داخلی کشش کے نتیجہ میں اجسام کے ایک دوسرے پر تہ بہ تہ ہونے کی وجہ سے حرارت پیدا ہوتی ہے اور یہ تراکم اجرام حرارت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

اس استدلال کے ساتھ گزشتہ چند سالوں میں یہ دعویٰ بھی کیا جانے لگا تھا کہ ہم پیش گوئی کر سکتے ہیں کہ اگر قوت کا ایک اور منبع اس آفتاب میں تداخل نہ کرے تو یہ بہت کم مدت میں سرد ہو جائے گا اور زمین پر بشریت کی موت آجائے گی۔ وہ اس نظریے کو حتمی سمجھنے لگے تھے کہ یہ آفتاب بالآخر جامد ہو جائے گا اور اپنی اس درخشندگی سے دست بردار ہو جائے گا۔ لیکن ان کا یہ نظریہ بھی متعدد جہات سے مسترد کیا جا چکا ہے۔

روسل کہتا ہے: فقط اجرام کا تراکم یعنی تہہ بہ تہہ ہونا ہی ان ستاروں میں قوت کا منبع نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس صورت میں ان

ستاروں کی طرح ایک طویل مدت سے نورافشانی کر رہا ہے۔ چنانچہ کہا گیا کہ ہمیں استراکم کے مفروضے سے چشم پوشی کر لینا چاہیے۔[1]

فزیالوجی کی ترقی

مادی ترقی، ایٹم کی دریافت اور ایٹمی توانائی سے آگاہی نے سائنس دانوں کے افکار میں ایک عظیم تبدیلی اور شکست وریخت پیدا کر دی اور انہوں نے آفتاب اور دیگر ستاروں کی قوت کے بارے میں ایک جدید نظریئے کی بنیاد رکھی ہے۔ علم فلکیات اور طبیعات کے ماہرین نے باہمی تعاون سے متعدد تجربات کئے۔ تاکہ یہ معلوم کر سکیں کہ کیا گزشتہ نظریئے کے برخلاف انہوں نے آفتاب اور دیگر ستاروں کی قوت کا صحیح منبع دریافت کر لیا ہے یا نہیں؟

بالآخر انہوں نے ایٹمی توانائی کا نظریہ پیش کیا ہے، اگرچہ ماہرین کی اس گفتگو کے بین السطور سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ابھی تک اس نظریئے میں بھی کئی ایک مبہم نکات موجود ہیں، لیکن وہ عقیدہ رکھے ہوئے ہیں کہ اس نظریئے کی علمی حیثیت گزشتہ نظریات کی بہ نسبت زیادہ ہے او واقعیت وحقیقت کے زیادہ قریب ہے۔

ایٹمی قوت

آفتاب اور ستاروں کی عظیم قوت کے فضا میں تقسیم ہونے کے بارے میں جتنے قدیم مفروضے قائم کئے گئے تھے، وہ سب ناکافی ہیں۔ جدید طبیعات اس نظریئے کی تقویت کرتی ہے کہ ایٹمی فعل وانفعال (توڑ پھوڑ) جوان ستاروں کے اندر وقوع پذیر ہوتی ہے، وہی اس عظیم قوت کا اصلی منبع ہے۔ لیکن کیا اس نظریئے کا حقیقت کے مطابق ہونا ثابت کیا جا سکتا ہے؟ کیا باریک بینی کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ کس قسم کا فعل وانفعال اور کیسی شکست وریخت ہے جو ستاروں میں شعاعوں کے ذریعے پھیلنے والی اس قوت کو وجود میں لائی ہے؟ ہاں ان ستاروں میں سے بعض اہم ستاروں کے متعلق تو قطعی جواب دیا جا سکتا ہے، لیکن بعض حالات کے بارے میں اب شک کی گنجائش موجود ہے۔[2]

خورشید کی روشنی ہائیڈروجن کے جلنے اور ہیلوم میں تبدیل ہونے کی وجہ سے وجود میں آتی ہے اور خورشید سے ساطع ہونے والی مجموعی روشنی کے پیدا ہونے کے لئے ضروری ہے کہ یہ عمل بڑے وسیع پیمانے پر انجام پائے۔ حقیقت میں ضرورت یہ ہے کہ ہر سیکنڈ میں ۶۳۰ ملین ٹن ہائیڈروجن ۶۲۵ ملین ہیلوم میں تبدیل ہو اور اس سے باقی ماندہ ۶۰۰ / ۴ ملین ٹن ہائیڈروجن نورانی قوت کی صورت میں بدل کر ضائع ہو جائے۔ پھر اس کا معمولی حصہ زمین پر پہنچے کہ جس سے زمین روشن بھی ہو اور وہ روئے زمین پر موجود زندہ

---

[1] چہ میدانم؟ زندگی ومرگ ستارگان ص ۴۔۷

[2] چہ میدانم؟ زندگی ومرگ ستارگان ص ۸۶

اشیاء کی زندگی کا ضامن بھی بنے۔[1]

ہائیڈروجن کی تبدیلی

خورشید میں ہونے والے مسلسل اس فعل وانفعال کا خالص نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے حلقے میں بتدریج وارد ہونے والے چار پروٹون سے ہلیوم کا ذرہ حاصل ہوتا رہے۔ بایں ترتیب یہ ضابطہ سامنے آئے گا کہ زنجیر کے حلقہ جات کے تسلسل کی طرح مسلسل ہائیڈروجن ہیلوم میں تبدیل ہوتی رہتی ہے، وہ اس شدید حرارت سے تبدیل ہوتی ہے جو کاربن اور نائٹروجن کے درمیان میں ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔[2]

ایٹمی سوختگی

اس بناء پر اگر ہم قدیمی نظریات میں سے اس نظریئے کو قبول کریں جس میں کہا گیا ہے کہ سورج کی قوت ایک قسم کے سوختگی کے عمل سے وجود میں آتی ہے تو وہ ایٹمی سوختگی کا ایک عمل قرار پائے گا جس میں ہائیڈرجن ایندھن ہے اور اس کی خاکستر ہلیوم ہے۔[3]

سورج میں ہائیڈروجن اور ہیلوم ایک دوسرے سے مکمل طور پر مخلوط نہیں ہیں، بلکہ ہلیوم سورج کے مرکزی ذرات میں موجود ہے۔ یہ جلنے کا عمل اس مرکزی ذرے کی سطح پر انجام پاتا ہے اور سورج کی دائم نور افشانی کے سبب وہ ہیلوم والا مرکزہ سنگین تر ہوتا رہتا ہے۔[4]

ہائیڈروجن کی جتنی زیادہ مقدار ہلیوم میں تبدیل ہوتی جائے گی، سورج کا مرکزی حصہ اسی قدر زیادہ تاریک ہوتا جائے گا۔ اس کے نتیجے میں مرکزی حصے میں زیادہ سے زیادہ قوت جمع ہوجائے گی۔ اس کے مطابق (جارج کاموف) نے حساب لگایا اور وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سورج کی شعاع پاشی میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ جب خورشید میں پائی جانے والی ہائیڈروجن کی مقدار ختم ہونے کے قریب پہنچے گی تو شعاع پاشی کی قوت میں سوگنا اضافہ ہوچکا ہوگا۔[5]

آخری انقباض

جب سورج کی ایٹمی توانائی کے سارے منابع خرچ ہوجائیں گے تو فلک کا یہ تابندہ ستارہ بالآخر سکڑ جائے گا اس عمل انقباض

---

[1] سیری در جہان دانش ص ۲۷

[2] پیدائش و مرگ خورشید ص ۱۲۸

[3] چہ میدانم؟ زندگی و مرگ ستارگان ص ۹۵

[4] سیر در جہان دانش ص ۲۹

[5] پیدائش و مرگ خورشید ۱۳۱۔ ۱۷۴

سے جو ثقلی قوت پیدا ہوگی وہ اسے بہت لمبی مدت تک گرم اور درخشاں رکھے گی، لیکن رفتہ رفتہ سکڑنے کا یہ عمل بالآخر اختتام پا جائے گا۔ اس وقت سورج کی شعاع پالیسی کا عمل بھی مدہم ہونے لگے گا اور پھر ایک لمبی مدت گزرنے کے بعد یہ سورج مادے کے ایک بے جان ٹکڑے کی طرح ہو کر رہ جائے گا۔[۱]

نتیجہ یہ ہوا کہ سورج کے اس عظیم جرم نے اگرچہ بڑے لمبے عرصے سے مسلسل اور دائمی طور پر بہت زیادہ قوت تقسیم کی ہے اور آئندہ بھی طولانی عرصے تک تقسیم کرتا رہے گا۔ مگر چونکہ سورج ایک مادی وجود ہے، اس لئے غیر متناہی توانائی پیدا نہیں کرسکتا، بلکہ اس کی بھی ایک حد ہے۔ پس اس کی ایک مثال بھی ایک لیٹر پٹرول یا کسی تیل کے علاقے میں پائی جانے والی گیس کی طرح ہے کہ جن میں سے ہر ایک نسبت کے مطابق ایک محدود اور معین توانائی پیدا کرتا ہے۔

انسانی وجود میں پائی جانے والی محنت وکوشش کی توانائی بھی مادے سے قائم ہے، چونکہ مادہ محدود ہے اس لئے اس میں پوشیدہ توانائی بھی لازماً محدود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ دیر محنت وکوشش کرنے کے بعد انسان کی توانائی کمزور پڑنے لگتی ہے اور اس کے بدن میں تھکاوٹ اور خستگی کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ لہٰذا انسان کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ غذا کھائے اور استراحت کرے تاکہ اپنی قوت کی تجدید کرے اور دوبارہ کام، کاج اور محنت کے قابل ہو سکے۔

کام سے تھکاوٹ

لاگرانج کہتا ہے: ایک تندرست اور عادی فرد کا تھکاوٹ دراصل زیادہ کام کرنے کی وجہ کام کرنے والی طاقت کے کم ہونے کا نام ہے کہ جس کے ساتھ ایک ناراحتی کا احساس بھی ہوتا ہے۔[۲]

محنت کے نتیجے میں ہمارے بدن میں ایک صحیح تھکاوٹ پیدا ہوتی ہے جو عموماً ایک نشاط آور نیند اور استراحت کے ساتھ دور ہو جاتی ہے۔ اگر ہماری محنت ہماری توانائی سے تجاوز کر جائے، بالخصوص جب کہ ہم ایسا کام کرنے لگیں جس کی ہمیں عادت نہیں ہے تو یہ ہمیں بیمار کر دیتی ہے۔ پھر بلا فاصلہ یا چند گھنٹے یا چند روز بعد ہمیں بخار کمزوری۔ کوفت اور طرح طرح کی تکلیفیں ہو جاتی ہے۔ تیز دوڑنے سے حیوان کا مر جانا۔ فوری طور پر یا کچھ دیر بعد بے انتہا تھکاوٹ ہوئی کہ جو اس کے لئے بیماری کی شکل اختیار کر گئی۔[۳]

ذات اقدس الٰہی مادہ و مادیات سے منزہ ہے، اس لئے وہ مادی نقائص اور جسمانی عوارض سے بھی مبرئی ہے۔ اس کی قدرت اس کی عین ذات ہے اور اس کی ذات عین قدرت ہے۔ کمزور۔ سستی، فرسودگی، خستگی، تھکاوٹ وغیرہ سب مادی موجودات کے عوارض ہیں، اس لئے ان کے اس ذات کبریا کے حریم قدس اور اس دائمی و ابدی قدرت کے احاطہ میں داخل ہونے کی کوئی گنجائش

---

[۱] پیدائش و مرگ خورشید ۱۳۱۔ ۱۷۴

[۲] چہ میدانم؟ چگونہ بر خستگی غلبہ کنیم ص ۱۲۔ ۵

[۳] چہ میدانم؟ چگونہ بر خستگی غلبہ کنیم ص ۱۲۔ ۵

نہیں ہے۔

قل علی علیه السلام: لا یتغیر بحال ولا یتبدل فی الاحوال ولا تبلیه اللیانی والا یام ولا یغیره الضیاء والظلام ولا یوصف بشیئی من الجزاء ولا بالجوارح ولاعضاء ولا بعرض من الاعراض[1]

امام علی علیہ السلام نے فرمایا: خداوند تعالیٰ کسی حالت سے متغیر نہیں ہوتا اور نہ حالات کے بدلنے سے اس میں تبدیلی آتی ہے۔شب و روز کا گزرنا اسے پرانا اور بوسیدہ نہیں بنا سکتا اور روشنی و تاریکی اس کی ذات مقدس پر کوئی اثر مرتب نہیں کرتی۔ وہ ذات باری تعالیٰ اجزاء اعضاء اور جوارح سے متصف نہیں ہوسکتی اور ان کے عوارض (مثلاً۔ نیند سے کمزوری۔ تھکاوٹ) وغیرہ اسے لاحق نہیں ہو سکتے۔

تھکاوٹ اور درد کا احساس

زیادہ کام کرنے سے تھکاوٹ کا احساس اور کسی عضو کی بیماری کے وقت درد کا احساس یہ دونوں ایسی مفید اور سودمند حالتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے حکیمانہ فیصلے کے تحت انسان کے وجود میں پیدا فرمائی ہیں، دونوں حالتیں خطرے کی گھنٹی کی طرح ہیں کہ جو برموقع آواز دینے لگے اور آدمی کو راستے میں پیش آنے والے خطرات سے آگاہ کردے۔

جس کا معدہ ناقص ہوجائے یا گلا خراب ہوجائے۔ یا کوئی دانت خراب ہوجائے تو فقط درد کا احساس ہی واحد راستہ ہے جس سے وہ اپنی اس بیماری کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے۔ اور خطرے کے وجود سے آگاہ ہوجاتا ہے۔ درد کا یہ احساس بیمار کے لئے اعلان کرتا ہے کہ تیرا مزاج راہ صحت سے منحرف ہو چکا ہے، لہٰذا فوراً کسی طبیب کی طرف جا کر اور اس بیماری کو بڑھنے سے روک دے، نہیں تو تمہاری زندگی اور سلامتی خطرے میں ہے۔

جو شخص زیادہ محنت کرنے سے تھکنے لگتا ہے اور اس میں تھکاوٹ کا احساس پیدا ہوتا ہے تو درحقیقت یہ احساس اسے آگاہ کررہا ہوتا ہے کہ تمہارے وجود کی توانائی کم ہوچکی ہے اور تمہاری قدرت و طاقت کمزوری و ناتوانی کا شکار ہو رہی ہے۔ لہٰذا اپنی صحت و زندگی کی حفاظت کے لئے اب کام سے دست بردار ہوجاؤ، کچھ دیر لیٹ کر آرام کرو اور اپنے آپ کو خطرات سے بچاؤ جو اس میں ممکن ہیں۔

قابل تلافی فرسودگی

خستگی اور تھکن ایک طبعی عمل ہے اور یہ ہر زندہ مادے کی خاصیت ہے۔ وہ تمام مشینیں اور چیزیں جو بے جان مادے

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۲۲۸

سے بنائی جاتی ہیں، وہ بھی رفتہ رفتہ فرسودگی۔ بوسیدگی اور نا قابل مرمت نقائص کی طرف سفر کرتی ہیں۔ جب کہ زندہ مادے میں پیش آنے والی بوسیدگی معمولاً عارضی ہوتی ہے، خود بخود درست ہوتی رہتی ہے اور بدن خود اس کی تلافی کر لیتا ہے۔ اگر چہ یہ بھی ایک واضح فرق ہے، لیکن صرف یہی فرق ہی ان دونوں کو باہم جدا نہیں کرتا۔ بلکہ جوں ہی تھکاوٹ عادی مراحل سے گزر جاتی ہے۔ اور بیماری کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو وہاں یہ خطرہ پیدا ہو جاتا ہے کہ پھر سے پلٹ آنے والے عملی نقائص پیدا ہو جائیں اور تھکاوٹ کے ساتھ مل کر ایک دائمی بیماری کی صورت اختیار کر لیں۔ ایسے عوارض کے بارے میں امکان ہوتا ہے کہ وہ ہڈیوں کی شکل تبدیل کر دیں یا گونا گوں دیگر نقصانات کا موجب بن جائیں۔ مثلاً ایک خصوصی کمزوری جو بہت مدت تک زیادہ دور کی آواز سننے سے کان کے اندرونی حصے میں پیدا ہو جاتی ہے۔ [۱]

حد سے زیادہ تھکاوٹ

یہ عادی تھکاوٹ کا احساس، ہمیں آگاہ کرتا ہے اور اس مرحلے تک پہنچنے سے باز رکھتا ہے، ہاں حد سے زیادہ تھکاوٹ ہی فقط ابتدائی خطرے کی علامت نہیں ہوتی، بلکہ اگر ہر روز عمداً یا سہواً اپنی طاقت کی حدود سے تجاوز کرنے لگیں گے تو پھر ہماری تھکاوٹ خود بخود ایک اور شکل اختیار کر لیتی ہے کہ جس کو اب درماندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ایسی حالت ہوتی ہے جو نامحسوس انداز سے تدریجی طور پر ہمارے تمام بدن کی کارگزاریوں اور ہماری سوچ کو بھی اختلال میں مبتلا کرنے لگتی ہے۔ [۲]

طبیعی تھکاوٹ

پس مان لینا چاہئے کہ تھکاوٹ بدن کے فعال رہنے کے لئے ایک شرط ہے۔ یہ تصور غلط ہے کہ ہم اپنے آپ کو تھکاوٹ سے نجات دے سکتے، ہاں یہ بات مکمل طور پر منطقی ہے کہ ہم خود کو کم سے کم تھکن کا شکار ہونے دیں یا تھکاوٹ کے نقصان کو کم کریں۔ تھک جانا تو ایک طبیعی امر ہے اور یہی تھکاوٹ ہمیں بیمار بھی کر دیتی ہے، لیکن یہ ایسی بیماری ہے جو استراحت کرنے کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ اگر تھکن کی یہی حالت حد سے تجاوز کر جائے تو پھر بدترین جسمانی بدنظمی کا موجب بن سکتی ہے اور موت تک بھی پہنچا دیتی ہے۔ [۳]

یہ بات ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ عضلات سے بہت زیادہ کام لینا اور بدن سے کام لینے میں زیادہ روی کرنا تھکاوٹ کا موجب بنتا ہے۔ لیکن متوجہ رہنا چاہیئے کہ تھکاوٹ فقط اسی سے لاحق نہیں ہوتی بلکہ دماغی کام میں زیادہ مشغول رہنا اور اعصاب سے بہت زیادہ کام لینا بھی تھکاوٹ کا موجب بن جاتا ہے۔ پس اس کے پیش نظر بنیادی نکتہ یہ ہوا کہ بدن کے مختلف حصے باہم مربوط ہیں،

---

[۱] چہ میدانم؟ چگونہ بر خستگی غلبہ کنیم ص ۱۳
[۲] چہ میدانم؟ چگونہ بر خستگی غلبہ کنیم ص ۵۔ ۴۹
[۳] چہ میدانم؟ چگونہ بر خستگی غلبہ کنیم ص ۵۔ ۴۹

دماغ اورعصاب کی تھکن عضلات واعضاء پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔اوراس طرح عضلات کی تھکاوٹ اعصاب کو متاثر کرتی ہے۔

دماغ کی تھکاوٹ

تھکاوٹ وخستگی کا یہ موضوع ایک مدت تک بدنی تربیت کے مباحث میں باقاعدہ ایک باب کی حیثیت سے شامل رہا ہے۔ چنانچہ قبل ازیں اس امر میں زیادہ تر عضلات کے کام پر توجہ دیجاتی تھی، کیونکہ یہی بنیادی عامل کی حیثیت رکھتا ہے۔ نیز انسان کے طبیعت کے ساتھ مقابلہ میں یہی بہتر انداز سے قابل شناخت ٹھہرتا ہے۔لیکن رفتہ رفتہ ترقی ہوئی دیگر عضلاتی عوامل کے ساتھ نفسیات کے عامل کو بھی موردتوجہ قرار دے گیا، کیونکہ تھکاوٹ کے زیراثر بدن کے اعمال وافعال پر دماغ اور نفس کی طرف سے بھی اثر مرتب ہوتا ہے۔

اعصاب کی مصروفیات

ہم سب کو معلوم ہے کہ عصبی انعکاس کے حکم یا دماغ کے ارادی عمل کے بغیر عضلات میں کوئی کھچاؤ پیدا نہیں ہوتا بنابرین اعصابی خستگی ہمارے عضلات کی تھکاوٹ پر بہت بڑا اثر مرتب کرتی ہے اوراسی طرح بالعکس اثر بھی ہے۔پس آج کل تنہا بدنی کام کو تھکاوٹ کا موجب نہیں سمجھا جاتا، کیونکہ فکری فعالیت میں اضافہ ہوجانے سے اعصاب پر تھکاوٹ طاری ہوجاتی ہے، جبکہ بدن نے کوئی کارگزاری نہیں کی ہوتی۔ یہ تھکن بھی دوسری تھکاوٹ کی مثل طاقت فرسا ہوتی ہے، یہ حالت عام طور پر طلبہ میں سالانہ امتحانات کے زمانے میں یا داخلے کے امتحانات کے اوقات میں دیکھی جاتی ہے۔ یہ ذہنی تھکاوٹ تمام اعصابی مصروفیات کے کاموں میں نظر آتی ہے، مثلاً احساس مسئولیت، روحانی صدمات، زیادہ غوروخوض کے کام۔

بعض ایسے دقیق اور باریک کام ہوتے ہیں جو زیادہ عضلاتی محنت نہیں چاہتے لیکن ایک خصوصی ہم آہنگی اور ظرافت کے طلبگار ہوتے ہیں، کہ جن سے اضطراب، دلی پریشانی، اور بالآخر تھکاوٹ اور خستگی پیدا ہوجاتی ہے۔[١]

عضلاتی تھکاوٹ کا اثر فقط متعلقہ عضو تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ بدن کے دیگر حصوں پر بھی تھکن کے آثار مرتب کرتا ہے، اس کا ایک نمونہ اسید لاکیتک ہے۔پس اس لحاظ سے ایک زہریلا اثر پورے بدن میں سرایت کرجاتا ہے اور وہ عضلات بھی جو اس کام میں شریک نہیں ہوتے، ان پر اور دیگر اعصابی حصے پر بھی اس کے آثار مرتب ہوجاتے ہیں۔اس تھکاوٹ کے دور کرنے کے لئے اتنا ہی کافی ہوتا ہے کہ اس عضو میں سے نکلے ہوئے زائد مواد اور بدن پر موجود زائد کو دھو دیا جائے اور وہ ختم ہوجائے۔ تھکے ہوئے آدمی کی سانس، پسینہ زہریلے مواد سے بھرے ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے بدن سے ایک ناپسندیدہ بوآنے لگتی ہے۔[٢]

---

[١] چہ میدانم؟ چگونہ برخستگی غلبہ کنیم ص ٦۔٢١

[٢] چہ میدانم؟ چگونہ برخستگی غلبہ کنیم ص ٦۔٢١

نوافل میں میانہ روی

اولیاء کرام وائمہ ہدیٰ علیہم السلام نوافل اور مستحب عبادات کو خصوصی اہمیت دیتے تھے اور اپنے پیروکاروں کو ان کی انجام دہی کی تاکید کیا کرتے تھے۔لیکن ان کے باوجود متعدد روایات میں یہ بھی سمجھایا کہ لوگوں کو نوافل کی ادائیگی میں میانہ روی اور اعتدال کی راہ اپنانا چاہئے اور ان عبادات کو تھکاوٹ اور بے دلی کا موجب بنا کر اپنے اوپر بوجھ نہ بنانا چاہئے۔

قال رسول الله (ص): ان لكل عبادة شرة ثم تصير الى فترة فمن صارت شرة عبادته الى سنتي فقد اهتدى ومن خالف سنتي فقد ضل وكان عمله في تباب اما اني اصلي و انام و اصوم و افطر و اضحك وابكي فمن رغب عن منهاجي و سنتي فليس مني [۱]

رسول اکرمؐ کی سنت

حضرت رسول اکرمؐ نے فرمایا: لوگوں میں ہر عبادت کے لئے ایک نشاط اور شدید رغبت کا مرحلہ ہوتا ہے تو ایک سستی اور تنگی کا مرحلہ بھی ہوتا ہے، جس نے عبادت کی طرف اپنے شدید میلات کو میری سنت کے مطابق کرلیا تو وہ ہدایت پا گیا اور جس نے میری سنت کی مخالفت کی وہ گمراہ ہوگیا اور اس کا عمل تباہی میں پڑ گیا۔ میں نماز بھی پڑھتا ہوں اور آرام کی نیند بھی سوتا ہوں۔ ہنستا بھی ہوں اور روتا بھی ہوں، جو بھی میری روش سے اعراض کرے گا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔

عن ابي عبدالله عليه السلام قال: لا تكرهوا الى انفسك العبادة [۲]

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی عبادت کو اپنے اوپر سختی نہ بناؤ، یعنی تھکاوٹ اور عدم میلان کی حالت میں سے اپنے اوپر مت مسلط کرو۔

عن ابي جعفر عليه السلام قال: رسول الله (ص) ان هذا الدين متين فاوغلوا فيه برفق ولا تكرهوا عبادة الله الى عباد الله فتكونوا كالرا كب المنبت الذى لا سفر قطع ولا ظهراً ابقى [۳]

---

[۱] الکافی ج ۲ ص ۸۵۔۸۶

[۲] الکافی ج ۲ ص ۸۵۔۸۶

[۳] بحار الانوار ج ۱۵ قسمت ۲ ص ۱۷۲

آسان شریعت

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث نقل کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ کا ارشاد ہے: اسلام ایک سہل اور مشقت سے خالی دین ہے، لہٰذا اس میں بڑی نرمی کے ساتھ قدم اٹھاؤ۔ بندگان خدا پر عبادت خدا کو سوار نہ کرو اور ایسے سوار کی طرح نہ بن جاؤ جو اپنی سواری کو تھکا ماندہ کر دیتا ہے۔ اس کے نتیجے میں نہ سفر طے ہوتا ہے اور نہ سواری صحیح سالم رہتی ہے۔

فی وصیة امیر المومنین علیه السلام للحسن (ع) عند وفاته: واقتصد یا بنی فی معیشتك واقتصد فی عبادتك وعلیك فیها بالامر الدائم الذی تطیقه[1]

امیر المومنین امام علی علیہ السلام نے اپنی وصیتوں میں امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام سے فرمایا: اے میرے بیٹے! اپنے امور زندگی میں میانہ روی اپناؤ اور اپنی عبادت میں بھی میانہ رو رہو۔ افراط سے پرہیز کرو اور ایسی روش کا انتخاب کرو جو تمہاری طاقت کے اندر ہو تا کہ اسے دائمی طور پر انجام دے سکو۔

تکلف سے مبریٰ دین

مختصر یہ کہ دین اسلام ایک سہل اور آسان دین ہے جو مشقت اور تکلف سے خالی ہے۔ اولیاء کرام جہاں لوگوں کو دینی نوافل اور مستحبات کی انجام دہی کی وصیت اور تلقین میں فرماتے ہیں کہ تھکن اور بے رغبتی کی کیفیت میں انہیں اپنے اوپر بوجھ نہ بناؤ۔ وہاں وہ اس بات پر بھی قطعاً راضی نہیں ہے کہ انسان زیادہ مال کمانے اور دولت اکٹھی کرنے کے لئے حد سے زیادہ محنت کرتا ہوا دکھائی دے اور حد سے زیادہ کام کر کے خود کو اس قدر خستہ اور فرسودہ کر دے کہ اپنے جسم و جان کو خطرناک عوارض اور ناقابل تلافی نقصانات کا نشانہ بنا لے۔

قال رسول الله (ص): انا والاتقیاء من امتی برآء من التکلف[2]

حضرت رسول اکرمؐ نے فرمایا: میں اور میری امت کے متقی لوگ تکلف سے بری ہیں یعنی ہم سب ایسے کاموں سے منزہ اور مبرٰی ہیں جن میں تصنع، ناراحتی ہو اور انہیں بے دلی کے ساتھ اپنے اوپر بوجھ سمجھ کر انجام دینا پڑے۔

تھکاوٹ سے مبریٰ ذات

اس کے پیش نظر کہ تھکاوٹ اس زہریلے مواد کا نام ہے جو عضلاتی یا دماغی کام میں حد سے زیادہ مصروف رہنے سے پیدا ہو

---

[1] سفینۃ البحار ج ۲ ''قصد'' ص ۴۳۱

[2] احیاء العلوم کتاب دوم ص ۱۰۲

جا تا ہے۔ یہ امر فقط زندہ مادی موجودات کے عوارض میں سے ہے اور یہ دیکھتے ہوئے کہ ذات اقدس الٰہی مادہ اور مادی عوارض سے منزہ مبرٰی ہے۔ یہ نتیجہ بالکل آسانی سے برآمد ہو جا تا ہے۔ کہ بنیادی طور پر ذات باری تعالیٰ کے حریم مقدس میں تھکاوٹ اور مسومیت کا کوئی امکان نہیں ہے۔

ارادۂ الٰہی

انسان کسی جسم کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے لئے اپنی عضلاتی توانائی سے استفادہ کرتا ہے اور کسی علمی مطلب کو سمجھنے کے لئے اپنی دماغی طاقت کو کام لاتا ہے۔ ان دونوں کاموں میں اگر وہ حد سے زیادہ محنت کرے تو تھک جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک خداوند قدوس کی ذات کا تعلق ہے تو وہ کائنات کی خلقت اور اس جہان کے نظام کو چلانے کے تمام امور میں فقط ارادہ کرتا ہے اور اس کی مراد متحقق ہو جاتی ہے، لہٰذا پروردگار عالم کے لئے عضلاتی یا دماغی فعالیت کے ثابت ہونے کا کوئی معنی و مفہوم نہیں ہے۔۔

إِنَّمَآ أَمْرُهُۥٓ إِذَآ أَرَادَ شَيْـًٔا أَن يَقُولَ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ ﴿٨٢﴾[١]

سوائے اس کے نہیں اس کا امر یہ ہے کہ جب وہ کسی شئی کے بارے میں ارادہ کرے اور اسے کہے تو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔

ایک کیلومیٹر پیدل چلنے میں جس قدر طاقت خرچ ہوتی ہے وہ دس کیلومیٹر پیدل چلنے میں خرچ ہونے والی توانائی حتماً کم ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک علمی مسئلے پر فکر کرنا یا دس علمی مسائل میں فکر کرنا بھی باہمی فرق رکھتا ہے، بہر حال عضلاتی عمل یا کم دماغی عمل میں مقدار اور کیفیت کے لحاظ سے جس قدر فرق ہوتا ہے، اسی قدر طاقت کے مصرف میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن ذات اقدس الٰہی چونکہ ارادہ کرنے سے مخلوق کو خلق کرتی ہے اور اپنی مخلوق کے نظم کے لئے اس کا ارادہ ہی کافی ہوتا ہے، اس لئے وہ ایک انسان کو یا ایک ارب انسانوں کو خلق کرنا چاہے۔ اس کے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ ۗ[٢]

تمام انسانوں کو پیدا کرنا اور اسی طرح تم سب کو محشور کرنا اللہ تعالیٰ کے لئے ایک انسان کو خلقت بخشنے کی طرح (بالکل سہل اور آسان) ہے۔

قال علی علیه السلام: لم يئوده خلق ما ابتداء ولا تدبير ما ذرا ولا وقف به عجز عمال خلق[٣]

امام علی علیہ السلام نے فرمایا: اس جہان ہستی کی ابتداء خلقت، اس کائنات کے نظام کا چلانا اور اس کا ادراہ تدبیر کرنا اللہ

---

[١] سورۂ یس آیت ۸۲

[٢] سورۂ لقمان آیت ۲۸

[٣] نہج البلاغہ خطبہ ۶۴

تعالیٰ کے لئے تھکاوٹ کا موجب نہیں بنا اور نہ ہی وہ اپنی مخلوق سے عجز و ناتوانی کا شکار ہوا ہے۔

جملوں کا باہمی ربط

ولا یئودہ حفظھما: والے جملے کو گزشتہ جملوں سے اس طرح مربوط کیا جا سکتا ہے: آیت الکرسی نے ابتداء میں یہ اعلان کیا کہ قابل پرستش معبود فقط وہ خداوند تعالیٰ ہے جو "**حی وقیوم**" ہے، تاکہ لوگ یہ جان لیں کہ اس ذات الٰہی کے لئے مسلسل قیومیت ثابت ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ پھر فرمایا "**لاتاخذہ سنتہ والا نوم**" اس پر اونگھ یا نیند غالب نہیں آسکتی اور بتایا کہ معبود واقعی، تمام ارضی وسماوی موجودات کا مالک ہے "**لہ ما فی السموات وما فی الارض**" اس کے بعد "**یعلم مابین ایدیھم وما خلفھم**" کے ذریعہ اطلاع دی کہ اس جہان کا حقیقی مالک اس کی مالکیت رکھنے کے علاوہ اپنی مملوکہ اشیاء کی تمام خصوصیات اور جزئی تفصیلات کہ وہ گزشتہ ہوں یا آئندہ سب سے مکمل طور پر باخبر اور آگاہ ہے۔ آخر میں "**وسع کرسیہ السموات ولارض**" کے ذریعے واضح فرمایا کہ اس مالک وعالم خدا نے اس جہان کو اپنی طاقت وقوت کے ساتھ نظم بخشا اور اس کی لم یزل ولا یزال قدرت ان تمام جہانوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ پھر اس لئے کہ مبادا لوگ اللہ تعالیٰ کی لامحدود قدرت کو اپنی محدود توانائی پر قیاس کرنے لگیں اور انہیں اس غلط تصور سے دور رکھنے کے لئے فرمایا ولا یودہ حفظھما'' کہ وہ پروردگار عظیم اس کاخ آفرینش کی حفاظت ونگہبانی سے ضعف وسستی وناتوانی وخستگی سے دوچار نہیں ہوتا، کیونکہ یہ عوارض اس کی ذات مقدس کو لاحق نہیں ہوسکتے۔

بے تھکان قدرت

ذات باری تعالیٰ کی قدرت وتوانائی۔ انسان اور دیگر اشیاء کی توانائی سے دو اعتبار سے جدا ہے۔

اول: یہ کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اس کی عین ذات ہے اور اس کی ذات خود اس کی ذات سے ہی قائم ہے۔ جب کہ دیگر تمام ممکنات کی توانائی ان کی ذات کو عارض ہوتی ہے اور سب کی ذاتیں بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہیں اور از خود قائم نہیں ہیں۔

دوم: یہ کہ تمام ممکنات کی توانائی محدود ہے اور ہر ممکن اپنے سے قوی تر توانائی والے کے سامنے مغلوب اور عاجز ہوتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت تمام اشیاء پر ہمیشہ غالب اور قاہر ہے۔ وہ کسی شئی سے ہرگز مغلوب نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے قرآن مجید میں خداوند تعالیٰ کی صفت قدرت ''عزیز'' کے ساتھ آتی ہے۔

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيزُ ﴿٦٦﴾[1]

بے شک تیرا پروردگار ہی قول وعزیز ہے۔ یعنی غالب ہے۔

---

[1] سورۂ ہود آیت ٦٦

مفردات راغب میں ہے: والعزیز الذی یقہر ولا یقہر عزیز وہ ہوتا ہے جو غالب رہے۔ مغلوب نہ ہو۔

غالب قدرت

نتیجہ یہ ہے کہ اس کاخ ہستی کا محافظ ونگہبان خداوندی قوی وعزیز ہے۔ وہ خداوند کہ جس کی قدرت ہر چیز پر غالب وقاہر ہے اور کوئی شئی حق تعالیٰ کی قدرت کو مغلوب ومقہور نہیں کر سکتی۔ اسی لئے خداوند عظیم کے لئے اس جہان ہستی کی حفاظت مشقت اور تھکاوٹ کا موجب نہیں اور باری تعالیٰ کی قدرت آسمانوں اور زمین کی نگہبانی سے بھی مغلوب نہیں ہوتی۔

آیت الکرسی کے بارے میں اولیاء کرام علیہم السلام سے بہت سی روایات منقول ہیں۔ ان سے اس آیت کریمہ کی متعدد جہات کی معنوی حیثیت کا پتہ چلتا ہے۔ من جملہ ان کے یہ ہے کہ آیت الکرسی پڑھنا آدمی کو اللہ تعالیٰ کی حفاظت وحمایت میں قرار دیتا ہے اور اس کی جان، مال اور عزت ہر بلا اور خطرے سے محفوظ ہو جاتی ہے۔

قال رسول الله (ص): من قرأ آیة الکرسی عند منامه بعث الیه ملك یحرسه حتی یصبح [1]

آیت الکرسی اور الٰہی حفاظت

رسول اکرمؐ نے فرمایا: جو کوئی سوتے وقت آیت الکرسی پڑھے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ معین کیا جاتا ہے، جو اس کی حفاظت کرتا ہے تا آنکہ وہ بسلامتی صبح کرتا ہے۔

عن ابی عبدالله علیه السلام قال: اتی اخوان رسول الله (ص) فقالا انا نرید الشام فی تجارة فعلمنا ما نقول. فقال نعم اذا اویتما الی المنزل فصلیا العشاء الاخرة فاذا وضع احد کما جنبیه علی فراشه بعد الصلواة فلیسبح تسبیح فاطمة علیها السلام ثم لیقرأ آیة الکرسی فانه محفوظ من کل شیئی حتی یصبح [2]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: دو بھائی حضرت رسول اکرمؐ کی خدمت میں شرف یاب ہوئے اور عرض کیا: ہم تجارت کے لئے شام کی طرف سفر کرنے کا عزم رکھتے ہیں، ہمیں اپنی حفاظت کے لئے تعلیم فرمایئے کہ ہم کیا پڑھیں؟ آنحضرتؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا: جب بھی کسی منزل میں وارد ہو گئے تو نماز عشاء کے فریضے سے فارغ ہونے کے بعد جب بستر پر جا کر لیٹو تو ابتداء

---

[1] تفسیر منہج الصادقین ج ۲ ص ۹۲

[2] وسائل الشیعہ ج ۸ کتاب الحج ص ۲۸۸

حضرت فاطمۃ الزہرا علیہا السلام کی تسبیح پڑھو، اس کے بعد آیت الکرسی کی تلاوت کرو تو صبح تک ہر حادثہ و بلا سے محفوظ رہو گے۔

عن ابی عبداللہ علیہ السلام قال: اذا دخلت مدخلا تخافہ فاقرا ھذہ الایۃ (رَّبِّ اَدۡخِلۡنِیۡ مُدۡخَلَ صِدۡقٍ وَّاَخۡرِجۡنِیۡ مُخۡرَجَ صِدۡقٍ وَّاجۡعَلۡ لِّیۡ مِنۡ لَّدُنۡكَ سُلۡطٰنًا نَّصِيۡرًا﴿۸۰﴾)[۱] فاذا عانیت الذی تخافہ فاقرأ آیۃ الکرسی[۲]

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: جب تم کو کسی جگہ جانا پڑے کہ جہاں خوف اور ڈر تم پر طاری ہو تو وقت دخول اس آیت کو پڑھئے۔ "رب ادخلنی......

ترجمہ: پروردگارا مجھے صدق وراستی کے ساتھ یہاں داخل فرما اور مجھے یہاں سے راستی وسچائی کے ساتھ لے چل اور اپنی لایزال قدرت سے میرے لئے طاقت بخشنے والی سلطنت اور مدد دینے والی قوت معین فرما

اور جب اس چیز کو دیکھو کہ جس سے تم کو خوف محسوس ہوتا ہو تو آیت الکرسی کی تلاوت کرو۔

اطمینان کا احساس

ایک باایمان شخص جو اپنی حفاظت کے قصد سے آیت الکرسی پڑھتا ہے، وہ خود کو خدا کے سپرد کرتا ہے۔ جب وہ "لا یودہ حفظہما" تک پہنچتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی لامحدود قدرت کی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ جس سے اپنے پورے وجود میں آرام وامید کی ایک موج محسوس کرتا ہے۔ وہ خود کو ایک قابل اطمینان نظام کے اندر محسوس کرتا ہے، کیونکہ اس نے اپنے آپ کو اس خداوند قدیر کی حفاظت و نگہبانی میں دے دیا ہے جو اس بزرگ ترین کاخ خلقت کی بغیر کسی مشقت وزحمت کے حفاظت کر رہا ہے، تو پھر یہ ضعیف سے انسان کی حفاظت اس کے لئے کیا مشکل ہے؟۔

ھو العلی العظیم

ذات اقدس الٰہی نے اپنے لئے ایسے اسماء کا انتخاب فرمایا جو بڑے بلند اور عظیم معانی پر مشتمل ہیں۔ اس نے لوگوں کو حکم فرمایا ہے کہ توجہ بخدا کے وقت اسے اس کے مخصوص اسماء کے ذریعے پکاریں۔

وَلِلّٰهِ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰى فَادۡعُوۡهُ بِهَا [۳]

اور اللہ کے لئے بڑے اچھے اسماء ہیں پس اسے ان کے ذریعہ پکارو

پروردگار عالم کے بعض اسماء اس کے صفات ذات کے ترجمان ہیں مثلاً عالم وقدیر، سمیع وبصیر اور بعض اسماء صفات فعل سے

---

[۱] سورۂ بنی اسرائیل آیت ۸۰

[۲] وسائل الشیعہ ج ۸ کتاب الحج ص ۲۸۷

[۳] سورۂ اعراف آیت ۱۸۰

عبارت ہیں مثلاً شافی، رزاق محی، ممیت۔

عالی ترین اسماء الٰہی

علی وعظیم۔ باری تعالیٰ کے اسماء میں دو دو اسم ہیں، بعض روایات سے استفادہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء مبارکہ میں سے یہ دونوں عالی ترین اسماء ہیں اور خود اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے لئے منتخب فرمایا ہے

عن محمد بن سنان قال سبالت ابا الحسن الرضا علیه السلام هل کان الله عارفاً بنفسه قبل ان یخلق الخلق قال نعم، قلت یرا ها ویسمعها قال ما کان محتاجاً الی ذالك لأنه لم یکن یسالها ولا یطلب منها ۔هو نفسه و نفسه هو ۔ قدر ته نافذة فلیس یحتاج الی ان یسمی نفسه ولکنه اختار لنفسه اسماء لغیره یدعوه بهالا نه اذا لم یدع باسمه لم یعرف فاول ما اختاره لنفسه العلی العظیم لأنه اعلی الأسماء کلها فمعناه الله واسمه العلی العظیم هو اول اسمائه لا نه علی علی کل شیئی [۱]

محمد بن سنان نے حضرت امام علی رضا علیہ السلام سے پوچھا: کیا خداوند تعالیٰ مخلوق کو خلق کرنے سے قبل اپنی ذات کی معرفت رکھتا تھا؟ آپ نے فرمایا: ہاں! اس نے عرض کیا: آیا خود کو دیکھتا اور اپنی بات کو سنتا تھا؟ آپ نے جواب دیا اسے اس کی کوئی احتیاج نہیں تھی، کیونکہ نہ وہ اپنے آپ سے کچھ پوچھتا اور نہ ہی کچھ مانگتا تھا، وہ خود ہے اور خود تھا اور اس کی قدرت نافذ تھی۔ اس لئے اسے کوئی ضرورت نہ تھی کہ اپنا کوئی نام رکھے۔ ہاں اس نے اپنے لئے کچھ نام منتخب فرمائے ہیں، تا کہ لوگ اسے ان اسماء کے ذریعے پکاریں۔ کیونکہ اگر اسے اس کے نام سے نہ پکارا جائے تو نام والے کی شناخت نہ ہو سکے ہوگی۔ سب سے اولین نام جو اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے منتخب فرمایا وہ ''العلی العظیم'' ہے، کیونکہ یہ نام تمام اسماء الٰہی میں عالی ترین اسم ہیں۔ اس لئے کہ اس میں کلمہ ''علی'' آیا ہے کہ جو علو و برتری و بلندی کا معنی دیتا ہے، یعنی خداوند تعالیٰ ہر چیز سے بلند و برتر ہے۔

والعلی هو الرفیع القدر واذا وصف الله تعالیٰ به فمعناه یعلو ان یحیط به وصف الواصفین بل علم العارفین [۲]

---

[۱] بحار الانوار ج ۴ ص ۱۳۰

[۲] مفردات راغب ''علا'' ص ۳۵۰

توصیف سے برتر

''علی'' کا معنی ہے رفیع القدر اور عالی منزلت۔ جب اس سے اللہ تعالی کا وصف بیان کیا جاتا ہے تو اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ خداوند کریم اس سے بلندتر و بالاتر ہے کہ توصیف کرنے والوں کی توصیف اور معرفت حاصل کرنے والوں کا علم اس بلندترین ذات کا احاطہ کرسکے اور اس مقدس حقیقت تک پہنچ سکے۔

وهو العلی عن الاشیاه والاضداد و الامثال و الا نداد و عن امارات النقص ودلالات الحدیث [۱]

(هو العلی)

یعنی وہ خداوند تعالیٰ اس سے برتر و بالاتر ہے کہ کوئی شبیہ یا ضد رکھتا ہو، اس سے بھی بلندتر ہے کہ وہ کوئی مثل یا شریک رکھتا ہو اور وہ تمام امکانی نقائص کی علامات اور حدوث کے نشانات سے بھی بالاتر ہے۔

العظیم: ای العظیم الشأن القادر الذی لا یعجزه شیئی والعالم الذی لا یخفی علیه شیئی لا نهایة لمقدوراته ولا مایة لمعلوماته [۲]

لامحدود علم وقدرت

''عظیم'' یعنی خداوند پاک کی شان الٰہیت کمال عظمت پر ہے۔ وہی وہ قادر ہے کہ کوئی شئی اس کو عاجز نہیں کر سکتی اور وہ ایسا عالم ہے کہ کوئی چیز اس سے مخفی و پوشیدہ نہیں ہو سکتی، کیونکہ اس کی قدرت لامحدود اور اس کا علم بے پایان ہے۔

تمام مادی توانائیوں کا محدود ہونا، تمام زندہ موجودات کا محنت اور کام سے تھک جانا اور اللہ تعالیٰ کا تمام مادی نقائص سے منزہ ومبریٰ ہونا اور اس لم یزل ولا یزال قدرت کا لامحدود ہونا۔ ان تمام امور کے بارے میں ہماری پیش کردہ معروضات کو سامنے رکھا جائے اور پھر ''العلی العظیم'' کے اس مفہوم کو مدنظر لایا جائے کہ جو آے کے آخر میں ذکر ہوا ہے تو آیت الکرسی کے آخری جملے کی تفسیر بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔

ولا یئوده حفظهما وهو العلی العظیم۔

یعنی آسمانوں زمین اور پورے جہان کے باعظمت محل کی حفاظت اس خداوند قادر وقدیر کے لئے بوجھل اور تھکا دینے والی نہیں ہے، اس لئے کہ وہ ذات اقدس الٰہی تمام مادی نقائص سے بالاتر اور عجز وناتوانی سے بلندتر ہے۔

---

[۱] مجمع البیان ج ۱۔ ۲ ص ۳۶۳

[۲] مجمع البیان ج ۱۔ ۲ ص ۳۶۳

قرآن مجید میں بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں اللہ تعالیٰ آیت کے آخر میں اپنے چند صفات کو ذکر فرماتا ہے اور اس پر آیت کا اختتام فرما دیتا ہے۔ یہاں قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ ان تمام مقامات میں انہیں صفات کا ذکر فرماتا ہے جو اس آیت کے مضمون سے بہت زیادہ مناسبت رکھنے والے ہوتے ہیں۔

مثلاً جن آیات میں اللہ تعالیٰ اپنی حکومت اور کائنات پر فرماں روائی کی بات کر رہا ہوتا ہے تو وہاں آیت کا اختتام انہیں صفات پر فرماتا ہے جو اس کی سلطنت اور قدرت کو بیان کرتے ہیں۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ۡ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ ۙ﴿١﴾ [1]

وہ ذات جس کے لئے آسمانوں اور زمین کی شاہی ہے اور اللہ تعالیٰ ہر شئی پر قادر ہے۔

الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۭ﴿٩﴾ [2]

وہ ذات جس کے لئے آسمانوں اور زمین کی شاہی ہے اور اللہ تعالیٰ ہر شئی پر مطلع آگاہ ہے۔

بعض ایسی آیات جن کے مضامین الٰہی نعمات پر مشتمل ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی دو صفات عزیز اور حکیم پر ختم ہوئی ہیں۔ صفت ''عزیز'' کے ذریعے باری تعالیٰ کی غیر محدود قدرت کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور اس سے لوگوں کو امید بندھ جاتی ہے۔ صفت ''حکیم'' بے جا توقعات رکھنے سے منع کرنے کے لئے ہے اور لوگوں کو سمجھاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم غیر معقول اور بے نظم نہیں، بلکہ وہ پروردگار لوگوں پر اپنی حکمت اور مصلحت کے مطابق اپنی نعمتیں نازل کرتا ہے۔

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۙ﴿١٢٦﴾ [3]

اور مدد نہیں ہوتی مگر اس اللہ کی جانب سے جو عزیز و حکیم ہے

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٤٩﴾ [4]

اور جو کوئی اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرے تو بے شک اللہ تعالیٰ عزیز و حکیم ہے۔

امید دلانے والے صفات

ایسی آیات کہ جن لوگوں کو توبہ کی طرف راغب کرنے، اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹانے اور رجوع کرانے کا بیان ہے، ان کا اختتام رحمت، مغفرت اور مہربانی کی صفات پر کیا گیا اور ایسے صفات کو لایا گیا ہے جو لوگوں کے لئے امید بخش ہوتے ہیں۔

---

[1] سورۂ ملک آیت ۱

[2] سورۂ بروج آیت ۹

[3] سورۂ آل عمران آیت ۱۲۶

[4] سورۂ انفال آیت ۴۹

اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۳﴾ [1]

تحقیق اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو بخش سکتا ہے اور بے شک وہ غفور ورحیم (بخشنے والا رحم کرنے والا) ہے۔

وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ﴿۹۰﴾ [2]

اور اپنے پروردگار سے گناہوں کی معافی مانگو اور پھر اس سے توبہ کرو، بے شک میرا رب رحیم، ودود (مہربان اور محبت کرنے والا) ہے

جن آیات میں مشرکین کے عقائد کا بطلان اور یکتا پرستی کی طرف دعوت دینے کا مضمون ہے، انہیں علی، عظیم اور کبیر جیسی صفات پر ختم کیا گیا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿۶۲﴾ [3]

یہ اس لئے ہے کہ تحقیق اللہ تعالیٰ ہی حق ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ جسے پکارتے ہیں وہ باطل ہے۔ اور بے شک اللہ تعالیٰ ہی علی وکبیر (بلند وبڑا) ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿۳۰﴾ [4]

ولا یئودہ حفظھما وھوا العلی العظیم

آیت الکرسی کا ہدف

سب سے پہلی تقریر میں وضاحت کے ساتھ اشارہ ہوا کہ آیت الکرسی کا بنیادی ہدف انسانی افکار کو بیدار کرنا اور بشر کو خود ساختہ معبودوں کی غلامی اور بندگی سے نجات دلانا ہے۔ یہ آیت بھی ''العلی'' اور ''العظیم'' کی دو صفات پر ختم ہوئی ہے۔ درحقیقت خداوند عالم ان دو صفات کے ساتھ مشرکین کو ان کی جہالت کی طرف متوجہ فرما رہا ہے اور انہیں سمجھا رہا ہے کہ تم کس قدر نادان لوگ ہو کہ عقل کا خون کر رہے ہو اور اپنی انسانیت کو پامال کر رہے ہو۔ تم اپنے نادان آباء واجداد قدیر کا شریک قرار دئے ہوئے ہو اور ان گھٹیا اور پست اشیاء کے سامنے بندگی اور پرستش کو اختیار نہ کرتے۔ تم کبھی یہ پسند نہ کرتے کہ عقل وانصاف کے برخلاف کسی جاہلانہ چیز یا کسی جاہلانہ

---

[1] سورۂ زمر آیت ۵۳

[2] سورۂ ہود آیت ۹۰

[3] سورۂ حج آیت ۶۲

[4] سورۂ لقمان آیت ۳۰

چیز یا کسی حیوان کو خداوند عظیم کا شریک مان لو کہ اللہ تعالیٰ تو (علی وعظیم) ہے۔ وہ خدا تو اس سے بلند وبالا ہے کہ کسی قسم کی کوئی مخلوق اس کی شریک بن سکے۔ وہ اس سے برتر ہے کہ یہ عاجز ناتواں موجودات اس کے ہمسر قرار پائیں اور ان کی پرستش کی جائے۔

سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۝۱۸ [1]

وہ ذات پاک ہے اور بلندتر ہے اس سے جسے وہ اس کا شریک بناتے ہیں۔

لائق پرستش معبود

آیت الکرسی اسلام کے آسمانی مکتب کا توحید در عبادت کے حوالے سے تعارف کروا رہی ہے اور انسان کو ایک خدا کی پرستش کی ہدایت کر رہی ہے کہ یکتا پرستی ہی انسانوں کی آزادی کی بنیاد ہے۔ وہ لوگوں کو اس حقیقی معبود کی شناخت کروا رہی ہے جو عبادت کے لائق ہے اور انہیں ایسے بناوٹی خداؤں کی پرستش سے نجات دلا رہی ہے کہ جنہیں خود رائی کے طور پر مان لیا گیا ہے۔ آیت الکرسی خوابیدہ عقول کو بیدار کرتی ہے اور معاشرے کے اندر ایک فکری حرکت کو جنم دیتی ہے۔ وہ لوگوں کو شرک و بت پرستی کے تاریک ماحول سے باہر نکالتی ہے اور انہیں توحید و آزادی کی نورانی فضاؤں کی سیر کراتی ہے۔ مختصر یہ کہ آیت الکرسی انسانوں کی آزادی کی نورانی فضاؤں کی سیر کراتی ہے۔

مختصر یہ کہ آیت الکرسی انسانوں کی آزادی کا نعرہ اور ان کی سعادت کا اعلان ہے۔

آیت الکرسی اسلام کی جاودانی حقیقت کا فروغ اور اس مقدس آئین کی ابدیت کی ایک شعاع ہے۔

(تمت بالخیر والحمد للہ رب العالمین)

---

[1] سورہ یونس آیت ۱۸

اختتامیہ

حجت الاسلام والمسلمین حضرت علامہ شیخ محمد تقی فلسفی مدظلہ کی کتاب۔۔۔۔
آیت الکرسی: پیامِ آسمانی توحید (فارسی) کا یہ اُردو ترجمہ بندہ حقیر سید محمد تقی نقوی بن العلامہ سید گلاب علی شاہ نقوی بخاری مدظلہ کے قلم سے آج مورخہ ۲۰۔صفر المظفر ۱۴۔۱۰ھ بروز اربعین حضرت سید الشہداء حضرت امام حسین بن امام علی علیہما السلام اختتام کو پہنچا۔ جب کہ یہ حقیر امارات متحدہ عربیہ کی ریاست دوبئی میں عزاخانہ حسینی واقع شارع فہیدی زیر انتظام جناب سید محمد علی شاہ موسوی عشرۂ اربعین کی مجالس کیلئے آیا ہوا ہے اور عزاخانہ مذکورہ کے پہلو میں واقع اقامت گاہ میں مقیم ہے۔ یہ ترجمہ آج بروز جمعرات بوقت سوا دس بجے دن تمام ہوا ہے، رب العالمین سے بحق سید الشہداء خامس آل عبا، ان کے آباء مطہرین اور اولاد معصومین علیہم السلام سے التجاء ہے کہ وہ میری اس ناچیز سی کوشش کو شرف قبولیت بخشے اور عوام الناس کو اس سے تا روز قیامت فیض یاب ہونے کی توفیق عنایت فرمائے۔ دعا ہے کہ مخلوق خدا توحید در عبادت کی معرفت میں کمال کو پہنچے اور ہر قسم کے شرک خفی وجلی سے پاک رہے۔ ہم سب صحیح عقائد اور صحیح اعمال کے پابند رہیں کہ ہماری زندگی بھی اسی پر ہو اور ہماری موت بھی اسی پر ہو۔

إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٦٢﴾
وَأُفَوِّضُ أَمْرِي إِلَى اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ ﴿٤٤﴾

وانا الاحقر
سید محمد تقی نقوی بخاری عفی عنہ
مدرس جامعہ عربیہ مخزن العلوم الجعفریہ
شیعہ میانی، ملتان (پاکستان)